فتاویٰ صراطِ مستقیم

دیارِ مغرب میں مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان کا شرعی حل

ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ
(سیکرٹری اسلامک شریعت کونسل، لندن)

فتاویٰ صراطِ مستقیم
دیارِ مغرب میں مسلمانوں کو درپیش مسائل
اور ان کا شرعی حل

کتاب

فتاویٰ صراط مستقیم

تالیف

ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ

ناشر ------------------ محمد سرور عاصم

اشاعت ------------------ 2015ء

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

لاہور ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
042-37244973 - 37232369

فیصل آباد بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
041-2631204 - 2641204

0300-8661763
/maktabaislamia1
www.maktabaislamiapk.com
maktabaislamiapk@gmail.com

فتاویٰ صراطِ مستقیم

دیارِ مغرب میں مسلمانوں کو درپیش مسائل
اوران کا شرعی حل

ڈاکٹر صہیب حسن حفظہ اللہ
(سیکرٹری اسلامک شریعت کونسل، لندن)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔

مضامین مقالات

مضامین فتاویٰ

عقائد، بدعات اور رسومات کے مسائل

طہارت کے مسائل

نماز کے مسائل

جنازے کے مسائل

روزے کے مسائل

زکاۃ کے مسائل

حج و قربانی کے مسائل

حلال وحرام کے مسائل

نکاح و طلاق کے مسائل

اخلاق و آداب کے مسائل

متفرق مسائل

پس اہل علم سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے

الحمدللّٰہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الأمین،

أما بعد:

عمر پوری خاندان کے چشم و چراغ اور عالم اسلام کی معروف شخصیت مولانا عبدالغفار حسن رحمہ اللہ (سابقہ مدرس مدینہ یونیورسٹی) کے فرزند ارجمند محترم ڈاکٹر صہیب حسن صاحب نے جب الجامعۃ الاسلامیۃ، سعودی عرب سے تعلیم مکمل کی تو انھیں یونیورسٹی کی طرف سے برطانیہ میں مبعوث کر دیا گیا۔ جہاں وہ تقریباً عرصہ 36 سال سے علمی و دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے نورِ اسلام عام کر رہے ہیں جس سے دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''فتاویٰ صراطِ مستقیم'' موصوف کی ایک عظیم کاوش ہے جس میں نہ صرف ان لوگوں کے سوالات کے جوابات ہیں جو دیارِ غیر میں رہنے کے باوجود دینی تعلیم سے روشناس ہونا چاہتے ہیں بلکہ اس وقت عالم اسلام کو درپیش مسائل کا حل بھی بتایا گیا ہے۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

① مقالات ② فتاویٰ

پہلے حصے میں ڈاکٹر صاحب کے ان مقالات کو صفحات کی زینت بنایا گیا ہے جو انھوں نے مختلف موقعوں پر مختلف موضوعات پر بیان کیے، مثلاً: سورۂ بنی اسرائیل کی روشنی میں امت مسلمہ کا عروج و زوال، علمائے مسلمین کا عالمی اتحاد اور مسلک اہل حدیث وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب کا چونکہ تحقیق و تنقید کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے، لہٰذا جب جناب طاہر القادری صاحب نے امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب ''الأدب المفرد'' پر محدثِ دوراں علامہ البانی کی تحقیق کو تنقید کا نشانہ بنایا تو موصوف نے قادری صاحب کی تنقید کا

مکمل و مدلل جواب دیا۔ اسی طرح ان اعتراضات کے جوابات بھی بڑے احسن پیرائے میں دیے جو محض اہل حدیث کی طرف منسوب ہیں۔

دوسرا حصہ فتاویٰ جات پر مبنی ہے جو کئی اہم سوالات پر مشتمل ہے جن میں بعض ایسے مسائل ہیں کہ دیارِ غیر میں رہنے والے لوگ عموماً ان سے دو چار رہتے ہیں۔ مثلاً: رؤیت ہلال میں عرب کو معیار بنانے کا حکم، انگلینڈ کے مسلمانوں کا دوسرے ممالک میں اپنی قربانی کروانا، حالتِ روزہ میں ریستوران میں مسلم وغیر مسلم کو کھانا پیش کرنا، جلاٹین یا الکوحل سے بنی ہوئی ادویات کا حکم، غیر شرعی طریقے سے ذبح کرنے والے مذبح خانے میں ملازمت کرنا اور غیر مسلم پڑوسیوں سے ملنا اور تبادلۂ تحائف کرنا وغیرہ۔

یقیناً یہ کتاب جہاں یورپین ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کو باہم فائدہ پہنچائے گی وہاں اُردو داں لوگوں کے ہر طبقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

عمر پوری خاندان کا ہمارے ادارے کے ساتھ بڑا گہرا اور دیرینہ تعلق ہے، مکتبہ اسلامیہ اس سے پہلے بھی ان کی کئی اہم کتابیں شائع کر چکا ہے۔ جن میں انتخاب حدیث، تفسیری نکات اور حیات: مولانا عبدالغفار حسن عمر پوری رحمہ اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ ادارہ دیگر کتب کی طرح زیرِ نظر کتاب ''فتاویٰ صراط مستقیم'' بھی اپنی روایت کے مطابق دلکش و اعلیٰ معیار کے ساتھ قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا رہا ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمیشہ کی طرح اسے بھی لائق تحسین قرار دیا جائے گا۔

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت ہماری ان کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے اور انھیں ہماری نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

انٹرنیشنل کانفرنسز
میں پڑھے گئے
علمی مقالات

یہ کانفرنس جگہ کے اعتبار، داعی کی حیثیت اور شرکت کرنے والوں کی نوعیت کے لحاظ سے ایک انوکھی کانفرنس تھی، البتہ عنوان ایک معروف موضوع تھا ''دہشت گردی''

کانفرنس کے انعقاد کے لیے داعی نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں چند ہفتے قبل دہشت گردی کا ایک واقعہ ہو چکا تھا جس نے معصوم جانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی بھینٹ چڑھا لیا تھا۔

یہ جگہ تھی صحرائے سینا کے بالکل جنوب میں، کانوں کے لیے ایک نامانوس جگہ، ''شرم الشیخ'' جو بحیرۂ احمر اور خلیج عقبہ کے سنگم پر واقع ہے۔

خلیج عقبہ میں اور آگے چلے جائیں تو تین اور ساحلی مقام آتے ہیں۔ طابہ اور عقبہ جو بالترتیب مصر اور اردن کے علاقے میں ہیں اور ایلات جو اسرائیلی کنٹرول میں ہے۔

شرم الشیخ صرف ہوٹلوں اور صرف عارضی استراحت گاہوں کا شہر ہے جس میں مصری حکومت کے کہنے پر غیر ملکیوں کو بحیرۂ احمر کے گرم پانیوں میں نہانے، تیراکی کرنے، غوطہ خوری اور دیگر تفریحی سرگرمیاں مہیا کرنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔

آپ دنیا کے کسی بھی بڑے ہوٹل کا نام لیجیے یہاں اس کی شاخ موجود ہوگی۔

ہاں ''پلازہ'' کے نام سے جو اصطلاح معروف ہو چکی ہے۔ سمجھ لیجیے کہ یہ شہر

"پلازوں" سے پلا ہوا ہے۔ ہم آئے تو رات کی تاریکی میں تھے اور پھر دو دن اس طرح کانفرنس کی نذر ہوئے کہ ایک ہوٹل میں اپنے کمرے سے لے کر بس کے ایک مختصر سفر کے بعد ایک دوسرے ہوٹل کے کانفرنس ہال تک قدم ناپتے رہے، اس لیے اس شہر کا آگا دیکھا نہ پیچھا اور نہ سمندر کی جھلک ہی نظر آئی لیکن بھلا ہو ہمارے میزبان کا کہ جب اُن کے خصوصی جہاز میں دوسرے مندوبین کے ساتھ دن کی روشنی میں قاہرہ کی طرف واپسی کا سفر کیا تو یہ شہر اپنے لاتعداد ہوٹلوں، پلازوں، سیرگاہوں، گالف کے میدانوں اور ساحلِ سمندر کی وسعتوں کے ساتھ نگاہوں میں کھبتا گیا۔ صحرا کی ریت، بنجر ٹیلوں اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان صاف ستھری شاہراہوں اور پُر تعیش آسائشوں سے بھرپور اقامت گاہوں کا ایک جنگل کھڑا ہو چکا ہے۔ جس کے درمیان سبزہ اور ہریالی شرماتی نظر آتی ہے۔ ہم ایئر پورٹ جاتے ہوئے مصری ایئر لائنز کے دفتر کے سامنے کچھ دیر کے لیے رُکے تو غالباً اس شہر کی واحد مسجد کو دیکھ کر مصری حکومت کو داد دینا چاہی کہ انھوں نے اس مغربی کلچر کی نمائندہ بستی کو مشرف بہ اسلام کر ہی لیا ہے۔

یہاں کے ساحلوں پر بقول عارفین کے جو کچھ تماشا ہوتا ہے اسے دیکھ کر واقعی انسانیت کو شرم آ جاتی ہوگی لیکن نہ جانے کیوں اس شرم کو کسی نامعلوم شیخ تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ (ابھی اس بات کی تحقیق باقی ہے کہ یہ لفظ عربی کا شرم ہے یا اردو کا۔)

اب آیئے دوسری بات کی طرف!

عام طور پر کانفرنسوں کا انعقاد حکومتوں کی طرف سے ہوتا ہے یا بڑی بڑی جماعتوں کی طرف سے لیکن اس کانفرنس کے داعی سعودی عرب کی ایک متمول شخصیت شیخ صالح عبداللہ کامل تھے جو جدہ کے مشہور رئیس اور تاجر، "البرکہ بینک" کے بانی اور مالک،

عربی چینل ''اقراء'' کے سرپرست اور ''اقراء فقہی کونسل'' کے پاسبان ہیں۔

سعودی عرب کے بم دھماکے، شرم الشیخ کے ایک ہوٹل میں خودکش حملہ اور پھر لندن میں سات جولائی کا حادثہ، اُن کے لیے مہمیز ثابت ہوا کہ وہ جید علماء کی ایک بڑی تعداد کو اپنی ضیافت میں دو دن کے لیے بلائیں اور ''دہشت گردی'' کے مالہ و ماعلیہ پر اُن کی گزارشات سنیں اور اس موضوع پر شریعتِ حقہ کے احکامات کو تمام عالم کے لیے اُجاگر کریں۔

کانفرنس کے مدعوین علماء کوئی پچاس کے لگ بھگ تھے، جو اس اعتبار سے انوکھے تھے کہ ان علماء میں چند ایسے افراد کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا جو اصلاحِ احوال اور حکام وقت پر تنقید کرنے کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ میری مراد سعودی عرب کے شیخ سلمان عودہ، شیخ عائض قرنی اور قطر میں مقیم مصری عالم شیخ یوسف قرضاوی ہیں۔ دوسری مقتدر ہستیوں میں مصر کے شیخ الازہر سید محمد طنطاوی، سوڈان کے اسلامی امور کے وزیر ڈاکٹر عصام بشیر، شام کے مشہور عالم شیخ وہبہ زحیلی، قاہرہ کے معمر لیکن خطیب بے بدل شیخ محمد راوی شامل ہیں۔

اس کانفرنس میں اہلِ اسلام کی چار مشہور فقہی کونسلوں کے متعدد نمائندے بھی موجود تھے، یعنی رابطہ عالم اسلامی کے مجمع فقہی کے سیکرٹری شیخ صالح الزین المرزوقی اور رکن مجلس شیخ عبداللہ بن بیہ (موریتانیہ سے) ہندوستان کی فقہی کونسل کے نائب صدر مولانا بدر القاسمی (کویت سے) اور یورپ کی فقہی کونسل کے صدر شیخ یوسف قرضاوی موجود تھے۔ ان کے علاوہ کونسل کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حسین اور راقم الحروف، مجمع فقہاء الشریعہ (امریکہ) کے صدر ڈاکٹر حسین حامد حسان اور سیکرٹری جنرل

ڈاکٹر صلاح صاوی بھی موجود تھے۔

پہلے دن تقریباً پینتیس مندوبین نے ''دہشت گردی'' کے مختلف پہلوؤں پر اپنے تحقیقی مقالات کا خلاصہ دس دس منٹ میں بیان کیا۔

میرا مقالہ مغربی فکر میں ''دہشت گردی'' کے اسباب سے متعلق تھا جس میں میں نے مندرجہ ذیل مغربی تحریکوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا:

① رومن اثرات کی حامل مسیحیت ② انارکی ازم (لاقانونیت)

③ فاشزم (فسطائیت) ④ نازی ازم

⑤ مارکسزم ⑥ صیہونیت

⑦ عالمی حکومت (Globalization)

آخری عنوان کے تحت میں نے امریکہ کی اُن مذموم کوششوں کا تذکرہ کیا ہے جو وہ عالم اسلام پر قبضہ کرنے، اسرائیل کی پُشت پناہی کرنے اور دنیا جہان پر اپنی دہشت بٹھانے کے لیے کر رہا ہے۔ یہ مقالہ عربی کے سترہ صفحات پر مشتمل تھا جسے کئی مندوبین نے سراہا۔

دوسرے دن انتہا پسندی، حکومتوں کے خلاف بغاوت اور انتہا پسندوں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اپنانا چاہیے جیسے موضوعات زیر بحث رہے۔ فلسطین اور عراق کے حوالے سے بحث میں کچھ تلخی بھی پیدا ہوئی، جس کی بنا پر کانفرنس کے داعی جناب صالح کامل کو اپنے اختتامی کلمات میں کہنا پڑا کہ مجھے پہلے دن کی کارروائی دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی تھی لیکن دوسرے دن چند ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو میرے لیے انتہائی افسردگی کا باعث بنی ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اس کانفرنس کا احاطہ کرنے کے لیے کئی عالمی ٹیلی ویژن اداروں کو دعوت دی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی یہاں پر

موجود نہیں ہے، یعنی اچھا ہوا کہ یہ لوگ نہیں آئے۔

شیخ یوسف قرضاوی نے یہ کہہ کر اُن کے جذبات کو ٹھنڈا کیا کہ آپ نے علمائے کرام کو مدعو کرتے وقت انھیں یہ بتا دیا تھا کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں بالکل آزاد ہوں گے، اس لیے آپ کو اُن کے خیالات سن کر قطعاً کوئی ملال نہیں ہونا چاہیے۔

اس کانفرنس میں یہ باتیں وضاحت سے کہی گئیں:

ا) دہشت گردی اور آزادی کی تحریکات میں واضح فرق کیا جانا چاہیے۔ فلسطین، کشمیر اور اب عراق میں مزاحمت کا تعلق تحریک آزادی سے ہے نہ کہ دہشت گردی سے۔

ب) انتہا پسند نوجوان جو دہشت گردی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، شفقت اور نرمی کے ساتھ بات چیت اور ڈائیلاگ کے مستحق ہیں اور تجربہ بتاتا ہے کہ ان میں سے کئی نوجوان بات چیت کے نتیجے میں راہ راست پر آ گئے ہیں۔

ج) ایسی کوئی بھی تخریبی حرکت جس کا نشانہ معصوم عوام بنتے ہوں، قابلِ مذمت ہے، چاہے وہ بلادِ اسلامیہ میں ہو یا بلادِ کفار میں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کانفرنس میں پیش کردہ تحقیقی مقالہ جات اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیے جائیں تاکہ اس کانفرنس کے سلسلے میں کی گئی محنت اور اس میں لگایا ہوا پیسہ بارآور ہو۔

مناسب ہوگا کہ میں اپنے مقالے کی تلخیص قارئین کی نذر کرتا چلوں۔

مغربی فکر میں دہشت گردی کے مآخذ [1]

عربی میں دہشت گردی کے لیے ''ارہاب'' کا لفظ رائج ہے۔ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ یہ ایک قرآنی اصطلاح ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں پر رعب طاری کرنے کے معنی میں استعمال ہوئی ہے۔ [2] اس کی جگہ ''ترویع'' (خوفزدہ کرنا) اصطلاح زیادہ مناسب ہے۔

مغربی افکار میں دہشت گردی کے مآخذ کو تلاش کرنا ہو تو درج ذیل سات موضوعات کا مطالعہ کرنا مفید رہے گا:

① **رومن زدہ عیسائیت:** برٹرنڈ رسل نے کہا تھا: ''عیسائیوں نے یہودی اعتقادات کے ساتھ ساتھ اپنے فکر میں رومنوں کی تمام دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی شدید خواہش کو سمو لیا تھا اور پھر یونانی دیو مالا کی آمیزش کے ساتھ ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جو دنیا کے ایک خونخوار مذہب کی شکل اختیار کر گیا۔''

پھر بائبل کے وہ چند حوالے جن میں ایک فاتح کو مفتوح اقوام کی نسل کشی کی اجازت دی گئی ہے جیسے: گنتی، باب: 31، فقرہ: 17 تا 19۔ استثنا، باب: 20، فقرہ: 14 تا 17۔ سموئیل، باب: 27، فقرہ: 10۔

[1] دہشت گردی کے موضوع پر مصر میں منعقدہ کانفرنس میں پیش کردہ مقالہ۔ [2] الأنفال 8:60.

اس بات کا تذکرہ کہ قرآن مجید میں کہیں بھی کسی بھی خودکش حملے کا ذکر نہیں لیکن بائبل کے اندر سیمسن اور ڈالائلہ کا قصہ مذکور ہے۔ بائبل (قضاۃ، باب:16، فقرہ:4-30) اس میں سیمسن کو ایک انتہائی طاقت ور شخصیت دکھایا گیا ہے جسے بالآخر قابو کر لیا گیا اور فلسطینیوں کے ایک بہت بڑے مندر میں لایا گیا جہاں بت پرست فلسطینی ایک تہوار منانے کے لیے جمع تھے۔ سیمسن نے اپنی بے پناہ طاقت استعمال کرتے ہوئے اندر کے ستون اس طرح گرا ڈالے کہ اُن کے گرتے ہی سارا مندر زمین بوس ہو گیا۔ نتیجہ ظاہر تھا، نہ صرف وہ خود موت کا گھونٹ پی گیا بلکہ وہاں موجود تین ہزار فلسطینیوں کو بھی موت کی بھینٹ چڑھا گیا۔

عیسائیت کی خون آشام تاریخ میں مسلم کشی کے واقعات کسی سے پوشیدہ نہیں جن میں صلیبی جنگوں کے موقع پر بیت المقدس کے سقوط کے وقت صرف مسجد اقصیٰ میں ستر ہزار مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا۔

1492ء میں سقوط غرناطہ کے صرف ایک سو سال کے اندر سرزمین اندلس سے مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا۔ موجودہ دور میں سرب عیسائیوں کے ہاتھوں بوسنیا کے مسلمانوں کا جو حشر ہوا، کسی سے پوشیدہ نہیں۔ خود عیسائیوں کے دو بڑے فرقے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک عرصہ تک باہم برسرِ پیکار رہے اور اب بھی آئر لینڈ میں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

② **انار کی ازم یالا قانونیت**: اس ضمن میں اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے اُن مفکرین کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اس بات کا پرچار کر رہے تھے کہ انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور چونکہ وہ عقل اور شعور رکھتا ہے، اس لیے حکومت کا کوئی

حق نہیں کہ اس کو باندھنے کے لیے قانون بنائے۔ ان لوگوں نے طاقت اور حکومت کی مرکزیت اور بزور طاقت حاصل کردہ جائیداد کے منسوخ کرنے کی حمایت کی۔ اس تحریک کا روح رواں میکائیل باکونین (1876ء) سمجھا جاتا ہے اور اسے پروان چڑھانے میں روس کے شہزادہ پیٹر کروپٹکن (1921ء) اور لیوٹالسٹائی (1910ء) کا بھی ہاتھ ہے۔ انھی افکار کے نتیجے میں کئی سیاسی مقتدر ہستیاں قاتلانہ حملوں کی نذر ہوگئیں جن میں فرانسیسی صدر (1894ء)، اسپین کا وزیر اعظم (1897ء)، وی آنا کی ملکہ (1898ء)، اٹلی کا بادشاہ (1900ء) اور امریکہ کا ایک صدر (1901ء) شامل ہیں۔

بقول مولانا مسعود عالم ندوی، مارکس کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے اپنی تحریک اشتمالیت (Communism) کو فروغ دے کر اباحیت کے اس سیل رواں کو باندھنے کی کوشش کی جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

③ **مارکس ازم:** اس ضمن میں مارکس کے فلسفہ پر مبنی سوویت یونین کے ان وحشیانہ مظالم کا تذکرہ ہے جو لینن اور سٹالن نے مسلم ریاستوں کے عوام پر ڈھائے۔ گو سوویت یونین اب قصہ پارینہ بن چکا ہے لیکن اس کے تربیت یافتہ گماشتے آج بھی اپنے شیطانی ہتھکنڈوں سے باز نہیں آرہے۔ کمیونزم کے شکار ترکستانی مسلمان چین کے اندر اپنی سیاہ رات کے چھٹنے کے منتظر ہیں۔

④ **فاشزم (فسطائیت) اور نازی ازم:** اٹلی کے مسولینی نے جہاں بڑے بڑے جلوسوں، مظاہروں اور اپنی قوت کے اظہار کے لیے فوجی طرز کی پریڈوں کو روشناس کرایا وہاں نازی ازم کے علمبردار ہٹلر کے ساتھ مل کر ایک مسلم ریاست البانیہ کو بھی

اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنایا۔ یہودیوں کے خلاف ہٹلر کی مہم جوئی کی کئی توجیہات کی جاسکتی ہیں جو کہ ایک علیحدہ موضوع ہے لیکن یہودیوں کو جس سفاکانہ طرزِ عمل کا سامنا کرنا پڑا، اُس سے انکار ممکن نہیں۔ برسبیل تذکرہ ایک بات کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہٹلر کے ہاتھوں یہود کی نسل کشی کی مہم میں مارے جانے والے افراد کا تخمینہ لگایا گیا۔ چونکہ تعداد بہت بڑی نہ تھی، اس لیے اصل تعداد کو چھپایا اور 60 لاکھ مقتولین کے عدد پر اتفاق کر لیا گیا۔ اسرائیل کے پہلے صدر وائزمین نے کہا کہ جھوٹ اگر چھوٹی نوعیت کا ہو تو لوگ اُسے تسلیم نہیں کرتے، اس لیے ایک بڑا جھوٹ گھڑنا ضروری ہو جاتا ہے۔

⑥ **صیہونیت**: اس حوالے سے صیہونیت کی تحریک میں اشکنازی یہودیوں کے کردار کو اُجاگر کیا گیا۔ یہ وہ روسی نسل کے یہودی ہیں جو قفقاز (کوہ قاف) کے علاقے میں مقیم تھے اور انھوں نے ایک مرحلہ پر یہودیت اس لیے اختیار کی کہ شمال کی طرف سے عیسائیوں کی یلغار اور جنوب کی طرف سے مسلمانوں کے حملوں سے بچ سکیں۔ عیسائیوں سے اس لیے کہ یہودیت کی آڑ میں اُن پر بُت پرستی کا ٹھپا نہیں لگ سکتا تھا اور مسلمانوں سے اس لیے کہ مسلمان یہودیوں کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ رکھتے تھے۔

اشکنازیوں کے مقابلے میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں سے چلنے والی نسل اُن یہودیوں پر مشتمل تھی جنھیں "سفاردیم" کہا گیا۔ یہ لوگ 70ء میں فلسطین سے نکالے جانے کے بعد شمالی افریقہ کے ممالک میں جا بسے تھے اور پھر اسپین میں اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ انھیں گوشۂ عافیت نصیب ہوا۔ سقوطِ غرناطہ (1492ء) کے بعد یہ دونوں گروہ یورپ میں اپنے پیر جمانے لگے۔ صیہونیت کی تحریک میں اشکنازی یہودی پیش پیش

تھے۔ چونکہ بنی اسرائیل سے ان کا کوئی نسلی تعلق نہیں تھا، اس لیے فلسطین میں ایک علیحدہ مملکت قائم کرنے کے لیے انھیں ''سفاردیم'' یہودیوں کی حمایت کی سخت ضرورت تھی، چنانچہ صیہونی تحریک کا بانی تھیوڈر ہرتزل سفاردیم میں سے تھا لیکن اس کا جانشین اسرائیل کا پہلا صدر وائزمین اشکنازی یہودی تھا۔

1956ء کی ایک مردم شماری کے مطابق دنیا میں یہودیوں کی کل آبادی ایک کروڑ، سترہ لاکھ تریسٹھ ہزار چار سو نوے تھی جن میں سفاردیم یہودیوں کی تعداد صرف پندرہ فیصد، یعنی سترہ لاکھ چوالیس ہزار آٹھ سو تراسی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فلسطین میں اسرائیل قائم کرنے والوں میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جن کا بنی اسرائیل سے نسلاً کوئی تعلق نہیں اور پھر اس قوم نے اپنے اس جھوٹے دعوے کی بنا پر غریب فلسطینیوں کو جس دہشت گردی اور سربریت اور درندگی کا نشانہ بنایا اور اب تک بناتے جا رہے ہیں وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب بن چکا ہے جس کے بند ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔

1948ء میں دیر یاسین کے قصبے میں 254 فلسطینی جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں شامل تھیں، صیہونی بہیمیت کا نشانہ بنے اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ لبنان میں واقع صبرا اور شاتیلا کے کیمپوں میں ایک بڑے پیمانے پر یہی کہانی دہرائی گئی۔ صبرا اور شاتیلا کا قاتل جنرل شیرون مغرب کی نظر میں دہشت گرد نہیں بلکہ امن کا پیغامبر گردانا جاتا ہے۔

⑦ **عالمگیریت:** ہمارے نزدیک عالمگیریت کی کوئی بھی تعریف کی جائے وہ صرف ایک بہکاوا ہے۔ اس سے مراد صرف ایک چیز ہی ہے اور وہ ہے ساری دنیا پر امریکہ کی بالادستی۔ امریکی دہشت گردی کا آغاز امریکہ کے اصل باشندوں ریڈ انڈین کی نسل

کشتی سے ہوتا ہے اور پھر یورپی اقوام کے ساتھ مل کر بحری قزاقی میں بھی یہ قوم پیچھے نہ رہی۔ 1945ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانا دہشت گردی کی سب سے بڑی کارروائیوں کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ اور پھر ویتنام کی جنگ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے افیون کی تجارت کرنا افغانیوں کے اس تجارت میں ملوث ہونے سے بہت پہلے کی بات ہے۔

11 ستمبر 2011ء کی واردات کے بارے میں حقائق کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ فرانسیسی محقق تیری میان نے اپنی دو تالیفات ''ایک خوفناک جھوٹ'' اور ''پینٹا گیٹ'' میں صاف صاف لکھا کہ ''پینٹا گون'' کی عمارت سے کسی جہاز کے ٹکرانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ جو کچھ عمارت کو نقصان پہنچا، وہ میزائل کے ٹکرانے سے ہی واقع ہو سکتا ہے۔

اسی طرح چارلس بریورو اور گلیوم ڈسکوائر نے اپنی کتاب ''ممنوعہ سچائی'' میں اس ایک نکتے پر کھل کر بحث کی ہے کہ امریکہ، افغانستان کے ذریعے سے وسطی ایشیا کی حکومتوں اور وہاں کے قدرتی وسائل پر مکمل قبضہ برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔

حال ہی میں جمی والٹر کی متعدد ثبوتوں اور شواہد پر مشتمل فلم بعنوان ''شواہد کا چیلنج'' منظر عام پر آئی ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نیو یارک کی دونوں عمارتیں (ٹاور) جہازوں کے ٹکرانے سے زمین بوس نہیں ہوئیں بلکہ اس ڈائنامائیٹ کے نتیجے میں گریں جو عمارتوں کے نچلے حصے میں اسی مقصد کے لیے پلانٹ کیے گئے تھے۔

پینٹا گون کی عمارت سے کسی جہاز کے ٹکرانے کی بھی تردید کی گئی اور یہ کہ پنسلوینیا میں جو طیارہ گرا وہ جہاز کے اندر کسی اندرونی کشمکش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اُسے عمداً باہر سے

میزائل کا نشانہ بنا کر گرایا گیا تھا۔

یہ جھوٹ جس بڑے پیمانے پر گھڑے گئے وہ ''وائز مین'' کے اس قول کا مصداق ہیں جو اُس نے ہٹلر کے ہاتھوں یہودیوں کی نسل کشی کے سلسلے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے ضمن میں کہا تھا: ''اگر جھوٹ چھوٹا سا ہو تو لوگ نہیں مانتے، اس لیے بڑا جھوٹ گھڑنا ضروری ہے۔''

شروع میں ریڈ انڈین کا تذکرہ آچکا ہے، اس سلسلے میں مشہور انگریزی مفکر برٹرنڈرسل لکھتا ہے: ''ریڈ انڈین کے سلسلے میں انگریز نسل کے امریکیوں کا سلوک بالکل مختلف تھا۔ وہ عام طور پر کہا کرتے تھے: اچھا انڈین وہی ہے جو مُردہ ہو۔''

تاریخ بتاتی ہے کہ کولمبس کی آمد کے وقت امریکہ میں ریڈ انڈین کی تعداد بیس لاکھ سے متجاوز تھی لیکن 2002ء میں اُن کی تعداد صرف 37 ہزار رہ گئی تھی۔ امریکہ کی ساری دنیا پر چھا جانے کی خواہش، سابق صدر امریکا جمی کارٹر کے ایڈوائزر بریزنسکی کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے: ''یورپ اور ایشیا ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہاں امریکہ کا غلبہ قائم ہو اور وہاں ایسی کوئی طاقت اپنے پیر نہ جما سکے جو امریکہ کو چیلنج کر سکے۔''

ہم اس مختصر تجزیہ کو ایک امریکی صحافی ٹوم پلیٹ کی بات پر ختم کرتے ہیں: ''امریکہ ایک سُپر پاور بن چکا ہے لیکن اس کے سر میں دماغ کی جگہ میزائل بستے ہیں۔''

معزز صدر گرامی قدر اور عزیز شرکائے محفل! السلام علیکم!

میں دائرۃ الفکر کے سیکرٹری برادرم زاہد اشرف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے دائرۃ الفکر کے عالی مقام پلیٹ فارم پر دعوتِ خطاب دے کر ایک بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ حق تو یہی ہے کہ اس علمی وفکری محفل میں وہی اہل علم مسند خطاب پر رونق افروز ہوں جو فکری اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتے ہوں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میرا کل اثاثہ تعلیم و تعلم کے ابتدائی مراحل کے بعد وہ مشاہدات و تجربات ہیں جو دعوت و تبلیغ کے میدان میں پچھلے چوبیس سال کے عرصے پر محیط ہیں۔ 1966ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فارغ ہونے کے بعد سے نو سال دیارِ افریقہ میں اور پھر

[1] 7 جنوری 1991ء کو فیصل آباد میں، علمی وفکری اور تحقیقی تنظیم "دائرۃ الفکر" کی جانب سے ایک مجلس مذاکرہ، تنظیم کے سینئر نائب صدر اور پرنسپل گورنمنٹ کالج فیصل آباد جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ موضوع تھا "دیارِ غرب میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل" جبکہ فاضل مقالہ نگار تھے جناب مولانا صہیب حسن، ڈائریکٹر القرآن سوسائٹی لندن۔ موصوف ایک طویل عرصے سے برطانیہ میں تعلیمی و تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ انھوں نے اسلامی عقائد اور تعلیمات کے بارے میں مراسلاتی کورسز کا آغاز کر رکھا ہے، جن سے یورپ اور افریقہ کے کئی ایک ممالک کے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ ذیل میں دیے جانے والے ان کے مقالے میں وہ اضافی نکات بھی شامل کیے گئے ہیں جو دورانِ مقالہ توضیحی طور پر انھوں نے بیان فرمائے تھے۔ (ادارہ)

1976ء سے برطانیہ کے قلب میں اپنی محدود صلاحیتوں کے مطابق دعوت الی اللہ کا جو کچھ تجربہ حاصل ہوا ہے اسی کا ایک گوشہ آج کی گفتگو کا موضوع قرار پایا ہے۔ دیارِ غرب میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق میری گفتگو زیادہ تر جزائرِ برطانیہ تک محدود رہے گی۔ لیکن ضمناً دوسرے مغربی ممالک کا تذکرہ بے محل محسوس نہ ہوگا۔

نبی ﷺ کی ایک حدیث کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہر گھر میں، چاہے وہ اینٹ پتھر کا بنا ہوا ہو یا خیمے کی شکل رکھتا ہو، اسلام داخل ہو کر رہے گا۔ اور اسلام کو برضا و رغبت ماننے والے عزت و احترام سے پہچانے جائیں گے، جبکہ مجبوراً وطوعاً اسلام کی سیادت تسلیم کرنے والے ذلت وخواری کا سامنا کریں گے۔

بیسویں صدی میں اسی حدیث کی صداقت کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے بعد سے یورپی ممالک میں اسلام کو عموماً نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور 1492ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد سے یورپ میں اسلام کے مزید تعارف کے امکانات بھی ختم ہو چکے تھے۔ لیکن آلِ عثمان کی ابھرتی ہوئی طاقت نے یورپ کے مشرقی حصے کو اسلام سے متعارف ہونے کا ایک زریں موقع فراہم کر دیا تھا لیکن یورپ کے شمالی اور مغربی علاقے جو صلیبی جنگوں کے محرک بنے تھے، بدستور اسلام سے بیگانہ رہے۔

برطانیہ کے ایک نومسلم جان ویبسٹر لکھتے ہیں: ''ہم اہل مغرب کا اسلام سے متعارف ہونا ایک انتہائی مشکل امر تھا کیونکہ صلیبی جنگوں کے بعد سے جان بوجھ کر یا تو اسلام کے نام سے تغافل برتا جاتا یا عملاً اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا۔''[1]

برطانیہ کے ایک اور نومسلم حسین رؤف اپنے اسلام لانے کے واقعے کے ضمن میں

[1] بحوالہ لماذا أسلمنا.

لکھتے ہیں کہ وہ حق کے متلاشی تھے۔ مسیحی باپ اور یہودی ماں کی بنا پر وہ ان دونوں ادیان کو قریب سے جانتے تھے، پھر انھوں نے ہندومت اور بدھ مت کا مطالعہ بھی کیا۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، قرآن کے ترجمے کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ لگا جو راڈویل (Rodwell) کا ترجمہ شدہ تھا لیکن یہ ترجمہ اپنی بے مائیگی کی بنا پر ان کے دل میں کوئی مقام پیدا نہ کرسکا۔ بہت بعد میں لندن کی مرکزی مسجد میں نمازِ عید کا ایک روح پرور منظر ان کے لیے باعثِ کشش ہوا اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ❶

مقصودِ کلام یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کے بعد سے دیارِ غرب میں اسلام کے صحیح تعارف کی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی تھی۔

مولانا وحید الدین خاں ڈاکٹر فلپ ہٹی کی کتاب: Islam and the West کے ایک باب بعنوان (Islam in Western Literature) کا خلاصہ رقم کرتے ہیں جس میں اہلِ مغرب کی اسلام اور نبی ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کے چند نمونے درج کیے گئے ہیں۔ ان نمونوں کو آپ دل پر جبر کر کے سن لیں۔ وہ لکھتے ہیں:

قرطبہ کا ایک بشپ ''Eulogius'' یولوجیس جو اپنے وقت کا بہت بڑا عالم تھا وہ ایک لاطینی تحریر کے حوالے سے جو ایک عیسائی راہب نے تیار کی تھی، لکھتا ہے:

محمد (ﷺ) کی وفات کے بعد ان کے اصحاب فرشتوں کا انتظار کر رہے تھے جو اتریں اور اُن کے جسم کو اُوپر لے جائیں مگر اس کے بجائے کتے آئے اور ان کے جسم کو کھا گئے۔ اسی لیے مسلمان ہر سال بہت بڑے پیمانے پر کتوں کو ہلاک کرتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذلك)

اسی طرح یہ بھی کہا گیا کہ محمد ﷺ کا تابوت زمین و آسمان کے درمیان فضا میں معلق ہے۔

اس افسانے کی تردید سترھویں صدی کے وسط میں آکسفورڈ کے ایک مقتدر عیسائی عالم ایڈورڈ پکاک نے کی۔ اس نے اپنے قارئین کو یقین دلایا کہ معلق تابوت کا افسانہ مسلمانوں کے لیے ایک مضحکہ خیز بات ہے جس کو وہ صرف عیسائیوں کی ایجاد سمجھتے ہیں۔ اس نے مزید اس مروجہ کہانی کو چیلنج کیا کہ اسلام کے بانی نے ایک سفید کبوتر کو تربیت دے رکھی تھی تاکہ وہ ان کے کندھے پر بیٹھا رہے اور کان کے اندر پڑے ہوئے دانے کو چگنے کے لیے کان میں چونچ مارتا رہے۔ اس سے وہ اپنے متبعین کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ کبوتر کے ذریعے سے روح القدس ان کو الہام کر رہے ہیں۔ یہ افسانہ اس قدر مشہور ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں شامل ہوگیا، چنانچہ شیکسپئر کے ایک کردار کی زبان سے ہم سنتے ہیں۔ اس کا کردار کسی دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتا ہے:

Was Mahomet[1] inspired by a dove , Thou with an eagle art inspired then-

(ترجمہ) ”اگر محمد (ﷺ) ایک کبوتر سے الہام یافتہ ہوئے ہیں تو تم کسی عقاب سے الہام یافتہ معلوم ہوتے ہو۔“

شیکسپئر سے بہت پہلے جان لڈگیٹ Jhon Lydgate (متوفی 1451ء) اس کبوتر کا رنگ تک جانتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق کبوتر کا رنگ دودھیا سفید تھا، پھر یہ

[1] لفظ (محمد ﷺ) کو بگاڑ کر (Mahomet) لکھا گیا۔

یقین یہاں تک بڑھا کہ اٹھارہویں صدی کے ایک کبوتروں کے ماہر نے ایک خاص قسم کے کبوتروں کا نام (Maumet) رکھ دیا جو دراصل محمد ﷺ (نام) کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ [1]

یہ تو تھے صلیبی جنگوں کے بعد کے اثرات لیکن اس صدی میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ کے لیے وہ مواقع فراہم کردیے ہیں جو اس سے قبل مہیا نہ تھے۔ اس اجمال کی مختصر توضیح فکری اور تاریخی اعتبار سے آیندہ سطور میں رقم کی جاتی ہے:

موجودہ صدی میں تحقیق و تنقیح کے جو معیار قائم ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں مغربی مؤلفین اسلام کو بہتر طریقے سے سمجھنے لگے ہیں۔ راڈویل (Rodwell) اور سیل (Sale) کے تراجم قرآن کے بعد مستشرقین میں سے آربری نے ترجمۂ قرآن کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

آربری کو اس بات کا کریڈٹ ملنا چاہیے کہ نہ صرف زبان و ادب کے لحاظ سے بلکہ عربی نص سے قریب ترین ہونے کے اعتبار سے بھی اس کے ترجمے کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ آربری نے مقدمۂ قرآن میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ایک عظیم کتاب ہے اور میں اپنی زندگی کے ان اوقات کو انتہائی خوشگوار اور اثر آفرین سمجھتا ہوں جن میں، میں اس عظیم کتاب کی ترجمانی کر رہا تھا۔ [2]

یہاں میں اس بات کا اضافہ کردوں کہ انگریزی کا مشہور ترجمۂ قرآن عبداللہ یوسف علی کا ہے، اس کی زبان بڑی (Flowery English) ہے۔ بہت ہی ادیبانہ سٹائل اور بہت ہی مقبول لیکن اس ترجمے کے حواشی میں بعض باتیں ایسی ہیں جو اسلام

[1] بحوالہ الرسالہ دسمبر 1988ء۔ [2] مقدمہ ترجمۂ قرآن از آربری۔

کے عقائد سے ٹکراتی ہیں، مثلاً: رِبا (سود) کی تعریف اور اسی طریقے سے آخرت کو بار بار (Spiritual World) روحانی دنیا کہنا، یعنی یہ صرف روح کا ایک تجربہ ہوگا نہ کہ جسمانی لذت کا سامان یا جسمانی عذاب کے لیے جہنم کا وجود۔ اسی طریقے سے اس نے اور بہت سی باتیں اسلامی عقائد کے خلاف لکھی ہیں۔ اس وجہ سے سعودی عرب میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی تاکہ اس ترجمے پر نظر ثانی کی جائے۔ پچھلے دس سال کے عرصے میں چار کمیٹیوں نے اس پر کام کیا ہے جس میں پاکستان سے جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب بھی شامل تھے۔ سعودی عرب سے ڈاکٹر جعفر اور ٹنگسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، جو بعد میں شہید ہوگئے، یہ سب حضرات شامل تھے۔ آخری کمیٹی میں مجھے اور میرے ایک مصری ساتھی ڈاکٹر درش کو بھی یہ اعزاز ملا کہ ہم (Final Touching) کریں اور اسے (Revise) کریں۔ اس کے تقریباً چھ ہزار حاشیے ہیں جو ہم نے لفظ بلفظ پڑھے اور ان میں سے بہت سی ایسی باتیں نکال دیں جو اسلامی عقائد سے ٹکراتی تھیں۔ یہ (Revised Edition) مجمع الملک فہد مدینہ منورہ (سعودی عرب) سے شائع ہوا ہے لیکن ابھی تک اس کی (Circulation) عام نہیں ہوئی ہے۔ اس زمانے میں اس ترجمے کو (Revise) کرتے وقت میں اپنے سامنے آربری، پکتھال، عراقی یہودی داود اور محمد علی لاہوری کے تراجم رکھتا تھا تاکہ اگر عبداللہ یوسف علی کی ترجمانی کہیں بھی متن سے ذرا دور ہو تو ہم ان تراجم میں سے قریب ترین ترجمے کو شامل کرلیں۔

مارٹن لنگز کی سیرت کے موضوع پر شہرہ آفاق کتاب اپنی پیشرو کتابوں کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ مؤلف زیادہ تر ابن سعد کی الطبقات اور تاریخ طبری

اور واقدی اور کلبی پر انحصار کرتا ہے۔ اسی لیے سیرت کے بعض گوشوں کو وہ ویسے منقح نہیں کر سکا ہے جس کی سعادت موجودہ زمانے میں صاحب رحمۃ للعالمین قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ یا صاحب سیرت النبی ﷺ مولانا شبلی رحمہ اللہ اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کو حاصل ہوئی ہے۔

آئرلینڈ کا مشہور ادیب اور ڈرامہ نویس برنارڈ شا، نبی ﷺ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

> If a man like Mohammad were to assume the dictatorship of the modern world he would solve its problems in the way that would bring it much needed peace and happiness .
>
> ''اگر محمد ﷺ جیسی شخصیت کو عصر حاضر کی ڈکٹیٹرشپ حاصل ہو جائے تو وہ آج کی دنیا کے مسائل اس انداز میں حل کر سکیں گے کہ یہ دنیا امن و مسرت کا گہوارہ بن جائے گی جس کی اشد ضرورت ہے۔ [1]

امریکہ کا مائیکل ہارٹ انسانیت کی سو عظیم شخصیتوں کا انتخاب کرتا ہے تو سر فہرست نبی ﷺ کا نام درج کرتا ہے۔ جس شخصیت کا وہ خود نام لیوا ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام ان کو تیسرے نمبر پر جگہ دیتا ہے۔

گو آج برطانیہ میں سلمان رشدی جیسا کردار پایا جاتا ہے لیکن اسے اہل مغرب میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا کہ اس کا خمیر ارض ہند و پاک سے اٹھا ہے۔ بمبئی میں وہ شخص پیدا ہوا۔ کراچی میں، ریڈیو پاکستان میں کام کرتا رہا، جبکہ اس سے پہلے اس کی زیادہ تر

[1] ... برنارڈ شا۔

تعلیم انگلینڈ کی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں پادری فنڈر اور اسی قماش کے دوسرے عیسائی مبلغین مسلمانوں کو جابجا چیلنج دے رہے تھے اور اب خود برطانیہ میں یہ موقع فراہم ہو رہا ہے کہ جنوبی افریقہ کے نامور مسلمان مناظر احمد دیدات، لندن کے سب سے بڑے ہال میں عیسائی علماء کو دعوت مبارزت دے رہے ہیں لیکن کوئی برطانوی عیسائی عالم ان کے چیلنج کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں، چنانچہ احمد دیدات تین سال برابر لندن اور برمنگھم میں امریکی عیسائی علماء سے مناظرہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اس امر میں اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ کیا آج کے ماحول میں مناظرہ بازی سے مفید نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟ اور یہ کہ دعوت کا محور اثباتی ہونا زیادہ مفید ہے یا منفی؟ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ احمد دیدات نے بائبل کے مکمل استحضار کے بعد عیسائی مبلغین کے لیے سوائے راہِ فرار کے اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔

مقالہ نگار کو خود کئی موقعوں پر اور بعض دفعہ کلیساؤں کے اندر منتخب عیسائی اجتماعات سے خطاب کرنے کا موقع ملا ہے اور ان کی یہ خواہش محسوس کی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں کسی مسلمان سے براہِ راست معلومات حاصل کریں۔ ایسی مجالس میں بعض ایسے مسائل بھی زیرِ بحث آئے جن کے بارے میں خود عامۃ المسلمین لاعلمی کا شکار ہیں، مثلاً: ایک ہی سانس میں طلاق طلاق طلاق کہہ کر ازدواجی رشتے کو توڑ ڈالنا، چاہے یہ رشتہ بیس تیس سال سے چلا آ رہا ہو۔ میں نے اپنے سامعین پر واضح کیا کہ اگر طلاق دینے والا قرآن وسنت کے بتائے ہوئے طریقے کو ملحوظ رکھے تو پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجوع کا حق حاصل رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس مقدس رشتے

کو تارِ عنکبوت کی مانند نہیں بنایا کہ وہ ایک ہی ہلے میں نیست و نابود ہو جائے بلکہ باہمی افہام و تفہیم کے لیے عدت کی شکل میں معقول مدت فراہم کی ہے جس سے تیسری طلاق سے پہلے پہلے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

ایک دم طلاق دینے سے کیا غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس کے بارے میں ایک لطیفہ آپ کو سناتا ہوں۔ عباسی خلیفہ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا: رات ایک عجیب واقعہ ہوا ہے کہ ایک شخص نے پانچ عورتوں کو طلاق دے دی۔ خلیفہ نے کہا کہ چار عورتوں والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی چار بیویاں ہوں گی، اس نے سبھی کو طلاق دے دی لیکن یہ پانچ والی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس نے کہا کہ اس کی تو چار ہی بیویاں تھیں۔ وہ گھر آیا تو کھانا نہیں پکا ہوا تھا۔ وہ سخت غصے اور اشتعال میں آ گیا۔ اس نے اپنی ایک بیوی سے کہا: ''طلقتك'' (میں نے تمھیں طلاق دی)۔ دوسری بیوی نے کہا: حضرت یہ بیوی آپ کے ساتھ بیس سال سے ہے اور آپ نے ایک ہی لمحے میں اسے طلاق دے دی۔ کیا بات کر رہے ہیں آپ؟ اس نے کہا: تمھیں بھی طلاق، چنانچہ اسے بھی طلاق ہو گئی۔ تیسری کہنے لگی: اللہ کے بندے! اللہ سے ڈرو، دو بیویوں کو تو تم نے ایک ہی رات میں طلاق دے دی ہے۔ اُس نے کہا: ''طلقتك'' (میں تمھیں بھی طلاق دیتا ہوں، تم بھی جاؤ)۔ چوتھی نے سمجھا کہ اب تو میں ہی باقی رہ گئی ہوں۔ مجھے تو یہ طلاق نہیں دے گا۔ اس نے کہا: تم میں اللہ کا خوف بالکل نہیں ہے۔ تم نے تین بیویوں کو طلاق دے دی۔ اللہ کے بندے! اللہ سے ڈرو۔ اس نے کہا: تمھیں بھی طلاق۔ چاروں کو طلاق ہو گئی۔ اتفاق سے پڑوسن یہ سب کچھ سن رہی تھی، اس نے چیخ کر کہا: اللہ کے بندے! تم نے چاروں بیویوں کو طلاق دے

دی۔ کچھ اللہ سے ڈر۔ اس نے کہا: اگر تیرا شوہر اجازت دے تو تجھے بھی طلاق۔ اس کا شوہر کہانی سن رہا تھا۔ اس نے کہا: میری طرف سے اجازت ہے۔ یوں پانچوں کو طلاق ہوگئی۔

طلاق کے ادارے (institution) کو جس طرح خراب کیا گیا ہے، یہ واقعہ اس کی ایک بہت ہی روشن مثال ہے۔

تعدّد ازواج اور اسلام میں خواتین کے مقام پر اب بھی اہل مغرب میں شکوک و شبہات کی فضا پائی جاتی ہے لیکن خود مغربی معاشرے کی دورنگی، ایک بیوی کے باوجود داشتہ کا تصور اور عورت و مرد کے بالکل مساوی ہونے کے تصور کی ناپختگی مرد و زن کے بارے میں اسلامی تعلیمات کی حقانیت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں بشرطیکہ مسلمان اہل قلم اور مبلغین اپنی بات صحیح اور سائنٹفک انداز میں پیش کرسکیں۔

یہ تو تھا تذکرہ کچھ فکری امور کا۔ اب تاریخی پہلو کی طرف آئیے:

برطانیہ میں عیسائیت اتنی ہی پرانی ہے جتنا اسلام جزیرۂ عرب میں۔ نبی ﷺ کی بعثت (610ء) سے قبل سینٹ آگسٹین جزائر برطانیہ میں عیسائیت کا علم لیے وارد ہوچکا تھا اور وہاں کے مقامی بت پرستوں سے برسر پیکار تھا۔ عیسائی مشنریز اپنی پیہم کوششوں سے جزائر برطانیہ اور آئرلینڈ کو بالآخر عیسائی بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ صلیبی جنگوں کے بعد لندن کے قریب ایک قصبہ سینٹ آلبنز (St: Albans) کے ایک نائٹ (Knight) کا تذکرہ ملتا ہے جو حلقہ بگوش اسلام ہوچکا تھا۔ لیکن تاریخ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ اس کی نسل میں اسلام باقی رہا یا نہیں۔

لندن کے سنڈے ٹائمز کی اشاعت میں ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ تیرھویں صدی میں انگلستان کی تاریخ میں ایک ایسا نازک لمحہ آ گیا تھا جب انگلستان کے ایک مکمل اسلامی ملک بن جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا تھا۔ مؤرخ کے الفاظ ہیں:

"For a crucial moment in the thirteenth century, England faced the prospect of being tatally converted lock stock and barrel-into a Muslim country."

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تیرھویں صدی کا ایک بادشاہ جان لیک لینڈ، جس کے زمانہ میں مشہور تاریخی دستاویز (Magna Carta) پاس کی گئی تھی، اپنے معاصر مذہبی عناصر یا بالفاظ دیگر پادریوں (Clergy) سے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اس نے باہر سے امداد حاصل کرنے کی ٹھانی، چنانچہ 1213ء میں کنگ جان نے تین افراد پر مشتمل ایک وفد مراکش کی اسلامی سلطنت الموحدین کے سلطان ابوعبداللہ الناصر کے پاس بھیجا اور درخواست کی اگر خلیفہ اسے فوجی امداد دے تو وہ اپنی رعایا سمیت مسلمان ہونے اور خلیفہ کی اطاعت کرنے کے لیے تیار ہے۔ شومیٔ قسمت سے مسلمان خلیفہ نے دوراندیشی سے کام لیے بغیر اس درخواست کو ٹھکرا دیا۔ مؤرخ لکھتا ہے کہ جب اس وفد نے آ کر اپنی ناکامی کی روداد بیان کی تو کنگ جان پھوٹ پھوٹ کر روئے بغیر نہ رہ سکا۔[1]

انگلینڈ کے جنوبی حصے میں ایک بادشاہ اوفا کے زمانے کے ایسے سکے دستیاب ہوئے ہیں جن پر کلمۃ اللہ مرقوم ہے۔ اس بات کا تعین نہیں کیا جا سکا کہ آیا یہ بادشاہ

[1] سنڈے ٹائمز 22 اکتوبر 1987ء

مسلمان ہو چکا تھا یا اس نے اپنے سکے کسی مسلم ریاست کے ٹکسال میں ڈھلوائے تھے۔

انیسویں صدی میں انگریز بہت سے اسلامی ممالک پر اپنا قبضہ مستحکم کر چکے تھے، اس لیے مسلمان نوابوں اور شیوخ کی آمد و رفت جزائر برطانیہ میں شروع ہو چکی تھی لیکن کسی مقامی انگریز کے مسلمان ہونے کی شہادت انیسویں صدی کے وسط کے بعد ہی ملتی ہے۔

جان لین پول اپنی کتاب (The Studies in Muhammadanism) میں ایک باب بعنوان (Islam in Liverpool) میں لکھتا ہے کہ اسے لیور پول کی ایک مسجد کے بارے میں علم ہوا جسے ایک انگریز نومسلم وکیل نے قائم کیا تھا، چنانچہ وہ لیور پول پہنچا، نومسلم عبداللہ ولیم قولیم سے ملاقات کی اور اس کی توجہ مسجد کے دروازے سے متصل مرقوم کلمہ طیبہ کے انگریزی ترجمے کی طرف دلائی جس میں کلمہ کے جزو ثانی میں (Muhammad was massenger of Allah) لکھا ہوا تھا۔ پول لکھتا ہے کہ میں نے اسے بتایا کہ (was) کی جگہ (is) ہونا چاہیے۔ لین پول کی یہ کتاب 1880ء کے لگ بھگ شائع ہوئی ہے۔ اس نے نومسلم کا مزید تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ عبداللہ ولیم مراکش میں مسلمان ہوا اور واپسی کے بعد اپنے آبائی شہر لیور پول میں اسلام کی تبلیغ شروع کی۔ ایک مکان کو مسجد قرار دے کر باقاعدہ نماز کا آغاز کیا۔ اسلام کے بارے میں کئی مختلف پمفلٹ شائع کیے اور اسی شخص کی تبلیغ سے اب تک پچاس کے قریب مرد و عورت مسلمان ہو چکے ہیں۔ پول لکھتا ہے کہ اس وقت انگلینڈ میں بشمول مانچسٹر، لندن اور ووکنگ کوئی دو سو پچیس مسلمان ہوں گے جن میں زیادہ تر غیر ممالک سے آئے ہوئے سفارت کار یا طلبہ شامل ہیں۔

پول نے اپنے مقالے کے آخر میں یہ ریمارکس دیے ہیں: ”اگر اسلام اسی سست رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا رہا تو وہ یکا یک اپنی موت آپ مرجائے گا۔“

پول کے اصل الفاظ یہاں حوالے کی عدم موجودگی کی وجہ سے نہیں دیے جا رہے، میں نے اسی موضوع پر اپنے ایک عربی مقالے میں یہ ریمارکس دیے تھے:

”اگر آج پول زندہ ہوتا تو دیکھتا کہ سو سال کے بعد انگلینڈ میں بحکم الٰہی پندرہ لاکھ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں اور سارے ملک میں چھ سو سے زیادہ اللہ کے گھر قائم ہو چکے ہیں اور ان میں روز روز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔“

اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میں وہاں گیا تو گلی کے بچے مسجد کی کھڑکیوں کے اوپر پتھر مار رہے تھے۔ اور یہ بات اب بھی ہو رہی ہے۔ اب بھی بہت سی ایسی مساجد ہیں جن پر گورے بچے پتھر پھینکتے ہیں اور مسجد کے شیشے توڑ ڈالتے ہیں۔

نومسلم عبداللہ قولیم کی تبلیغی سرگرمیوں کا تذکرہ جریدہ ”ضیاء السنۃ“ میں ملتا ہے جو اس صدی کے آغاز میں 1902ء سے 1905ء تک کلکتہ سے نکلتا رہا ہے اور جس کے ایڈیٹر مقالہ نگار کے پردادا مولانا عبدالجبار عمر پوری رحمہ اللہ تھے اور اس کے منتظم مولانا مرحوم کے بھائی مولانا ضیاء الرحمان رحمہ اللہ تھے۔

اس جریدے کی فائلیں چونکہ ہمارے پاس موجود ہیں، اس لیے اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے مجھے یہ حوالے ملے۔

نومسلم عبداللہ بعض وجوہات کی بنا پر لیور پول کو خیر باد کہہ گئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام، بقول ایک محقق، انھوں نے لندن کے قریب قصبہ ووکنگ میں گزارے جہاں شاہجہاں ماسک (Shah Jehan Mosque) کے نام سے ایک مسجد کی داغ

نبل 1900ء سے قبل ڈالی جا چکی تھی۔ اس مسجد کے قیام کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک انگریز استاد مسٹر لائٹنر (Leitener) جو لاہور کے اورینٹل کالج میں پڑھاتے رہے تھے، برصغیر سے اس عزم کے ساتھ واپس ہوئے کہ وہ اپنی جاگیر میں بین المذاہب قسم کا ایک کمپلیکس تعمیر کریں گے جس میں ایک مسجد، ایک یہودی عبادت گاہ اور ایک چرچ شامل ہوگا، چنانچہ لندن پہنچنے کے بعد انھوں نے ووکنگ کے قصبے میں اسی کام کا بیڑا اٹھایا، مسجد قائم کرنے کے سلسلے میں ریاست بھوپال کی والیہ شاہجہان بیگم نے ایک خطیر رقم عطا کی جس سے ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد وجود میں آ گئی۔ مسجد کے ساتھ لائبریری کی عمارت بھی قائم کر دی گئی۔ لیکن مسٹر لائٹنر اپنے خواب کے پوری طرح شرمندۂ تعبیر ہونے سے قبل ہی اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور یوں یہ مسجد اپنی امتیازی حیثیت کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی رہی، یعنی مسجد وہاں پر باقی ہے، کوئی چرچ قائم نہ ہو سکا، کوئی یہودی عبادت گاہ نہ بن سکی۔ یہ اللہ کی دین ہے۔

1913ء سے اگلے پچاس سال تک خواجہ کمال الدین لاہوری قادیانی اور ان کی وفات کے بعد ان کے ہم مشرب اس مسجد پر قابض رہے لیکن بالآخر عدالتی چارہ جوئی کے بعد یہ مسجد مقامی پاکستانی مسلمانوں کی تحویل میں دے دی گئی اور فی الوقت پاکستانی سفارت خانہ مسجد کے تمام امور کا ذمہ دار ہے۔

اب یہ بتاؤں گا تو آپ کو تکلیف ہوگی کہ اس مسجد میں جو امام صاحب ہیں، ان کی وجہ سے کئی نمازیوں کے سر پھوڑے جا چکے ہیں اور آج کل ہمارے ایک عزیز دوست ہسپتال میں کئی روز رہنے کے بعد گھر میں صاحب فراش ہیں، اس لیے کہ انھیں

باقاعدہ امام صاحب کی شہ پر پٹوایا گیا ہے اور اب پاکستانی سفارت خانہ کسی معتدل عالم کی تلاش میں ہے، جو واقعی اسلام کو اعتدال کے ساتھ سمجھتا ہو، فرقہ بازی کے رنگ میں نہ سمجھتا ہو۔

دوسری جنگ عظیم تک انگلینڈ میں مسلمانوں کی تعداد واجبی سی تھی۔ لندن کے علاوہ چند ساحلی شہروں جیسے لیورپول، شیفیلڈ، ساؤتھ شیلڈ اور کارڈف میں بحری جہازوں کی آمدورفت کی بنا پر یمن اور صومالیہ کے کئی مسلم باشندے قیام پذیر ہو چکے تھے۔ 1945ء کے لگ بھگ ویلز کے مرکزی شہر کارڈف میں نور الاسلام مسجد کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس مسجد کے حصول کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہوا یہ کہ کارڈف میں مقیم ایک یمنی شیخ عبداللہ حکمی ایک دفعہ بادشاہ وقت کنگ جارج کی ایک دعوت میں شریک ہوئے۔ جہاں عمائدین سلطنت کے علاوہ مختلف مذاہب کے نمائندے بھی شریک تھے۔ عین کھانے سے قبل نماز کا وقت تھا، چنانچہ شیخ حکمی اپنی جگہ سے اُٹھے، ہال کے ایک کونے میں اپنا مصلّٰی بچھایا اور نماز شروع کر دی۔ ان کا کرسی سے اٹھنا اور سب کی نگاہوں کے سامنے نماز کا شروع کرنا خود بادشاہ کی دلچسپی کا باعث ہوا اور ہال میں موجود تمام حضرات ٹکٹکی باندھے شیخ کی حرکات و سکنات کو دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد جب شیخ اپنی نشست پر واپس آئے تو بادشاہ نے انھیں بطور خاص مخاطب کیا اور کہا:

I am very much impressed by you. So what can I do for you?

جیسا کہ انگریز کہتے ہیں کہ میں آپ کے لیے کیا خدمت انجام دے سکتا ہوں۔ شیخ نے کہا کہ صرف ایک کلمہ اپنی زبان سے ادا کر دو تو میں راضی ہو جاؤں گا اور وہ کلمہ ہے:

أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ.

شاہ مسکرایا اور کہنے لگا: میں تمھیں کارڈف میں ایک قطعہ اراضی عطا کرتا ہوں جہاں تم اپنی مسجد تعمیر کر سکتے ہو، چنانچہ 1945ء کے لگ بھگ یہ مسجد بنائی گئی اور یہ ایک قدیم ترین مسجد ہے اور اب اسے گرا کے ایک نئی مسجد وہاں بنائی جا رہی ہے، اب بھی وہاں یمنی اور صومالی آباد ہیں۔

اس صدی کے پانچویں عشرے میں نہ صرف کارڈف بلکہ لندن کے مشرقی اور مغربی حصے میں دو مرکزی مساجد کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ لندن کی موجودہ مرکزی مسجد کا قطعہ زمین جو ریجنٹ پارک کے ایک کنارے پر واقع ہے، اسکندریہ (مصر) میں ایک گرجا تعمیر کرنے کے عوض دی گئی رقم سے حاصل کیا گیا۔ لندن کے مشرقی حصے میں تین مکانات لے کر انھیں بغرض مسجد استعمال میں لایا گیا۔ اب ان دونوں علاقوں میں شاندار مساجد قائم ہیں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی باعث کشش بن چکی ہیں۔ ریجنٹ پارک کی مسجد زاہد صاحب نے ابھی حال ہی میں دیکھی ہے، وہ بیان کر سکتے ہیں کہ کتنی عالی شان مسجد ہے اور اسی طرح لندن کے مشرقی علاقے میں جہاں 50 ہزار بنگالی آباد ہیں، اسے آپ لٹل بنگلہ دیش کہہ سکتے ہیں، وہاں ایک بہت اچھی مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔ اس مسجد کی تعمیر کے لیے شاہ فہد نے ایک ملین پونڈ عطا کیے تھے۔ ایک ملین پونڈ مقامی طور پر جمع کیے گئے اور یہ مسجد تعمیر ہوئی لیکن پھر میں وہ تکلیف دہ بات آپ کو بتا دوں، وہاں پچھلے دو سال سے پولیس تحفظ کے تحت بعض دفعہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ مسجد تو اتنی شاندار بن گئی مگر اب نمازیوں یا منتظمین کے درمیان جھگڑے چل رہے ہیں۔ خوب مار پٹائی ہوتی ہے۔ پولیس نے کئی

بار انھیں پکڑا ہے اور وہ جیلوں میں گئے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمے چل رہے ہیں اور مقامی اخبارات میں سرخیوں کے ساتھ یہ شائع کیا جاتا ہے کہ لندن کی مشرقی مسجد میں آج اتنے آدمیوں کی پٹائی ہوئی۔

جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل مغرب کے لیے مسلمان مہاجروں (immigrants) کی شکل میں اسلام سے متعارف ہونے کا ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔

جرمنی میں ترک مسلمانوں کی یلغار ہوئی، خاص طور پر برلن شہر میں ترکوں کی ایک بہت بڑی تعداد آباد ہو چکی ہے اور جس علاقے میں وہ کثرت سے رہائش پذیر ہیں اسے لٹل استانبول (Little Istanbul) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

میں نے برلن کا دورہ کیا ہے، وہاں مجھے ترکوں کی مساجد میں خطاب کرنے کا موقع ملا ہے۔ سخت سردی کے موسم میں جبکہ وہاں برف گر رہی تھی، وضو کے لیے بالکل یخ ٹھنڈے پانی کا انتظام تھا، حالانکہ مسجد کو گرم رکھنے کا مکمل انتظام موجود تھا۔ ہم نے کہا: اللہ کے بندو پانی بھی آپ گرم کر لیتے۔ کہنے لگے: ''نہیں جی ٹھنڈے پانی سے ثواب زیادہ ہوتا ہے۔'' بہر صورت ان کی کافی مساجد ہیں۔ مسجد عمر ہے، مسجد مولانا ہے (مولانا سے مراد مولانا روم رحمہ اللہ ہیں) اور ماشاء اللہ ان کے اپنے اپنے ریستوران ہیں اور ترکوں کی وہاں اچھی خاصی آبادی ہے۔ وہاں ایک مسجد ایسی بھی تھی جو جنگ عظیم دوم سے قبل مسلمانوں نے وہاں قائم کی تھی۔ جنگ عظیم کے وقت وہاں کے سب باشندے برلن چھوڑ کر بھاگ گئے، مسلمان بھی چلے گئے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو مسجد کو خالی دیکھ کر قادیانی حضرات نے اس پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا

کہ یہ مسجد ہمیں ملنی چاہیے۔ وہاں کی مقامی حکومت نے دریافت کیا کہ اس کا فیصلہ کون کرے۔ ہم پاکستان سے پوچھتے ہیں کہ یہ مسجد کسے ملنی چاہیے۔ اس وقت وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں تھے۔ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے قادیانی حضرات کو دینے کے لیے کہا، چنانچہ یہ مسجد انھیں دے دی گئی اور آج تک ان کے قبضے میں ہے۔ وہ واحد مسجد ہے جو گنبد اور مینار کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مسجد بھی مینار والی ہے، جو غالباً ترکوں نے کسی زمانے میں اپنے ترک فوجیوں کے لیے بنائی تھی کیونکہ ترک جرمنی کے حلیف رہے ہیں۔ باقی جتنی بھی مساجد ہیں، ہالز (Halls) کے اندر ہیں۔

فرانس میں الجزائر اور مراکش کے دو لاکھ سے اوپر مسلمان آباد ہو چکے ہیں۔ امریکہ میں ایلیجاہ محمد کی تحریک کافی حد تک اسلام کے مسخ شدہ عقائد پر مشتمل تھی لیکن جب سے ایلیجاہ محمد کے بیٹے وارث الدین محمد نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی ہے، امریکہ کے بلالی مسلمانوں کی تنظیم میں اصلاحات جاری ہیں۔

1978ء میں بحیثیت استاد ایک کورس میں شرکت کے لیے مجھے شکاگو جانے کا اتفاق ہوا تو میں وہاں ان کی بڑی مسجد میں گیا۔ تب وہاں باقاعدہ صفوں پر نماز ہوا کرتی تھی لیکن مجھے بتایا گیا کہ صفوں پر یہ نماز کچھ عرصہ قبل ہی شروع کی گئی ہے۔ اس سے قبل یہاں کرسیوں پر نماز ادا کی جاتی تھی جیسے چرچ کے اندر عبادت ہوتی ہے۔ لیکن جس چیز کو میں نے نوٹ کیا وہ یہ تھی کہ نماز سے قبل قبلے کی طرف موجود دروازے سے ایک خاتون کو وہیل چیئر پر اندر لایا گیا۔ صفوں کے سامنے وہ خاتون بیٹھی رہیں اور باقی لوگ نماز پڑھتے رہے۔ میں نے پوچھا: یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے غالباً یہ بتلایا کہ یہ ایلیجاہ محمد کی بیوی یا ان کی کوئی عزیزہ ہے۔ اس بڑھیا کو اکرام

کے طور پر وبیل چیئر پر وہاں بٹھایا گیا تھا۔ سو اس قسم کی باتیں ابھی وہاں ان کے ہاں موجود ہیں۔ اس وقت وارث الدین محمد نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ روزہ سورج طلوع ہونے سے مغرب تک ہوگا۔ فجر کی تبدیلی تو شاید انھوں نے بعد میں کی ہے۔ پہلے روزہ یہی تھا تاکہ مختصر ہو۔

عبدالمالک مالکم ایکس اسی تحریک کی پیداوار تھے لیکن صحیح اسلام سے متعارف ہونے کے بعد انھوں نے اصلاحِ احوال کا بیڑا اٹھایا اور بالآخر اپنی جرأت رندانہ یا زیادہ صحیح تعبیر کے مطابق جرأت مجاہدانہ کے نتیجے میں شہادت کے مقام پر فائز ہو گئے۔

پاک و ہند اور عرب کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امریکہ کی بود و باش اختیار کر چکی ہے۔ برطانیہ میں پاکستانیوں کے قیام کے بعد سے پاک و ہند کے مسلمانوں کی آمد شروع ہوگئی جو اصلاً انگریزوں کی فیکٹریوں اور کارخانوں کے لیے کل پرزے کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان کی آمد بالآخر اسلام کی پہچان بن گئی۔ ان مسلمانوں کے حساس اور دینی جذبے سے بیدار طبقے نے ہر علاقے میں مساجد اور شبینہ مدارس قائم کیے۔ جن کا وجود غیر مسلموں کے لیے احقاقِ حق اور قیامِ حجت کا باعث بن رہا ہے۔

مسلمانوں کی اپنی اصلاحِ نو اور اصلاحِ احوال کے لیے بے شمار جماعتیں اور انجمنیں وجود میں آ چکی ہیں جو اپنے اپنے محدود وسائل کے ساتھ اسلام کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ پاک و ہند کا کوئی ایسا مکتبِ فکر نہیں جس کے پیروکاروں کی ایک معتد بہ تعداد وہاں موجود نہ ہو۔ یہ امر جہاں اسلام کے تعارف کا باعث بن رہا ہے، وہاں گروہی اختلافات کے نمایاں ہونے کی بنا پر اسلام کی ایک غلط پہچان کا عنوان بھی بن چکا ہے۔

علمی و فکری سطح پر کئی ایسے ادارے ہیں جو انگریزی زبان میں اسلام کے تعارف

کے لیے لٹریچر شائع کر رہے ہیں اور اب حق کے متلاشی کے لیے ایسی کتابوں کی کمی نہیں ہے جنھیں ایک غیر مسلم کو بلا کھٹکے دیا جاسکتا ہے۔ راقم الحروف نے اپنی تنظیم ''القرآن سوسائٹی'' کے تحت قرآن میں مذکور انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پر مشتمل بیس اسباق کا ایک کارس پانڈینس کورس (Correspondence Course) ترتیب دیا ہے جو پچھلے دس سال سے بالاقساط شائع ہونے کے بعد مکمل ہو چکا ہے۔ اب اسلام کے تعارف کے عنوان سے مختصر کتابچوں کا آغاز ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں آج تک سات کتابچے منظر عام پر آ چکے ہیں۔

بہر صورت ہر اس کتاب کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جو اسلام کا تعارف ایک موثر اور سائنٹیفک انداز میں کرا سکے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کی عقائد و عبادات سے متعلق اولین تصنیفات، موجودہ دور کے مولانا وحید الدین خان کے کتابچے، کینیڈا کے ڈاکٹر جمال بدوی کے ریکارڈ شدہ کیسٹ اور ایسے ہی احمد دیدات کے مناظرانہ رنگ پر مشتمل پمفلٹ اپنی جگہ بہت مفید ہیں۔

پچھلے دو سالوں میں سلمان رشدی کی زہریلی تصنیف اور امسال خلیج کے حالات اور بابری مسجد کے واقعہ کی بنا پر شاید ہی دیار غرب میں کوئی ایسا گھر رہ گیا ہو جہاں اسلام یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ نہ ہوا ہو۔ گو وسائل ابلاغ نے پہلے دونوں واقعات کو اسلام اور مسلمانوں کی ایک بھیانک تصویر کے طور پر پیش کیا ہے لیکن بقول رُبَّ ضَارَّةٍ نَافِعَةٌ (ہر ضرر میں کوئی نفع کا پہلو ہوتا ہے)۔ یہ دونوں واقعات اسلام کی تشہیر کا باعث ہوئے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان منفی پہلوؤں کے بالمقابل اسلام کے مثبت پہلو کو اجاگر کیا جائے۔

یہ افسوس کا مقام ہے کہ بعض عاقبت نا اندیش افراد دعوت کے اس عظیم موقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسلام کو بطور ایک سیاسی پارٹی یا مسلمانوں کو بطور ایک militant group کے پیش کر رہے ہیں جس سے مقامی آبادی میں مسلمانوں کے خلاف اشتعال کا پھیلنا لازمی ہے۔ اول الذکر اسلامی پارٹی بنا کر برطانیہ کی قدیم ترین سیاسی پارٹیوں کے بالمقابل کھڑے ہو کر لاحاصل سعی کر رہے ہیں اور مؤخر الذکر افراد مسلمانوں کی علیحدہ پارلیمنٹ کے قیام کے عنوان سے (state within a state) کا سا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو کسی بھی صورت میں مسلمانوں کے لیے مفید نہیں، یعنی یہ فکر ان دنوں بڑی تیزی سے پھیلائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی اپنی پارلیمنٹ ہونی چاہیے جو مسلمانوں کے منتخب افراد پر مشتمل ہو، وہ اپنے لیے رہنمائی تلاش کریں۔ انگریزوں نے اس کا فوری نوٹس لیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ریاست کے اندر ایک اور ریاست قائم ہو جائے۔ تو اس طریقے سے مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا ہو رہا ہے۔

آج ایسے مبلغین اور علماء کی ضرورت ہے جو واضح الفاظ میں کہہ سکیں:

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝﴾

”آپ کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو

رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔'' (1)

اور ضرورت ہے کہ وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں اس ہدایت پر کار فرما ہوں:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

''(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔'' (2)

میں طوالت مضمون پر معذرت خواہ ہوں۔ آخر میں ایک مرتبہ قابل احترام استاد جناب محمد اسحق قریشی اور معزز دوست جناب زاہد اشرف اور آپ سب حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے بڑے صبر و ثبات کے ساتھ یہ غیر ادبی اور غیر فکری گفتگو سنی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اگر یہ گفتگو کسی بھی درجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو تو اسے میرے لیے باعث اجر بنائے اور آپ کو اس کی سماعت کا اجر اور اس کے مندرجات پر غور و فکر کا حوصلہ عطا فرمائے۔

﴿الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَاهُمُ اللَّهُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

''جو غور سے بات سنتے ہیں، اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت دی، اور یہی لوگ عقل والے ہیں۔'' (3)

(1) آل عمران 3:64. (2) النحل 16:125. (3) الزمر 39:18.

مقالہ: 3

سورۂ بنی اسرائیل کی روشنی میں اُمت مسلمہ کا عروج و زوال ●

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ○ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ○ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۣ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ۭ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْۗءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ○ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ○﴾

”اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں فیصلہ سنا دیا تھا کہ تم زمین میں دوبار ضرور فساد کرو گے اور ضرور بہت بڑی سرکشی کرو گے۔ پھر جب

● قارئین محترم! مذکورہ بالا موضوع پر یہ تحریر دراصل اُس خطاب پر مشتمل ہے جو کچھ عرصہ قبل ممتاز دینی ادارے جامعہ تعلیمات اسلامیہ، فیصل آباد میں قرآن سوسائٹی لندن کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر صہیب حسن نے شرکاء سے فرمایا۔ یہ خطاب اُن کے دورہ القدس پر مبنی تاثرات پر محیط تھا جس میں انھوں نے یہودیوں کی پوری تاریخ سمو دی ہے۔ ٹیپ ریکارڈر سے اس تقریر کو من وعن نقل کیا گیا جسے الفاظ کی کمی بیشی سے کچھ اس انداز میں ترتیب دیا گیا کہ اس میں تقریر کی لذت بھی برقرار رہے اور تحریر کا حسن بھی۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے مکمل طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

دونوں میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت جنگجو بندے مسلط کر دیے، چنانچہ وہ (فساد انگیزی کے لیے) شہروں کے درمیان پھیل گئے اور یہ وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔ پھر ہم نے تمھیں دوبارہ ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مال اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور ہم نے تمھیں تعداد میں زیادہ کر دیا۔ اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی نفسوں کے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو (وہ بھی) انھی کے لیے ہوگی، پھر جب دوسرا وعدہ آیا (تو ایک اور قوم تم پر غالب آئی) تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں جیسے پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے، اور تاکہ وہ جس پر غلبہ پائیں اسے بری طرح تباہ کر دیں۔ قریب ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر دوبارہ (سرکشی) کرو گے تو ہم بھی دوبارہ (سزا) دیں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنایا ہے۔"[1]

برادران کرام! میرے معزز دوستو! علمائے کرام! بڑے عرصے کے بعد ایک دفعہ پھر مجھے یہاں آنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ میں نے اس جامعہ کے آغاز کو بھی دیکھا ہے اور اب جبکہ وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے، الحمد للہ میں اس جامعہ میں پھر ایک دفعہ آیا ہوں۔ 10 سال پہلے بھی یہاں خطاب ہوا تھا۔ غالباً اس وقت یہ ہال یہاں موجود نہیں تھا۔ یہ ایک نیا اضافہ ہے۔ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس ہال کو زینت بنائے، اس جامعہ کے لیے اور ان تمام مہمانوں کے لیے جو یہاں آ کر خطاب کریں۔

[1] بني إسرائيل 17:4-8.

آج کے خطاب کے لیے میں نے موضوع دیا تھا: ''امت مسلمہ کا عروج وزوال'' سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات کی روشنی میں جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں۔ میں اس موضوع پر کئی دفعہ خطاب کر چکا ہوں۔ یہاں بھی، انگلینڈ میں بھی، امریکہ میں بھی اور اس موضوع پر روز بہ روز میری معلومات میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور اب جو آخری اضافہ ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ سرزمین جس کا ذکر ان آیات میں ہے، اس کے بارے میں شروع کی آیت ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾

''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اردگرد کو ہم نے برکت دی ہے، تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''[1]

وہ سرزمین جس کی طرف رسول اللہ ﷺ ایک رات کے لیے تشریف لے گئے، اس سرزمین کی زیارت کا مجھے بھی شرف حاصل ہوگیا ہے۔ رمضان سے پہلے میں نے مسجد اقصیٰ میں ایک جمعہ پڑھا ہے اور تین دن میں بیت المقدس میں رہا ہوں اور میں نے وہاں کے حالات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس وجہ سے اب میں جو باتیں آپ کے سامنے بیان کروں گا، اس میں میرا ذاتی مشاہدہ بھی شامل ہے۔

ان میں ایک پہلی بات کہ جس کا تذکرہ پہلی آیت سے متعلق ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت المقدس گئے، پھر واپس آئے تو کفار نے آپ ﷺ کو جھٹلایا

[1] بنی إسرائیل 1:17.

اور ایک آدمی کو بلایا جو ایک بار بیت المقدس جا چکا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ آپ بتائیں بیت المقدس کا وصف کیا ہے؟ تاکہ وہ شخص جو پہلے بیت المقدس جا چکا ہے وہ آپ کی تصدیق کرے یا تکذیب کرے۔ نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں بیت المقدس گیا تھا تو اس لیے نہیں گیا تھا کہ وہاں کی کھڑکیاں اور دروازے گنوں، اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ کتنی کھڑکیاں تھیں؟ کتنے دروازے تھے؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو میری آنکھوں کے سامنے کر دیا تو میں دیکھتا جاتا تھا اور اس کا وصف بیان کرتا جاتا تھا۔ اور اس شخص نے پھر میرا وصف سننے کے بعد کہا: آپ نے یقیناً بیت المقدس کی زیارت کی ہے۔ نبی ﷺ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔[1] اب آپ ﷺ کی بیت المقدس آمد کے بارے میں ایک خارجی شہادت موجود ہے، جیسے کہ ابن کثیر نے ان آیات کے ضمن میں ابونعیم اصبہانی کی کتاب دلائل النبوۃ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ جب نبی ﷺ نے بادشاہوں کو اسلام لانے کے لیے خطوط لکھے، ان میں سے ایک خط اس وقت کی رومن سلطنت کے بادشاہ ہرقل کو بھی لکھا تھا۔ قیصر ہرقل اس وقت بیت المقدس آیا تھا جب اسے نبی ﷺ کا خط ملا، چنانچہ اس نے کہا: کیا کوئی شخص ہے جو عرب سے آیا ہوا جس سے میں، محمد ﷺ کے بارے میں بات کر سکوں؟ ابوسفیان وہاں موجود تھا، اُسے بلایا گیا۔ ابوسفیان سے ہرقل نے بہتیرے سوال کیے۔ آپ کی تعلیمات کیا ہیں؟ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے کہ گھٹ رہی ہے؟ نبی ﷺ کا اپنا کردار کیا ہے؟ بے شمار سوالات کیے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ کیا نبی ﷺ نے کبھی جھوٹ بولا؟ ابوسفیان جو پوری کوشش میں تھا

[1] السنن الکبریٰ للنسائي: 377/6، و مسند أحمد: 309/1، و دلائل النبوة للبیهقي: 396/2.

کہ کسی طرح کوئی ایک بات شک وشبہ کی کہہ دے، وہ نہیں کہہ سکا۔ جب ہرقل نے یہ سوال کیا تو ابوسفیان نے کہا کہ نبی (ﷺ) دعویٰ کرتے ہیں کہ ایک رات یہاں (بیت المقدس میں) آئے تھے تو اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کہاں تک صحیح ہے؟ ابوسفیان نے اس طرح سے ہرقل کے ذہن میں شک ڈالنے کی کوشش کی۔ ابوسفیان تو چلا گیا۔ بیت المقدس کا سب سے بڑا لاٹ پادری جسے آرک بشپ کہا جاتا ہے، وہ کھڑا ہوا اور اس نے ہرقل سے کہا: میں ایک رات کا واقعہ آپ کو بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہر رات کو میں کنیسہ کا دروازہ بند کر کے جایا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن دروازہ بالکل جام ہوگیا، بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اس دروازے کو کیا ہوگیا، پھر میں نے سوچا کہ اچھا یہ دروازہ کھلا رہنے دیں، صبح میں آؤں گا اور اس دروازے کو ٹھیک کریں گے۔ وہ کہتا ہے کہ صبح جب میں آیا اور اس ارادے سے آیا کہ ہم اس دروازے کو ٹھیک کریں گے۔ میں نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ بند ہوگیا۔ اب میں حیران ہوا کہ یہ دروازہ ساری رات کھلا رہا ہے۔ رات بند نہیں ہو رہا تھا، اس وقت آرام سے بند ہوگیا ہے۔ یہ خاص طور پر کھلا رہا ہے، یقیناً اسے کسی نبی کے لیے کھلا رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات ہوئی ہے اور یہ کوئی نبی ہی ہوں گے جو اس رات آئے ہوں گے جیسے کہ ابوسفیان نے کہا کہ نبی ﷺ نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ وہ یہاں آئے تھے۔ اس (پادری) نے یہ بھی کہا کہ میں نے چرچ کے دروازے کے کنڈے پر ایک رسّی باندھنے کے آثار دیکھے ہیں۔ وہ رسّی جس سے رسول اللہ ﷺ نے براق کو باندھا تھا۔ ●

● تفسیر ابن کثیر: 45,44/5، والدر المنثور: 220/6، دلائل النبوۃ میں یہ واقعہ نہیں مل سکا۔

اب یہ جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اس کی روشنی میں مسجد اقصیٰ کے احاطے میں کسی عمارت کا ہونا انتہائی ضروری تھا، اس زمانے میں، کسی چرچ کی عمارت کا۔ وہ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ مسجد جسے یعقوب علیہ السلام نے بنایا تھا، پھر سلیمان علیہ السلام نے اسے ہیکل سلیمانی کی شکل دی تھی، وہ ہیکل تو (586 ق م میں) بخت نصر نے مسمار کر دیا تھا۔ دوبارہ بنا تھا لیکن وہ بھی 70ء رومیوں نے مسمار کر دیا تھا، لہٰذا مسجد اقصیٰ کے احاطے میں کوئی عمارت وہاں مسجد کے نام سے نہیں تھی۔ لیکن کوئی عمارت تھی چاہے وہ چرچ کی عمارت ہو، کنیسہ کی عمارت ہو، کیسی بھی عمارت تھی بہر حال عمارت تھی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوئے اور آپ نے وہاں انبیاء کو نماز پڑھائی اور اس کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے اور پھر وہیں سے آپ کا معراج ہوا۔ قبۃ الصخرۃ (گنبدِ صخرہ) سے۔ اور بیہقی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا تھا جیسے کہ پادری نے کہا۔

میں اس کی جستجو میں رہا ہوں کہ آیا تاریخ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں کسی زمانے میں کوئی چرچ تھا، کوئی کنیسہ کی عمارت تھی۔ میں نے اپنے اس سفرِ قدس کے دوران میں مفتی عکرمہ صبری، جو کہ مفتی قدس ہیں، ان سے بھی پوچھا کہ آپ بتائیے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کہاں پڑھی تھی؟ اس وقت تو یہاں کوئی مسجد نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ ایک انوکھا سوال تھا۔ یہ جو موجودہ مسجد ہے اس کی تعمیر کا آغاز خلیفہ عبدالملک نے کیا تھا اور ولید بن عبدالملک نے اس کی تکمیل کی تھی۔ عبدالملک ہی نے گنبدِ صخرہ کی عمارت تیار کی تھی، اس سے پہلے تو وہاں کوئی مسجد نہیں تھی۔ ٹمپل آف سلیمان مسمار ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو کہاں باندھا تھا؟ کہنے لگے: وہ جو دیوار

ہے، مغربی دیوار، مسجد اقصیٰ کی مغربی دیوار، اس کے ساتھ باندھا تھا اور اس جانب سے پھر آپ تشریف لائے ہوں گے۔ لیکن کیا یہاں کوئی عمارت تھی؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تو یہ بات تحقیق طلب ہے۔ لوگ اس بات کی تحقیق کریں اور پتہ چلانے کی کوشش کریں کہ آیا وہاں کسی زمانے میں چھوٹا موٹا چرچ تھا یا نہیں۔ میری معلومات کے مطابق، جو گائیڈ بک میں اپنے ساتھ لے کر گیا تھا، انگریزی میں بہت ہی ضخیم گائیڈ بک تھی، اس میں جہاں مسجد اقصیٰ کا تذکرہ ہے، وہاں چند سطریں اس حوالے سے موجود ہیں، اور اس میں اس زمانے کا بھی تعین ہے اور یہ زمانہ وہی ہے جبکہ نبی ﷺ مکے میں تھے اور وہیں سے بیت المقدس آئے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہاں کسی کنیسہ کے آثار ملے ہیں، یعنی چند پتھر ایسے ملے ہیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہاں ایک کنیسہ تھا۔ بہر صورت یہ موضوع بہت ہی تحقیق طلب ہے اور اگر یہ بات ثابت ہوجائے تو پھر یہ عقدہ حل ہوجاتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کس جگہ سے وہاں داخل ہوئے۔

اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ نبی ﷺ کی حدیث ہے:

«لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِي مَا أَتٰى عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتٰى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ......»

''اس امت پر وہی واقعات پیش آئیں گے جو کہ بنی اسرائیل پر پیش آئے تھے۔ (اور اتنی شدید مشابہت ہوگی کہ جس طرح نیزے کا ایک پھل دوسرے پھل کے مشابہ ہو) جیسے کہ جوتے کا ایک پیر دوسرے پیر سے مشابہ ہوتا ہے۔

اسی طریقے سے وہ واقعات جو بنی اسرائیل میں پیش آئے، وہی اس امت میں پیش آئیں گے۔ یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی بدبخت اپنی ماں سے بدکاری کرتا تھا تو اس امت میں بھی ایسا بدبخت پیدا ہوگا جو اپنی ماں سے بدکاری کرے گا۔''[1]

اب آپ دیکھیے کہ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ یا ٹمپل آف سلیمان یا ہیکل سلیمانی کو دو دفعہ یہودیوں سے چھینا گیا اور ہماری تاریخ میں بھی مسجد اقصیٰ کو دو دفعہ ہم سے چھینا گیا۔ پہلے 1091ء میں صلیبیوں نے چھینا تھا، 88 سال کے لیے۔ اب 1967ء کی جنگ کے بعد سے مسجد اقصیٰ اب تک یہودیوں کے ہاتھ میں ہے، یعنی مسلمانوں کے دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔

مسجد اقصیٰ یروشلم کے قدیم شہر میں واقع ہے جس قدیم شہر کے چاروں طرف فصیل ہے۔ فصیل کے آٹھ دروازے کھلے ہیں، تین دروازے بند ہیں۔ ان تین بند دروازوں میں سے ایک کا نام گولڈن گیٹ ہے اور اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے اور عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تب یہ دروازہ کھولا جائے گا۔ ہم بابِ دمشق سے مسجد اقصیٰ جایا کرتے تھے۔ یہ شہر بالکل قدیم شہر ہے، جیسے لاہور کی پرانی گلیاں یا راولپنڈی کی پرانی گلیاں۔ اس طریقے سے وہ گلیوں والا شہر ہے۔ لیکن اس کی فصیل ابھی باقی ہے اور اس فصیل کے دروازے بھی باقی ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ اب دروازے بند نہیں ہوتے۔ کسی زمانے میں شام کو بند ہو جایا کرتے تھے، جو آدمی باہر ہے باہر رہ گیا۔ تو ان دروازوں سے ہوتے ہوئے آپ مسجد تک

[1] جامع الترمذي، حديث:2641، والمصنف لابن أبي شيبة:481/7.

پہنچتے ہیں۔ مسجد کا احاطہ بہت بڑا ہے۔ اس میں شروع میں مسجد اقصیٰ ہے جس کی مشابہت ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد نبوی سے ہے۔ مسجد نبوی کے قدیم حصے میں سے جو ترکی حصہ ہے، بالکل ویسے ہی مسجد اقصیٰ کو سمجھ لیں۔ احاطے کے بیچ میں گنبد صخرہ ہے، اسے بھی مسجد کہا جاتا ہے۔ مسجد صخرہ کے پیچھے کچھ باغات ہیں زیتون کے اور کچھ دفاتر ہیں۔ اگر اس سارے احاطے میں لوگ نماز پڑھیں تو ڈھائی لاکھ مسلمان وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کے اندر تو صرف پانچ ہزار کی گنجائش ہے لیکن سارے میدانوں میں اور دوسرے ہالوں میں ڈھائی لاکھ نمازی آسکتے ہیں، جو کہ آیا کرتے تھے۔ اب تو اسرائیلی اپنی بندوقوں کے ساتھ باہر کھڑے ہو جایا کرتے ہیں اور میں نے یہ خود مشاہدہ کیا کہ جو لوگ چالیس سال سے کم عمر کے تھے، ان لوگوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چالیس سال سے اوپر کے بوڑھے حضرات کو داخلے کی اجازت دی گئی۔ اس وجہ سے مسجد کا اندرونی حصہ بھرا ہوا تھا اور صحن میں کہیں کہیں لوگ درختوں کے سائے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی طریقے سے گنبدِ صخرہ کی جو مسجد ہے، اس میں خواتین کے لیے جگہ مخصوص ہے۔ خواتین وہاں نماز پڑھ رہی تھیں۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کے کنٹرول میں ہونے کے باعث وہ جسے چاہتے ہیں داخل ہونے دیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں روک دیتے ہیں۔ میں نے انھیں دیکھا کہ وہ اپنے بوٹوں سمیت مسجد اقصیٰ کے صحن میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ایک فصیل کے دروازے سے چڑھتے ہیں اور پھر دوسرے دروازے کی طرف چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر بہت ہی افسوس ہوتا ہے کہ ہماری اس مسجد میں یہودی اس طریقے سے چھائے ہوئے ہیں۔

مسجد کی مغربی دیوار اس پرانے شہر کی طرف ہے جو سارے کا سارا مسلمانوں کا

ہے۔ اسی دیوار میں مسجد اقصیٰ کے اکثر دروازے ہیں جن میں سے ایک دروازے سے ہم داخل ہوئے، اس کے بعد ایک اور دروازہ ہے، اس میں سے گزرے۔ اسی ویسٹ زون کے کنارے پر لکھا ہوا ہے: ''مسجد البراق'' یعنی براق والی مسجد۔ چند سیڑھیاں آپ نیچے جاتے ہیں، اس کے بعد ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ وہاں لوگ نماز پڑھ لیتے ہیں، یعنی تبرکاً نماز پڑھتے ہیں۔ اس کو نام دیا گیا ہے کس کا؟ مسجد براق کا۔ وہ اس لیے کہ نبی ﷺ اس دیوار سے داخل ہوئے تھے۔ وہاں کوئی دروازہ ہوگا اور وہیں انھوں نے اپنی سواری کو باندھا ہوگا۔ بہر حال لوگوں کے اندر چونکہ توہمات ہوتے ہیں، جبھی تو وہاں ایک کنڈے سے برکت حاصل کرتے ہیں، اس پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ کنڈا ہے جس سے نبی ﷺ نے براق کو باندھا تھا۔ تو یہ جو مغربی دیوار ہے، اندر سے مسجد اقصیٰ ہے اور باہر سے یہ دیوار گریہ بن جاتی ہے یہودیوں کے لیے۔ یہاں یہودی کھڑے ہو کر سر ہلاتے ہیں۔ اور جس طریقے سے آپ کعبہ کے سامنے، ملتزم کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں، روتے ہیں تو اسی طریقے سے یہ لوگ وہاں کھڑے ہوتے ہیں، دعائیں کرتے ہیں لیکن سر بہت زیادہ ہلاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا شاید، مختلف پروگرامز میں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر اپنی درخواست لکھ کر پتھروں کی درزوں کے اندر گھسا دیتے ہیں تاکہ یہ درخواستیں اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائیں۔ بحیثیت ٹورسٹ ہم بھی دیوار گریہ تک جا سکتے تھے۔ اس وجہ سے ہم دیوار گریہ تک بھی گئے اور اس دیوار کو بھی دیکھا۔ یہاں انھوں نے مردوں کے لیے علیحدہ جگہ بنا رکھی ہے اور عورتوں کے لیے علیحدہ سے جگہ مخصوص ہے۔ لیکن خواتین میں ماڈرن خواتین بھی تھیں جو بالکل مغربی

لباس میں ملبوس تھیں، یعنی نیم برہنہ۔ وہ چونکہ ایک مذہبی روایت کی وجہ سے وہاں آتی ہیں، اس وجہ سے انھوں نے ایک ٹوکری کے اندر سکارف رکھے ہوتے ہیں۔ وہاں دوپٹہ اوڑھ لیتی ہیں، اس کے بعد وہ دعائیں کرتی ہیں اور جاتے وقت دوپٹے کو یوں پھینکا اور باہر چلی گئیں۔

مجھے یاد آیا کہ فلسطین میں بھی بہتیری مسجدیں ایسی ہیں جن میں ٹوپیاں رکھی ہوتی ہیں ڈبے کے اندر، تنکوں کی ٹوپیاں۔ کہتے ہیں کہ یہ ٹوپی آپ پہن لیں نماز پڑھتے وقت، جاتے وقت اس ٹوپی کو پھینک جائیں۔

مسجد اقصیٰ پر قابض یہودیوں کے بارے میں قرآن مجید میں ذکر ہے۔ دو مرتبہ یہ زمین کے اندر فساد کریں گے، دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کا کوڑا ان کی پیٹھ کے اوپر برسے گا۔ یہ ہے اصل مضمون: ﴿وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا﴾ ●

بنی اسرائیل کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ ہزار سال قبل جزیرہ نمائے عرب سے، جسے آج کل ہم سعودی عرب یمن وغیرہ کہتے ہیں، کچھ لوگ قحط سالی کی بنا پر ہجرت کر گئے۔ کچھ لوگ عراق گئے تھے ان میں سے ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں پیدا ہوئے، جو بالآخر ہجرت کرتے کرتے فلسطین پہنچ گئے۔ اور جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین پہنچے، اس وقت یروشلم (Jerusalem) کے نام سے ایک شہر وہاں آباد تھا اور وہاں جو قوم آباد تھی، اس کو یبوسی کہا جاتا ہے۔ ان کے بادشاہ کا نام ملیک صادق تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوش آمدید کہا، لہٰذا یہودیوں

● بنی اسرائیل 4:17

کا یہ کہنا کہ ہم نے یروشلم کو آباد کیا ہے اور یہ ہمارا شہر ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ شہر یہودیوں سے بہت پہلے آباد تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب وہاں آئے تو اس شہر کو آپ نے دیکھا۔ ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے اسحاق علیہ السلام اور پھر پوتے یعقوب علیہ السلام نبی مبعوث ہوئے جن کا نام اسرائیل ہے اور جن کے بارہ بیٹے ہوئے۔ ان میں سے ایک بیٹے یوسف علیہ السلام ہیں جن کی ساری کہانی آپ جانتے ہیں کہ وہ کس طریقے سے مصر پہنچے، مصر کے وزیر اعظم بنے اور اس کے بعد انھوں نے تمام اہل خانہ کو، یعقوب علیہ السلام کو، اپنی ماں کو، جو کہ ان کی خالہ یعنی سوتیلی ماں تھیں، بھائیوں اور ان کے بچوں سب کو مصر بلا لیا۔ ان کی کل تعداد ستر تھی جس وقت وہ فلسطین یا کنعان سے مصر پہنچے۔ اس کے بعد یہ بنی اسرائیل مصر میں 430 سال رہے۔ 430 سال کے بعد انھیں موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکال کر صحرائے سینا لے آئے۔ وہ سارے کا سارا قصہ آپ کے علم میں ہے۔ صحرائے سینا میں آپ نے اسرائیلیوں سے کہا: جہاد کرو اور فلسطین کا شہر جس کا مشہور نام ہے جیریکو (Jericho)، عربی میں اسے اریحا کہا جاتا ہے، فتح کرو۔ اس کے جواب میں یہودیوں نے کہا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۝﴾

”(چنانچہ) تو اور تیرا رب جاؤ، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔“

اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ جائیں، آپ جہاد کریں، اپنے اللہ کو بھی ساتھ لے جائیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو یہاں بیٹھ کے تماشا دیکھیں گے۔ جیسے کہ آج کل ہم لوگ کہہ دیتے ہیں کہ بھئی! آپ لوگ جہاد کریں، ہم تو یہاں بیٹھ کے ٹی وی دیکھیں گے، واچ کریں گے۔ اسی طرح انھوں نے کہا: جائیے! آپ جہاد کریں ہم

المآئدۃ 5:24

یہاں بیٹھ کے دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر سزا مسلط کردی۔ 40 سال تک صحرائے سینا کے دشتِ تیہ میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ وہ نسل جو غلامی کی نسل تھی، جو مصر سے آئی تھی وہ ساری کی ساری نسل صحرائے سینا کے اندر کھپ جائے اور اس کے بعد جو نئی نسل پیدا ہو، آزادی کی فضا میں، وہ فلسطین میں جہاد کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہارون علیہ السلام کوہ ہور پر اور موسیٰ علیہ السلام کوہ نبو (اردن) پر فوت ہوگئے اور موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے اریحا پر حملہ کیا۔ اور اس طریقے سے یہ پہلا شہر تھا جسے انھوں نے فتح کیا۔ اس کے بعد ان میں ایک مشہور بادشاہ طالوت (Saul) گزرا۔ طالوت کے لشکر میں ایک نوجوان داود تھے اور داود بہادری کی بنا پر بادشاہ بن گئے اور نبی مبعوث ہو کر داود علیہ السلام کہلائے۔ یہ بادشاہ بھی تھے اور پیغمبر بھی۔ بنی اسرائیل کے سب سے پہلے بادشاہ بھی ہیں اور پیغمبر بھی ہیں اور ان کے بیٹے سلیمان علیہ السلام بھی بادشاہت اور نبوت سے سرفراز ہوئے۔ ان دونوں کی مدت حکومت 70 سال ہے۔

سلیمان علیہ السلام نے ہیکل سلیمانی بنایا۔ یہ وہ مسجد ہے جس کی ابتدا یعقوب علیہ السلام نے کی تھی۔ سلیمان علیہ السلام نے اس کی جگہ ایک پورا معبد کھڑا کیا جسے ہم ہیکل سلیمانی کے نام سے جانتے ہیں اور یہ ہیکل سلیمانی یہودیوں کی مقدس ترین عبادت گاہ تھی۔ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کا بیٹا رحبعام بادشاہ بنا۔ اس کے زمانے میں یہ سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ جنوبی سلطنت جس کا دارالخلافہ یروشلم تھا، اسے یہودیہ کہا جاتا تھا۔ اور شمالی سلطنت جسے اسرائیل کہا جاتا تھا، اس کا دارالسلطنت شکیم (Shechem) تھا جسے آج کل نابلس کہا جاتا ہے۔ جنوبی سلطنت یعقوب علیہ السلام کے دو بیٹوں یوسف علیہ السلام اور

بنیامین کی اولاد کے پاس تھی۔ باقی دس بیٹوں کی اولاد کی سلطنتِ اسرائیل 298 سال قائم رہی۔ یہودیہ والی سلطنت 664 سال باقی رہی۔

چھ سات سو سال کے بعد جب ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، بتوں کی پرستش شروع کردی، دین کو چھوڑ دیا تو یہ ان کا پہلا فساد تھا۔ اور پہلے فساد کی سزا انھیں اس شکل میں ملی کہ عراق کے بادشاہ بخت نصر نے 586 ق م میں فلسطین پر حملہ کیا اور ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا۔ وہ ایک لاکھ یہودیوں کو گرفتار کر کے عراق لے گیا۔ یہ ان کی 70 سال کی اسیری کا زمانہ ہے جس میں ایک مشہور پیغمبر عزیر علیہ السلام ہوئے ہیں جنھیں بائبل میں عذرا (Ezra) کہا جاتا ہے اور بعض یہودیوں نے کہا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ کیوں کہا؟ اس لیے کہ تورات ضائع ہو چکی تھی۔ عزیر علیہ السلام نے اپنے حافظے سے دوبارہ اسے قلمبند کرایا۔ اس وجہ سے انھیں "عزیر ابن اللہ" کہا گیا، یعنی اس بات کا دعویٰ کیا گیا۔

ان لوگوں نے اپنی بستی فرات کے کنارے بسائی، بستی کا نام تل ابیب رکھا۔ اب یہودیوں نے اسرائیل قائم کیا تو ساحلِ بحیرۂ روم پر اپنی پہلی بستی کا نام تل ابیب ہی رکھا جو کہ یافا کے بالکل سامنے ہے۔ یہودیوں کو فارس کے بادشاہ سائرس نے واپس آنے کی اجازت دی جسے فارسی میں کوروش کبیر اور عربی میں کیخسرو کہا جاتا ہے۔ اور مولانا ابوالکلام کی تحقیق کے مطابق وہی ذوالقرنین تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس کے سارے اوصاف سائرس کے اوپر منطبق ہوتے ہیں۔ سائرس نے عراق پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ اس کے بعد فلسطین پر حملہ کیا وہاں بھی فتح حاصل کی۔ وہ تمام یہودیوں کو عزت اور اکرام کے ساتھ واپس فلسطین لے آیا۔ اس کا تذکرہ قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَٰكُم بِأَمْوَٰلٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا﴾

''پھر ہم نے تمھیں دوبارہ ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مال اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور ہم نے تمھیں تعداد میں زیادہ کر دیا۔'' [1]

﴿إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾

''اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی نفس کے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو (وہ بھی) اسی کے لیے ہوگی۔'' [2]

اس طرح یہودیوں کو ایک اور موقع دیا گیا۔ وہ دوبارہ فلسطین کے اندر آباد ہوگئے۔ دوبارہ انھوں نے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی لیکن چند صدیاں گزر جانے کے بعد وہی پرانی عادتیں عود کر آئیں اور انھی یہودیوں نے زکریا علیہ السلام کو اور ان کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کیا، جو کہ نبی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کی سازش کی۔ عیسائیوں کے نزدیک تو وہ مصلوب ہوگئے، یعنی انھیں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ وہ تو ہم مسلمان قرآن کی رُو سے کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ زندہ آسمانوں پر اُٹھا لیا گیا۔ بہرصورت یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کروانے کی سازش کی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے یہودیوں کو ایک موقع اور ملا، یعنی فارسیوں کے بعد پھر یونانی آئے اور ان کی حکومت رہی۔ یونانیوں کے بعد رومیوں کی حکومت شروع ہوگئی اور انھی کے زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ اس زمانے میں یہودیوں کی 93 سال حکومت رہی ہے جسے مکابین کہتے ہیں۔ مکابی ایک رِبّی (Rabbi) تھا

[1] بنی إسرائیل 17:6۔ [2] بنی إسرائیل 17:7۔

جس کے پانچ بیٹے تھے۔ انھوں نے مل کر بغاوت کی تھی۔ 93 سال تک فلسطین پر حکومت کی ہے، انھوں نے جو سکہ جاری کیا تھا اس کا نام شیکل تھا۔ اور آج اسرائیل کا سکہ کیا ہے؟ شیکل ہے، یعنی اس سکے کو دوبارہ رواج دیا گیا ہے۔

بہر صورت یہود نے دوبارہ بتوں کی پرستش کی، انبیاء کو قتل کیا۔ اس وجہ سے یہ دوسرا فساد تھا۔ دوسرے فساد کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوْٓءُوْا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا﴾

”پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ہم نے تم پر اور بندے بھیجے) تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں جیسے پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے اور تاکہ وہ جس پر غلبہ پائیں اسے بری طرح تباہ کر دیں۔“ [1]

70 عیسوی میں رومی جرنیل ٹائٹس بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اور اس مرتبہ دوسرا ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور اس کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی گئی۔

یہ واقعہ 70 عیسوی کے اندر پیش آیا۔ یہودی پھر بھی یہاں موجود تھے لیکن 35-132ء کی بغاوت میں بکثرت یہودی مارے گئے یا غلام بنا لیے گئے اور رومی بادشاہ ہیڈرین نے جتنے بھی یہودی باقی رہ گئے تھے، ان کو بھی بیت المقدس سے نکال دیا۔ اس طرح بیت المقدس میں کوئی یہودی باقی نہیں رہا۔

637 عیسوی میں جو کہ 16 ہجری ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیت المقدس

[1] بني إسرائيل 17:7.

فتح ہوا۔ یوں فلسطین کا رومی عہد تقریباً 667 سال رہا۔ اس کے بعد اب یہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس آئے تب وہاں کے آرچ بشپ صفرو ینوس کے ساتھ معاہدہ طے پایا جسے العهد العمري کہا جاتا ہے۔ بیت المقدس یا مسجد اقصیٰ سے ذرا سے فاصلے پر عیسائیوں کا ایک بہت بڑا چرچ ہے جس کا نام كنيسة القيامة ہے جسے ''قبر مقدس کا گرجا'' (Holy Sepulchre) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اُن کے اعتقاد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی تھی۔ ہم نے یہ چرچ بھی دیکھا ہے جہاں سے عیسائیوں کے بقول عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا گیا جبکہ حقیقت میں ان کو وہاں سے نہیں اُٹھایا گیا تھا۔ ان کو تو اصل میں جبلِ زیتون سے اٹھایا گیا تھا جو کہ اس کے قریب ہی ہے۔

صفرو ینوس نے جس وقت بیت المقدس کی چابیاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیں، اس وقت وہ رو پڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھے کہ چونکہ انھیں شکست ہوئی اور ہمیں فتح ہوئی ہے، اس وجہ سے رو رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے دلاسا دیا اور کہا: یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اليوم لنا و غدًا لك...... یہ تو ہوتا رہتا ہے۔ آج ہمارا دن ہے، کل تمھارا دن ہے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ صفرو ینوس نے کہا: میں اس لیے نہیں رو رہا کہ ہماری حکومت ختم ہوگئی ہے۔ میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ ہماری حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہے۔ وہ اس لیے کہ اس سے پہلے بے شمار حکمران آئے اور آ کے چلے گئے۔ لیکن میں نے مسلمانوں کو دیکھا ہے کہ ان سے بڑھ کر عدل کرنے والا کوئی نہیں۔ ظلم کی حکومت ایک دن ہوتی ہے لیکن عدل کی حکومت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے اور اسی وجہ سے رو رہا ہوں کہ ہماری حکومت ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی، اب

یہاں مسلمانوں کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔

اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟ وہ اس لیے کہ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ جابیہ، جو کہ فلسطین کے قریب ایک مقام ہے، سے بیت المقدس آئے تھے، وہ اونٹ پر سوار تھے۔ اس اونٹ پر ان کا غلام اور وہ باری باری سوار ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، دوسری دفعہ غلام۔ تو جس وقت یہ بیت المقدس پہنچے، غلام کی باری تھی، وہ اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا: خلیفۃ المسلمین! آپ بیٹھیے، اس لیے کہ مجھے بہت ہی بُرا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بیت المقدس میں داخل ہوں اور میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا ہوں اور آپ اس کی نکیل پکڑے ہوئے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں، تمھاری باری ہے، تم ہی بیٹھو۔ جب عیسائیوں نے یہ منظر دیکھا کہ اس وقت کا سب سے بڑا طاقت ور حکمران اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے ہے اور اس کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے تو وہ لوگ حقیقتاً سجدے میں گر پڑے اور کہا: ایسا منظر آج تک ہم نے نہیں دیکھا۔ اس سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ کہہ اٹھے: مسلمانوں کی حکومت عدل کی حکومت ہے، ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔

نماز کا وقت آ گیا، صفرونیوس نے کہا: آپ یہاں چرچ میں نماز پڑھ لیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں، اس لیے کہ اگر میں نے بحیثیت خلیفہ یہاں نماز پڑھ لی، بعد میں مسلمان اس جگہ کے بارے میں کہیں گے کہ یہ ہماری جگہ ہے۔ چرچ کو ڈھا کے مسجد بنا دیں گے، اس لیے بہتر ہے کہ میں یہاں نماز نہ پڑھوں۔ چنانچہ آپ باہر گئے اور ذرا فاصلے پر میدان میں نماز پڑھ لی۔ جس جگہ آپ نے نماز پڑھی تھی وہاں پر اب ایک چھوٹی سی مسجد قائم ہے جسے مسجد عمر رضی اللہ عنہ کہا جاتا ہے۔ اس مسجد عمر رضی اللہ عنہ

کے صحن میں دیوار کے اوپر وہ معاہدہ، عہد نامہ جو آپ نے صفرونیوس سے کیا تھا اور جو العهد العمري کے نام سے معروف ہے، وہ عربی زبان میں آویزاں ہے۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد اقصیٰ کے احاطے میں تشریف لائے۔ گنبد صخرہ وہ جگہ ہے جہاں سے نبی ﷺ کو معراج ہوا تھا، کسی زمانے میں وہاں پر ہیکل سلیمانی تھا۔ چونکہ ہیکل سلیمانی یہودیوں کا تھا، اس لیے عیسائیوں نے یہودیوں کی مخالفت میں اس جگہ کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں بدل دیا تھا، یعنی جتنا بھی کوڑا ہوتا تھا وہاں پھینک کے چلے جایا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ سارے کا سارا کوڑا صاف کروایا اور وہاں پر ایک چھپر سا ڈلوایا، پھر نماز پڑھی اور اس طریقے سے وہاں ایک مسجد کی ابتدا کر دی۔

آپ نے احادیث کی کتابوں میں، سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ پڑھا ہوگا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار سے پوچھا، کعب الاحبار یہودی تھے، بعد میں مسلمان ہوئے تھے، ہم نماز کہاں پڑھیں؟ کعب الاحبار نے کہا: یہ جو صخرہ ہے، آپ اس کے پیچھے (صخرہ کی شمالی جانب) کھڑے ہو جائیں اور یہاں نماز پڑھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اچھا، ضَاهَيْتَ الْيَهُودِيَّةَ یہودیت کا تمھارے اندر تھوڑا بہت اثر باقی ہے، آج ظاہر ہوگیا۔ آپ کہتے ہیں کہ صخرہ کے پاس نماز پڑھیں، اس لیے کہ صخرہ یہودیوں کے نزدیک مقدس ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! ہماری نماز قبلے کی جانب ہوتی ہے، چنانچہ آپ نے آگے جا کر نماز پڑھی۔ [1] اسی جگہ مسجد اقصیٰ بنائی گئی، یعنی مسجد اقصیٰ کی ابتدا ہوگئی۔ بعد میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں وہاں پوری کی پوری مسجد آباد کر لی گئی۔

[1] البداية والنهاية: 68/7، ومسند أحمد: 38/1.

یوں فلسطین کا اسلامی دور شروع ہوا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ دو دفعہ بیت المقدس کو یہودیوں سے چھینا گیا۔ اسی طرح مسلمانوں سے بھی دو دفعہ مسجد اقصیٰ کو چھینا گیا ہے۔ پہلی دفعہ 1099ء میں جرمنی، اٹلی اور فرانس کے عیسائی، ایک بہت بڑا جتھا اور فوج بنا کر فلسطین پر حملے کے لیے نکلے۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ عیسائی اعتقاد کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایک ہزار سال پورے ہو چکے تھے۔ انگریزی میں اسے فرسٹ ملینیم کہا جاتا ہے، ایک ہزار سال۔ اور ان کا اعتقاد تھا کہ اب عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، اس وجہ سے ہمیں فلسطین میں ہونا چاہیے تاکہ ہم عیسیٰ علیہ السلام کا استقبال کریں۔ یوں یورپ سے لوگ چلے اور فلسطین پہنچے اور انھوں نے تباہی مچادی۔ جب بیت المقدس کو فتح کیا تو اس کی گلیوں میں مؤرخ کے بیان کے مطابق مسلمانوں کا خون اتنی کثرت سے بہ رہا تھا کہ ان صلیبیوں کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا۔ 70 ہزار مسلمان مسجد اقصیٰ کے اردگرد شہید ہوئے۔ جہاں مسجد اقصیٰ کی عمارت ہے، اس کے بائیں طرف ایک کھلا میدان ہے، ہم تو یہ سمجھے تھے کہ یہ کھلا میدان ہے لیکن ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ نہیں، اس کے نیچے ایک بہت بڑا مصلّیٰ ہے۔ اس کا نام ہے مصلائے مروانی۔ اس کا ایک دروازہ مسجد اقصیٰ کے قریب سے ہے۔ ہم اس دروازے سے داخل ہوئے۔ اسے ایسا سمجھ لیجیے کہ تہ خانہ ہے یا بیسمنٹ جس میں کئی ہال ہیں، اتنے ہال ہیں کہ مسجد اقصیٰ مروانی میں تو 7 ہزار کی گنجائش ہے جبکہ 7 سے 9 ہزار نمازی صرف مصلائے مروانی میں آسکتے ہیں۔ مصلائے مروانی کے اپنے دو بہت بڑے بڑے دروازے ہیں، جو کہ بند ہو چکے تھے۔ حال ہی میں فلسطینیوں نے بڑی محنت کے بعد اسی دور میں، یعنی یہودیوں کے دور میں ان دونوں دروازوں کو دوبارہ کھلوایا ہے۔ جمعہ کے دن یہ دروازے کھولے

جاتے ہیں اور جس طریقے سے مسجد اقصیٰ بھر جاتی ہے اس طرح مصلائے مروانی بھی بھر جاتا ہے۔ مروان، ولید کے دادا کا نام تھا۔ ولید بن عبدالملک بن مروان۔ یہ مصلاّ ایک مدرسے کے طور پر تعلیم کے لیے بنایا گیا تھا لیکن صلیبیوں نے جب حملہ کیا تو مسلمانوں نے یہاں پناہ لی۔ اسی مصلاّ مروانی میں ہزاروں مسلمان شہید کیے گئے۔ اس کے بعد صلیبیوں نے مصلاّ مروانی کو اپنے گھوڑوں کے لیے اصطبل بنا لیا، بعد میں یہ بند رہا۔ موجودہ دور میں اسے دوبارہ کھولا گیا ہے اور یہاں باقاعدہ نماز ہوتی ہے۔

88 سال بیت المقدس عیسائیوں کے کنٹرول میں رہا۔ اس کے بعد اسے دوبارہ کس نے فتح کیا؟ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے نمائندے موجود تھے۔ آپس میں گلے شکوے ہوئے اور اس کے بعد پھر عیسائیوں نے کہا: جناب! ہم نے بڑا ظلم کیا ہے۔ ہم آپ کو بیت المقدس واپس کرتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ واپس کرتے ہیں۔ ایسا ہوا تھا؟ نہیں! ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ کردستان کے ایک مجاہد صلاح الدین ایوّبی نے باقاعدہ جہاد کیا تھا۔ جہاد کے نتیجے میں صلیبیوں کو شکست دی گئی اور بیت المقدس دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ یہ جہاد سے فتح ہوا تھا، کسی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے فتح نہیں ہوا تھا۔ ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سارے کے سارے صلیبی جو فرانس سے اور دوسرے علاقوں سے آئے تھے، وہ وہاں آنے سے قبل فرانس کے ایک بہت بڑے چرچ میں جمع ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے مشورہ کیا تھا اور پھر جوق در جوق نکل کر فلسطین پر یلغار کی تھی۔ یہ واقعہ ایک ہزار سال پہلے پیش آیا تھا۔ اب دیکھیے اللہ تعالیٰ کی قدرت۔ ابھی لندن میں ہمارے پاس فرانس سے الجزائری مسلمانوں کی ایک جماعت آئی۔ انھوں نے کہا: ہم اس شہر

میں ایک مسجد بنانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ اور پھر انھوں نے کہا: ہم نے فی الحال ایک چرچ کرائے پر لیا ہوا ہے جس کے اندر ہم نماز اور جمعہ پڑھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ وہی چرچ ہے جس میں نو صدیاں پہلے مسلمانوں کو قتل کرنے کے مشورے کیے گئے تھے لیکن آج مسلمان اس کے اندر نماز پڑھتے ہیں۔

88 سال بعد 583ھ/ 1187ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا، یوں یہ پھر سے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اب اس کے بعد جو جدید تاریخ ہے، اس میں آ جائیے۔ یہودیوں کی پوری کوشش تھی کہ کسی طریقے سے فلسطین میں قدم جمانے کا موقع ہاتھ آ جائے، چنانچہ وہ عثمانی سلطنت کے خلیفہ (سلطان) عبدالحمید ثانی کے پاس آئے، جس کا دور 1876ء سے 1908ء تک ہے، اور اس سے کہا: عثمانی سلطنت مقروض ہے، ہم آپ کا سارا قرض دینے کو تیار ہیں۔ جتنا بھی قرض ہے، (جو کہ کروڑوں میں تھا) سارا قرض دے دیں گے۔ آپ صرف ہمیں فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دے دیں۔ سلطان عبدالحمید بیچارے میں کتنی بھی خرابیاں ہوں، اس کا موقف کیا تھا۔ اس نے ان سے کہا: ''فلسطین کوئی میری ملکیت تھوڑی ہے، یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے اور میں مسلمانوں کی سرزمین تمھیں کیسے دے سکتا ہوں؟'' اس نے یہ الفاظ بھی کہے: ''تم صرف میری لاش پر فلسطین کے اندر داخل ہو سکتے ہو۔ مسلمانوں کی جو سرزمین ہے اور جہاں وہ نمازیں پڑھتے ہوں تو پھر اس زمین کو تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ آپ اسے آسانی سے دشمنوں کو نہیں دے سکتے۔'' یہودیوں نے اس کے خلاف سازش کی اور اس سازش میں وہ کامیاب رہے اور اسے تخت سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد محمد خامس، محمد سادس اور آخری خلیفہ عبدالمجید ثانی آئے۔ پھر کمال

اتا ترک آیا اور سلطنت عثمانیہ ختم ہوگئی۔ یہ ساری کی ساری یہودیوں کی سازش تھی۔

1897ء میں ان لوگوں نے سوئٹزر لینڈ کے شہر بازل میں ایک کانفرنس کی۔ یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں باقاعدہ فلسطینی ریاست قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ وہ بڑے بڑے بنکرز تھے جن کی یہ تحریک تھی۔ ان میں ایک مشہور آدمی تھیوڈور ہرزل تھا، اس نے فلسطینی ریاست قائم کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ یہ واقعہ 1897ء کا ہے۔ اور جیسے کہ تاریخ میں لکھا ہے کہ یہودیوں کے نزدیک 7 کا ہندسہ بہت ہی معروف ہے، بہت ہی اہم ہے۔ ہمارے ہاں بھی اہم ہے۔ 7 مرتبہ طواف کرنا، 7 مرتبہ سعی کرنا، ہفتے کے سات دن، سات آسمان، سات زمینیں۔ اسی طریقے سے یہودیوں کے ہاں بھی 7 کا ہندسہ بہت ہی اہم ہے۔

لیکن تاریخی اعتبار سے بھی آپ دیکھیے کہ 1897ء میں یہ پہلی کانفرنس ہوئی۔ اس کے 10 سال بعد 1907ء میں، جبکہ سلطنت عثمانیہ کمزور پڑ چکی تھی، روس کے یہودی پہلی مرتبہ فلسطین پہنچے اور وہاں پر آباد ہوئے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا جا رہا تھا۔ اس وقت سلطان عبدالحمید کا زور کم ہو چکا تھا، اس وجہ سے ایسا ہوگیا۔ اس کے بعد اور 10 سال آگے چلیے۔ انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ 1917ء میں بیت المقدس پر انھوں نے حملہ کیا۔ بیت المقدس کا دفاع آخری عثمانی گورنر نے کیا لیکن وہ ناکام رہا۔ وہ اس لیے کہ عربوں نے بغاوت کر دی، غداری کی۔ موجودہ اردن کے بادشاہ عبداللہ کے دادا کا دادا شریف حسین انگریزوں کے ساتھ مل گیا، جس کی وجہ سے بیت المقدس انگریزوں کے ہاتھ چلا گیا۔

دسمبر 1917ء میں انگریز کمانڈر ایلن بی یروشلم میں داخل ہوا اور پھر اس وقت اس نے یہ

بات کہی: ''آج کروسیڈ مکمل ہوگیا۔ ہماری جو صلیبی جنگیں تھیں آج وہ مکمل ہوگئیں۔''
یوں 1917ء سے فلسطین پر انگریزی حکومت یا انگریزی انتداب کا سلسلہ شروع ہوا جو 30 سال تک باقی رہا۔ 1917ء سے اسرائیل کے قیام (1948ء) تک، یہ جو 31 سال کا عرصہ ہے، اس میں اس وقت کی یونائیٹڈ نیشنز جس کو لیگ آف نیشنز کہا جاتا تھا، اس نے برطانیہ کو یہ علاقہ دے دیا انتداب کے نام سے۔ انتداب کا مطلب یہ تھا کہ یہ علاقہ تمھارے کنٹرول میں رہے گا اور یہ عالمی سازش کا حصہ تھا کہ یہاں ایک یہودی سلطنت قائم کی جائے گی۔

1917ء میں برٹش امپائر کے وزیر خارجہ بالفور نے یہودیوں کو باقاعدہ خط لکھ کر بتایا کہ ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ آپ کے لیے ایک ہوم لینڈ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے، یعنی آپ جو کافی عرصے سے کوشش کر رہے تھے کہ یہاں پر اپنا ہوم لینڈ بنائیں، اپنی حکومت قائم کریں تو ہم اس بات کا وعدہ کرتے ہیں۔ انگریزوں نے شریف حسین بن علی سے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی کر کے عربوں سے غداری کی اور خفیہ طور پر یہودیوں سے کیے گئے وعدے کو پورا کیا۔

یہ 1917ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد یہودی دنیا کے کونے کونے سے ہجرت کر کے فلسطین پہنچنے لگے، اس لیے کہ برٹش گورنمنٹ نے ان کو اجازت دے دی تھی، چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ پہنچتے تھے اور انھیں وہاں پر بسایا جاتا تھا۔ 1927ء میں یہودیوں نے فلسطین کے اندر پیمائش کی۔ فلسطین کا رقبہ کتنا اور ہماری سلطنت کتنی بڑی ہوگی؟ فلسطین کا سارا رقبہ 27 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا تقابل کشمیر کے ساتھ کریں تو کشمیر کا رقبہ ہے 80 ہزار مربع میل۔ اس کے مقابلے میں فلسطین بہت چھوٹا سا

علاقہ ہے۔آپ دس سال اور آگے چلے جائیں۔ 1937ء میں یہودیوں نے اپنی با قاعدہ فوج قائم کر لی۔ اسے اسلحے سے لیس کیا اور اس کے 10 سال بعد نومبر 1947ء اقوام متحدہ نے قرارداد پاس کردی کہ اسرائیل کی حکومت قائم ہوجانی چاہیے۔قرارداد نمبر 181۔ اور عملاً یہ حکومت 15 مئی 1948ء کو قائم ہوئی۔انگریزوں کا آخری فوجی وہاں سے نکل گیا اور اسرائیل کی حکومت قائم ہوگئی۔ اصل میں تو یونائیٹڈ نیشنز کی قرارداد یہ تھی کہ فلسطین کو تقسیم کردیا جائے۔اس وقت فلسطین میں عربوں کی آبادی تقریباً ساڑھے بارہ لاکھ اور یہودیوں کی تعداد تقریباً سوا چھ لاکھ تھی مگر اقوام متحدہ کی قرارداد کہتی تھی کہ فلسطین کی 54 فیصد زمین یہودیوں کو اور 45 فیصد عربوں کو دی جائے، باقی ایک فیصد پر یروشلم آزاد علاقہ قرار دیا جائے۔ یہ تھا پلان جس کے مطابق دگنی آبادی والے مسلمانوں کو 45 فیصد حصہ دیا گیا تھا۔عربوں نے اس پلان کو قبول نہیں کیا اور مصر، شام، اردن ان تینوں نے مل کر اسرائیل پر حملہ کیا۔اسرائیل کی فوج کی تعداد 70 ہزار تھی جو جدید ترین اسلحے سے لیس تھی۔ ان کے مقابلے میں عربوں کی ساری فوج صرف 30 ہزار تھی، یعنی بہت کم ہمتی کے ساتھ انھوں نے مقابلہ کیا۔اسرائیلی کامیاب رہے اور انھوں نے فلسطین کے 78 فیصد رقبے پر قبضہ کر لیا۔ اسی دوران اسرائیل نے خلیج عقبہ کے سرے پر واقع بندرگاہ ایلات (ایلہ) بھی ہتھیا لی تھی۔

جون 1967ء کی جنگ میں غرب اردن بشمول یروشلم (بیت المقدس) اور غزہ کی پٹی پر اسرائیل کا قبضہ مکمل ہوگیا۔ اکتوبر 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ میں مصر نے نہر سویز کے گرد اسرائیل کے زیر قبضہ کچھ علاقہ واپس لے لیا۔ پھر 1977ء میں کیمپ ڈیوڈ معاہدہ ہوا اور اس معاہدے کے تحت سینا کا علاقہ مصر کو واپس مل گیا جس پر 1966ء

کی جنگ میں اسرائیل کا قبضہ ہو گیا تھا۔

1987ء میں، یعنی کیمپ ڈیوڈ کے 10 سال بعد اسرائیل ایک ایٹمی طاقت بن چکا تھا۔ اس کے پاس 200 ایٹم بم ہیں اور انھیں لے جانے والے وار ہیڈز سے لیس اسرائیل اب ایک ایٹمی طاقت ہے، گو امریکہ اس بات کو ظاہر نہیں کرتا، وہ اس لیے کہ عراق میں تو انھوں نے ساری کوشش کرلی کہ کہیں سے (Weapons of mass Destruction) وسیع تباہی کے ہتھیار مل جائیں۔ وہاں سے تو نہیں ملے لیکن اسرائیل میں یہ سارے کا سارا اسلحہ موجود ہے۔ اس کے بعد 1997ء میں نیتن یاہو جو کہ اسرائیل کا وزیراعظم تھا، اس کے زمانے میں اس ہیکل سلیمانی کا ماڈل پیش کیا گیا جو از سرنو بنے گا۔

یہ کیسا ہوگا؟ کس طریقے سے ہوگا؟ اس کے لیے منصوبہ بنایا گیا 6 ملین اینٹوں کا، یعنی 60 لاکھ اینٹیں۔ جس طرح بابری مسجد کی جگہ رام کے لیے مندر بنانے ہندوستان کے کونے کونے بلکہ دبئ سے بھی ہندوؤں نے اینٹیں بھیجی تھیں، اسی طریقے سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ بنانے کے لیے 60 لاکھ اینٹوں کے جمع کرنے کا منصوبہ 97ء میں شروع کیا جاچکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا منصوبہ یہ ہے کہ بحیرۂ مردار (Dead Sea) کے قریب ایک بہت بڑی قربان گاہ بنائی جائے۔ اس قربان گاہ میں کیا ہوگا؟ یہودی اعتقاد کے مطابق جب تک دسویں گائے ذبح نہیں ہوجاتی اور ذبح کرنے کے بعد اس کو جلایا نہیں جاتا اور اس کی راکھ یہودیوں پر چھڑکی نہیں جاتی یہودیوں کے گناہ معاف نہیں ہوں گے، وہ نجس کے نجس رہیں گے۔ انھیں پاک کرنے کے لیے دسویں گائے کا ذبح کرنا ضروری ہے۔ یہ دس گائے کا قصہ کیا ہے؟ قصہ یہ ہے کہ ایک گائے کا تذکرہ تو سورۂ بقرہ میں موجود ہے۔ سورۂ بقرہ میں جس گائے کا قصہ موجود ہے،

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ پہلی گائے تھی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی طویل عرصے میں تاریخ کے اندر آٹھ اور گائیں ذبح کی گئی ہیں۔ اب دسویں گائے کا وقت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ آخری گائے ہے اور اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی جائے گی۔ اس دسویں گائے کو تلاش کرنے کے لیے انھوں نے اسرائیل کے گاؤں گاؤں میں، کونے کونے میں چکر لگایا۔ اور بالآخر 1997ء میں ایک فارم میں ایک بچھڑا پیدا ہوا، اس بچھڑے میں وہ ساری صفات پائی جاتی تھیں جن کی وہ تلاش کر رہے تھے، چنانچہ انھوں نے اعلان کیا کہ دسویں گائے پیدا ہو چکی ہے۔ اس کا نام انھوں نے میلوڈی رکھا جو انگریزی کا لفظ ہے۔ میلوڈی اب جوان ہو رہی ہے۔ اس کے بعد دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ جب اس کی جوانی جوبن پر ہوگی تو پھر اس کی قربانی کی جائے گی۔ یہودیوں کے اپنے اعتقاد کے مطابق وہ سب کے سب نجس ہیں، ناپاک ہیں اور انھیں پاک ہونے کے لیے گائے کی قربانی کی ضرورت ہے۔ یہ آخری سال تھا 1997ء، اب اس کے بعد کیا ہوتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ لیکن اسرائیلیوں کے عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں کہ اسرائیل شروع سے وسعت پذیر ہے، پھیل رہا ہے۔ 1993ء میں جو ''اوسلو'' معاہدہ ہوا تھا اس کے مطابق فلسطینیوں کو بلدیاتی سطح کے اوپر کی اتھارٹی دی گئی ہے جسے فلسطینی اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ ان کو جو علاقہ دیا گیا ہے وہ کون سا علاقہ ہے؟ بحیرۂ مردار میں ایک چھوٹا سا دریا یا ندی ہے جسے Jorden River یا دریائے اردن کہتے ہیں۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے کا علاقہ فلسطینیوں کو دیا گیا ہے۔ اور غزہ کا علاقہ۔ اس کا رقبہ کتنا ہے؟ سارا فلسطین 27 ہزار مربع کلومیٹر پر محیط ہے اور اس میں سے غرب اردن کا علاقہ تقریباً 5 ہزار 286 مربع کلومیٹر اور غزہ کا علاقہ 300

مربع کلو میٹر ہے۔ تو گویا ارضِ فلسطین کا پانچواں حصہ فلسطینیوں کو دیا گیا ہے اور اس میں بھی یہودی جگہ جگہ آباد ہیں جنھیں یہودی بستیاں (Settlements) کہا جاتا ہے۔ اب چونکہ خودکش حملے شروع ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے یہودی خوف کی بنا پر ملک چھوڑ چھوڑ کے جا رہے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ خاص طور پر ان خودکش حملوں کی بنا پر اور اسی وجہ سے یہ مجبور ہوئے کہ دیوار کی تعمیر شروع کر دیں۔ جہاں جہاں ان کی آبادی ہے اس کے چاروں طرف یہ دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور فلسطینیوں کو باہر کر دیا گیا ہے۔ اب یہ جو دیوار وہاں بنی ہے، آپ دیکھیے کہ قرآن مجید نے تو اس دیوار کا ذکر 1400 سال پہلے ہی کر دیا تھا:

﴿لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ﴾

''وہ سب مل کر تم سے نہیں لڑیں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں، یا دیواروں کی اوٹ سے۔''

اللہ تعالیٰ نے تو اس دیوار کا ذکر پہلے ہی کیا ہوا ہے کہ ''وہ تم سے قتال نہیں کریں گے مگر ان میں جن بستیوں کے اردگرد فصیل ہوگی اور دیواروں کے پیچھے سے۔'' اب دیوار اس زمانے میں تو نہیں تھی اور کوئی شخص اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ دیوار کا تذکرہ کیوں ہے۔

اب وہ سٹیج تیار ہے جہاں مسلمانوں اور یہودیوں کی آخری جنگ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سٹیج تیار کیا جا رہا ہے۔ وہ ساری کی ساری باتیں جو ہم حدیث میں پڑھتے ہیں، قرآن مجید میں پڑھتے ہیں وہ اب پوری ہو رہی ہیں۔ ان میں سے ایک

● الحشر 14:59.

یہ دیوار بھی ہے جو اب بن چکی ہے۔ اور اسی طریقے سے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک آخری جنگ برپا ہوگی جسے عربی میں حرب مجدون (Armageddon)● کہا جاتا ہے۔ مجدون ایک پہاڑی کا نام ہے جو کہ تل ابیب سے تقریباً 55 کلومیٹر اور حیفہ (یافا) سے 15 کلومیٹر دور ہے اور اس کے پاس مجدو نامی قصبہ ہے۔ عیسائیوں کے اعتقاد کے مطابق وہاں آخری جنگ لڑی جائے گی۔

ہمارے اعتقاد کے مطابق بھی آخری جنگ وہاں ہوگی۔ ایک طرف مسلمان ہوں گے جن کی قیادت امام مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام کریں گے اور دوسری طرف یہودی ہوں گے جن کی قیادت دجال کرے گا، جسے مسیح الدجال کہا جاتا ہے۔ وہ مسیح جو کہ جھوٹا مسیح ہے جس کی پیروی یہودی کریں گے۔● حدیث میں آیا ہے کہ ہر وہ پتھر یا درخت جس کے پیچھے کوئی یہودی چھپے گا وہ درخت پکار اُٹھے گا، وہ پتھر پکار اٹھے گا کہ میرے پیچھے یہودی ہے۔ تَعَالِ فَاقْتُلْهُ يَا مُسْلِمُ. اے مسلمان! آ اور اسے قتل کر ڈال، سوائے ایک درخت کے جو یہودیوں کو پناہ دے گا، اس کا نام غرقد ہے۔ غرقد درخت یہودیوں کو پناہ دے گا۔ اس کے علاوہ باقی سارے درخت کسی یہودی کو پناہ نہیں دیں

● سیاق کلام سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ حدیث میں ''حرب مجدون'' کا نام آیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، حدیث میں اس جنگ کا نام ''الملحمة الكبرٰى'' آیا ہے۔ دیکھیے (مستدرك حاكم: 532/4، ومسند الشاميين: 266/2) ہاں! عیسائیوں اور یہودیوں کی روایات کے مطابق اس کا نام ''ہرمجدون'' ہے۔ صاحب مقالہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ صرف سبقت لسانی سے عبارت مشتبہ ہوگئی ہے۔● یہ سارا سیاق کسی ایک ہی حدیث میں نہیں ملتا بلکہ یہ مختلف احادیث کے مجموعے کی تلخیص بیان کی گئی ہے۔ ان احادیث کے لیے دیکھیے: (صحيح مسلم، الفتن وأشراط الساعة، حديث: 2897، 2912، 2944، [illegible]، وجامع الترمذي، أبواب الفتن، حديث: 2237.

گے۔ [1] اب کیا وجہ ہے کہ یہودی اس علاقے میں جہاں پر جنگ لڑی جائے گی اور جہاں مسیح علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے اور اس جگہ کا نام حدیث میں لکھا ہے: ''لدّ''۔ [2] اور یہ وہی جگہ ہے جہاں تل ابیب کا سول ائر پورٹ بھی ہے اور ملٹری ایئر پورٹ بھی۔ اس کا نام LOD ہے۔ یہ LOD اور لدّ ایک ہی چیز ہے۔ یہاں یہودی کثرت سے غرقد کے درخت اُگا رہے ہیں۔ اور میں نے اس بات کی تصدیق مفتی القدس سے بھی کی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہ بات صحیح ہے؟ انھوں نے کہا: بالکل صحیح ہے۔ یہ لوگ وہاں کثرت سے درخت (غرقد) اگا رہے ہیں۔ اب کیوں اگا رہے ہیں؟ کیا انھوں نے ہماری حدیثیں پڑھی ہیں یا اُن کی اپنی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اس درخت کا نام جو اُنھیں پناہ دے گا؟ ان میں سے کوئی ایک بات ہوسکتی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آخری جنگ ہوگی اور اس کے لیے یہ سارے کا سارا اسٹیج سیٹ کیا جا رہا ہے۔

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ عیسائی حضرات یہودیوں کی پشت پناہی کرتے ہیں، یہ اُن کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، انھیں سپورٹ کر رہے ہیں، حالانکہ ان میں اتنی دشمنی پائی جاتی رہی ہے، یعنی عیسائی اعتقاد کے مطابق یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا تھا۔ اتنی سخت دشمنی کے باوجود آخر کیا وجہ ہے کہ برطانیہ اور امریکہ ان کی سپورٹ کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شروع کے جو عیسائی تھے اُن میں زیادہ تر رومن کیتھولک یعنی پاپائے روم کے پیروکار تھے، پھر سولہویں صدی میں جرمنی کے اندر ایک شخص پیدا ہوا، جس کا نام ''مارٹن لوتھر'' ہے، اس نے ایک اصلاحی تحریک شروع کی۔ عیسائیت میں

[1] صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 2925، وصحيح مسلم، الفتن وأشراط الساعة، حديث: 2922,2921 [2] صحيح مسلم، الفتن، حديث: 2937.

اس تحریک کو پروٹسٹنٹ تحریک کہا جاتا ہے، یعنی عیسائیت کے اندر احتجاجی تحریک یا تجدید کا آغاز۔

اس شخص نے رومن کیتھولک کو قبول نہیں کیا، یعنی پاپائے روم کو قبول نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنا چرچ علیحدہ سے بنایا۔ پروٹسٹنٹ حضرات جرمنی میں زیادہ ہیں۔ برطانیہ نے بھی اس تحریک کا اثر قبول کیا۔ اور وہاں بھی علیحدہ سے چرچ قائم ہوگیا۔ اب برطانیہ رومن کیتھولک چرچ کو نہیں مانتا۔ اس کا اپنا چرچ ہے، جس کا نام ہے ''چرچ آف انگلینڈ۔'' یہ لوگ پروٹسٹنٹ ہیں اور یہی انگریز سترھویں صدی عیسوی میں امریکہ ہجرت کر کے گئے اور آہستہ آہستہ انھوں نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ تو یہی پروٹسٹنٹ انگریز تھے، جو نیویارک اور دوسرے علاقوں میں پہنچے۔ اس وجہ سے برطانیہ کے انگریز اور امریکہ کے انگریز سارے کے سارے تقریباً ایک ہی مذہب اور ایک ہی فکر کے ہیں۔ یہ فکر کیا ہے؟ یہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے جیسے کہ ہمارا اعتقاد ہے۔ وہ کہتے ہیں: مسیح علیہ السلام دوبارہ نازل ہوں گے اور ابھی جبکہ دو ہزار سال، یعنی سیکنڈ ملینیم پورے ہوگئے تو اس موقع پر تمام عیسائی حکومتوں نے 2 ہزار سال پورے ہونے کو باقاعدہ منایا، جشن منائے گئے۔ ہر ملک میں نئی نئی چیزیں بنائی گئی ہیں صرف یہ بتانے کے لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو دو ہزار سال پورے ہو چکے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل نہیں ہوئے تو اب بھی وہ انتظار کر رہے ہیں لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آنے سے قبل تین شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔ وہ کیا ہیں؟

پہلی شرط یہ کہ فلسطین میں یہودیوں کی ریاست اسرائیل قائم ہوگی، جو کہ قائم ہو چکی ہے۔ دوسری شرط یہ کہ اس ریاست کا دارالحکومت بیت المقدس ہوگا۔ یہ بھی پوری ہوگئی

کہ انھوں نے یہ ڈیکلیئر کر دیا ہے کہ بیت المقدس ہمارا دارالحکومت ہے۔ تیسری شرط ہیکل سلیمانی کی تعمیر ہوگی۔ یہ شرط ابھی پوری نہیں ہوئی اور یہودی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طریقے سے مسجد اقصیٰ کو مسمار کیا جائے۔ مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھودی گئی ہیں تاکہ کسی دن اگر زلزلہ آئے تو ان ٹنلز کی بنا پر مسجد اقصیٰ، جس کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں، بیٹھ جائے گی اور ایک دفعہ مسجد اقصیٰ گر گئی تو وہاں ٹمپل سلیمانی بنانا آسان ہو جائے گا۔

برطانیہ اور امریکہ کے سارے کے سارے عیسائی چونکہ پروٹسٹنٹ ہیں، اس لیے وہ عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی کے منتظر ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی سے پہلے جو شرطیں پوری ہونی چاہئیں، انھیں پورا کرنے کے لیے یہودیوں سے زیادہ حریص ہیں۔ وہ یہودیوں کی مدد کیوں کر رہے ہیں؟ صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جب تک یہ تین شرطیں پوری نہیں ہوں گی، عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئیں گے۔ ان کے بقول جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو پھر عیسائی بادشاہت قائم ہوگی۔ اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ عیسائی یہودیوں سے بھی بڑھ کر صیہونی (Zionist) ہیں۔ یہودی تو ہیں ہی صیہونی!۔

صیہونی (Zionist) ہونے کا تعلق ماؤنٹ زائن (Zion) یا صیہون نامی ایک پہاڑ سے ہے۔ زائن ازم یا صیہونیت کا مقصد بہرحال اسرائیل کا قیام ہے۔ اس اعتبار سے یہ پروٹسٹنٹ یہودیوں سے زیادہ Zionist ہیں، صرف اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے لیے سٹیج تیار ہو سکے۔ یوں میری تقریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو کچھ واقعات بنی اسرائیل کے اوپر ہوئے تھے وہی امت مسلمہ کے اوپر ہو رہے ہیں۔

دو دفعہ ان کے معبد کو ڈھایا گیا، دو دفعہ ہماری مسجد اقصیٰ کو ہم سے چھینا گیا۔ پہلی دفعہ صلاح الدین ایوبی نے اسے دوبارہ حاصل کیا۔ اس دفعہ ابھی تک وہ یہودیوں

کے قبضے میں ہے۔

اب میں آخر میں اپنے جو ذاتی مشاہدات ہیں ان کے بارے میں چند باتیں بتاتا چلوں۔ میں اور میری اہلیہ جب تل ابیب پہنچے تو ہمیں بتایا گیا تھا کہ وہاں جتنی بھی ٹیکسیاں ہیں وہ ساری کی ساری عربوں کی ہیں۔ بڑے آرام سے کسی بھی ٹیکسی میں آپ بیٹھ سکتے ہیں، چنانچہ مسجد اقصیٰ یا یروشلم جانے کے لیے جو تقریباً 2 گھنٹے کا راستہ ہے، ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ عرب آدمی تھا، اس لیے میں نے اسے السلام علیکم کہا۔ اس کے بعد میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بسم اللہ کہا تو وہ مسکرایا، عربی میں بات چیت کی۔ خوش آمدید کہا، پھر کہنے لگا: میں دراصل اسرائیلی ہوں، یعنی میں یہودی ہوں۔ ہوں میں مصر سے لیکن میری ماں یمن سے ہے۔ میں اسرائیلی ہوں۔ وہ اپنے آپ کو یہودی نہیں کہتے۔

اس کے بعد سارے راستے ہماری بات چیت ہوتی گئی۔ میں نے اس سے کہا: تمھاری زبان عربی ہے۔ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کہنے لگا: ہماری مقدس کتاب تورات ہے، وہ میں نے اب تک نہیں پڑھی، تمھاری کتاب کیسے پڑھ لیتا؟ میں نے دل میں سوچا کہ ہمارے بہت سے مسلمان بھی یہی بات کہتے ہیں۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوگئے ہیں۔ قرآن پڑھنے سے کیا مطلب ہے؟ قرآن شیلف میں رکھا ہوا ہے، وہی کافی ہے۔ اس کے بعد اس نے ہمیں بتایا کہ یہودیوں کی عید کا دن ہے۔ وہ عید سکوت کہلاتی ہے اور عید سکوت کے دن کو وہ ایسے ہی مناتے ہیں جیسے یوم سبت (ہفتے کے دن) کو، اس روز وہ کام نہیں کرتے۔ چونکہ وہ ایک لبرل یہودی تھا، اس لیے جب ہم یروشلم پہنچے تو کہنے لگا: قدامت پسند یہودی ماشاء اللہ بڑی بڑی داڑھی رکھتے

ہیں۔ لٹیں سر سے لٹک رہی ہوتی ہیں اور لمبا سا کوٹ پہنتے ہیں۔ ایسے یہودی نظر آئے تو اس نے کہا: یہ سارے کے سارے قدامت پسند یہودی ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ کوئی ہمیں پتھر نہ مارے، اس لیے کہ ہم لوگ سوار ہیں، حالانکہ ہمیں سوار نہیں ہونا چاہیے۔ پیدل چلنا چاہیے۔ بہر صورت اس نے ہمیں مسجد اقصیٰ تک تو پہنچایا، یعنی جس ہوٹل تک ہمیں جانا تھا وہاں پہنچایا۔

اب ذرا تذکرہ ایک اور واقعے کا۔ یہودیوں کے ساتھ میں کوئی لڑائی مول نہیں لینا چاہتا تھا لیکن کیونکہ دل کڑھتا تھا، اس لیے اس کا تھوڑا سا اظہار ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ہم صبح فجر کی نماز کے لیے گلیوں میں سے ہوتے ہوئے مسجد اقصیٰ گئے۔ ہوٹل تو سنسان تھے کہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم دروازے تک پہنچے تو وہاں گارڈ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک اسرائیلی گارڈ میرے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ اپنی شناخت بتائیے، اس لیے کہ میں نے پہلے آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا: میں مسلمان ہوں اور یہ ہمارا گھر ہے۔ یہ بیت اللہ ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہم یہاں نماز پڑھنے کے لیے آئے ہیں تو آپ کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے۔ کہنے لگا: نہیں، میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ آپ اپنی شناخت بتائیں۔

بہر صورت میں نے اس کو اپنا پاسپورٹ وغیرہ دکھایا۔ پاسپورٹ دیکھ کر وہ کہنے لگا: اچھا! آپ کی تو جائے پیدائش ہندوستان ہے۔ اصل میں تو آپ ہندوستانی ہیں۔ تو آپ برٹش یا برطانوی کیسے ہو گئے؟ میں نے کہا: تم بتاؤ تمھاری جائے پیدائش کہاں کی ہے؟ اس لیے کہ یہودی سارے باہر سے آئے ہیں۔ کوئی بھی یہاں کا رہنے والا نہیں ہے۔ میں نے کہا: تم بتاؤ تم کہاں سے آئے ہو؟ وہ خاموش ہو گیا۔ دیکھنے لگا، پھر میں

نے کہا: گو میں برطانیہ کا رہنے والا ہوں لیکن میں پاکستانی ہوں اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان ایک اٹامک پاور ہے۔ تو وہ اس سے چڑ گیا۔ میں نے کہا: کہیں ہماری جنگ نہ ہوجائے۔ اس سے پاسپورٹ لیا اور مسجد کے اندر چلا گیا۔

اس کے بعد ایک جھڑپ اور ہوئی ویلنگ وال (Wailing Wall) کے اوپر۔ جب ہم ویلنگ وال کے علاقے میں داخل ہونے لگے تو وہاں پر متعین فوجی نے ہماری شکلوں کو دیکھ کر دور ہی سے اشارہ کردیا کہ آپ چلتے جائیں۔ ادھر نہ آئیں۔ میں نے کہا: میں ادھر کیوں نہ آؤں۔ ہزاروں میل دور سے آئے ہیں یہ دیکھنے کے لیے۔ ہم تو آئیں گے۔ میرے ہاتھ میں عربی کی دو کتابیں تھیں جو مفتی القدس شیخ عکرمہ صبری نے ہدیتاً مجھے دی تھیں لیکن وہ لفافے میں تھیں۔ مفتی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اگر ویلنگ وال جانا چاہتے ہو تو یہ مت بتانا کہ میں عربی جانتا ہوں۔ وہ اس لیے کہ عربوں کو وہاں جانے نہیں دیتے۔ کسی کے بارے میں شک ہوجائے کہ عربی جانتا ہے یا عرب ہے، وہ اس کے قریب نہیں جانے دیں گے۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے آپ کو ایکسپلوڈ کردے، یعنی خودکش حملہ کردے۔ ان کی دی ہوئی دونوں عربی کتب میرے ہاتھ میں تھیں۔ اب آپ دیکھیں، میرے ہاتھ میں عربی کتابیں ہیں اور جب میں وہاں گیا تو فوجی مجھ سے پوچھتا ہے کہ تم عربی جانتے ہو؟ میں نے کہا: میں عربی نہیں جانتا کیونکہ مفتی صاحب نے مجھے اسی طرح کہا تھا۔ لیکن اسے یہ توفیق نہیں ہوئی کہ میرے ہاتھ میں کتب دیکھ کر معلوم کر لیتا کہ یہ عربی میں ہیں۔ بہر حال اس نے مشین میں سے کتابیں گزار دیں اور اس کے بعد ہماری بات چیت ہوئی۔ وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہنے لگا: آپ جانتے ہیں کہ یہاں بڑے جھگڑے ہوتے ہیں، لڑائیاں ہوتی

ہیں۔ اس وجہ سے ہم زیادہ تحقیق و تفتیش کرتے ہیں۔

بہر صورت اس نے ہمیں جانے دیا اور ہم ویلنگ وال کے پاس گئے۔ سارا علاقہ دیکھا۔ تین دن تھے صرف ہمارے پاس اور کہیں جا نہیں سکتے تھے، پھر ہم نے سوچا کہ قریب ترین جگہ بحیرۂ مردار ہے۔ اسے تاریخی حیثیت سے دیکھنے کے لیے ہم نے ایک ٹیکسی کی اور وہاں پہنچ گئے۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن مجید میں اس مقام کا تذکرہ یوں ہے:

﴿الٓمٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○﴾

"الٓمٓ۔ رومی مغلوب ہو گئے۔ قریب ترین سرزمین میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے۔"●

رومی مغلوب ہو گئے زمین کے نچلے ترین حصے میں۔ جب رومیوں اور ایرانیوں کا مقابلہ ہوا تھا اور پھر ایرانیوں کو فتح ہوئی۔ رومی مغلوب ہوئے، تب یہ آیات اتری تھیں۔

ان آیات مبارکہ میں اس علاقے کو زمین کا نچلا ترین حصہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ جو الفاظ ہیں وہ اس لیے ہیں کہ بحیرۂ مردار (Dead Sea) سمندر کی سطح سے 400 میٹر نیچے ہے۔ عالمی سمندر اپنی سطح برقرار رکھتا ہے لیکن خشکی بند (Land Loched) ہونے کے باعث بحیرہ مردار واحد سمندر ہے جو عالمی سطحِ بحر سے 400 میٹر نیچے ہے۔

جس وقت ہم بحیرۂ مردار (البحر المیّت) کی طرف جا رہے تھے تو ڈھلوان کے مقام آغاز پر ایک سائن بورڈ لگا ہے جس پر لکھا ہے: "سطح البحر" یعنی یہ سمندر کی سطح ہے جہاں اس وقت آپ کھڑے ہیں۔ وہاں سے پھر ایک سڑک نیچے کو جاتی ہے

● الروم 30:1-3۔

ڈھلوان میں، جس کے ذریعے سے آپ بحیرۂ مردار تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ وہ بحیرۂ مردار ہے جس کے ایک علاقے میں لوط علیہ السلام کے زمانے میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں تھیں۔ لوط علیہ السلام کی قوم نے نافرمانی کی تو ان پر یہاں عذاب نازل ہوا۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے ہم تو بہر صورت ایک تاریخی حیثیت سے دیکھنے گئے تھے۔ اس سفر کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں لیکن اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

مسلک اہل حدیث

مسلمانوں کے درمیان بے شمار فرقوں کا ہونا ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر یہ فرقے ان پروں کے مانند ہوتے جو ایک عقاب کو اونچا اڑانے میں مدد دیتے ہیں تو پھر بھی انھیں سندِ قبولیت حاصل ہوسکتی تھی لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔

راقم نے ایک دنیا دیکھی ہے اور وہ اپنے تجربے کی روشنی میں بتا سکتا ہے کہ ان اختلافات نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے کتنا دور کر رکھا ہے۔ خود اہل سنت سے موسوم فرقوں میں بھی اسلام کے ایک سب سے بڑے رکن، یعنی نماز کی کیفیات، اوقات، ہیئات کے بارے میں بھی گوناگوں اختلاف پایا جاتا ہے۔

شافعی حضرات کے نزدیک ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے، جبکہ حنفی فقہ کے مطابق امام کے پیچھے فاتحہ کا پڑھنا جائز نہیں۔

حنبلی، حنفی اور شافعی حالتِ قیام میں ہاتھ سینے پر یا ناف کے اوپر باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جبکہ مالکی ہاتھ لٹکائے رہتے ہیں اور یہی عمل اہل تشیع کا بھی ہے۔

مجھے افریقہ کے قیام کے دوران میں روڈیشیا (حال زمبابوے) کے دارالحکومت سالسبری (حال ہرارے) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں شہر کے مسلم علاقے میں جس کا

نام اس وقت بھی ہرا رہے تھا، مجھے جمعے کی نماز پڑھانے کی دعوت دی گئی۔ جمعے سے فارغ ہوئے تو لوگوں نے کہا: اب ظہر کی نماز بھی پڑھا دیں۔

ظہر احتیاطی کے بارے میں سنا تو تھا، مشاہدے میں بھی آ گیا۔ اس وقت تو سمجھا بجھا کر انھیں اس فعل سے باز رکھا، بعد میں خیر اللہ جانے!! یہ سب مذہبا شافعی تھے۔ بعض شوافع اس لیے بھی جمعہ کی نماز کے بعد ظہر پڑھنا لازم جانتے ہیں کہ لوگوں کی تعداد چالیس سے کم ہے۔

احناف کی مساجد میں عموماً فرض نماز کے بعد امام کی اقتدا میں دعا مانگی جاتی ہے لیکن افریقہ ہی کی بعض مساجد میں دیکھا کہ سنتوں کے اختتام کے بعد بھی نمازی اس وقت تک نہیں اٹھتے جب تک کہ امام از سر نو دعا نہ مانگ لیں۔ اور پھر یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ آخر تک مسجد میں موجود ہیں، وہ مسجد کے صدر دروازے میں امام کا انتظار کرتے پائے گئے تاکہ چلتے چلتے امام کے ساتھ الوداعی دعا بھی ہو جائے۔ حنابلہ سنت کے مطابق جماعت سے پہلے صفوں کی درستی کے قائل ہیں لیکن ان کے ہاں بھی پیر سے پیر اور کندھے سے کندھا ملانے والی بات نہیں دیکھی۔

اہل سنت کے حلقے سے باہر نکلا جائے تو اہل تشیع میں اثنا عشری، بوہرہ جماعت، نوربخشیوں اور اسماعیلیوں کے مابین اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ آخر الذکر نماز، روزے اور حج سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

شریعت کے ساتھ ساتھ طریقت کے نام سے عالم اسلام میں بے شمار نسبتیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند مشہور جیلانی، نقشبندی، چشتی اور سہروردی ہیں۔ بعض لوگ فخریہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک نہیں کئی سلسلوں سے بیعت ہیں۔ ایک سلسلہ طریقت

کے شیخ کی ویڈیو دیکھی جس میں ان کے مریدان باصفا شیخ کے سامنے حالت وجد میں نظر آئے، نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی ان کے سامنے دھمال چوکڑی کا رقص کرتی نظر آئیں۔ عقل و خرد حیران ہے کہ کیا محمد عربی ﷺ کے لائے ہوئے دین میں یہ سب جائز ہو سکتا ہے؟

فرقہ واریت کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے، اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد موجود ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾

''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقوں میں مت تقسیم ہو جاؤ۔''[1]

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾

''جن لوگوں نے اپنے دین میں تفریق ڈالی اور وہ گروہوں میں تقسیم ہو گئے، تمھارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔''[2]

لاریب کہ ہر فرقہ اپنے مؤسس کی نسبت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے وجود سے قبل اس فرقے کا وجود نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کلمہ گو افراد کے لیے ''مسلم'' کا لفظ نہ دیا ہوتا تو یقیناً اہل اسلام اپنے آپ کو ''محمدی'' کہلانا پسند کرتے۔

ہم یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ صدیوں کی روایات کے مطابق ایک حنفی ماحول میں پلنے بڑھنے والا شخص اگر اپنی نسبت ''حنفی'' قرار دے یا شافعی تربیت کی بنا پر اپنے آپ کو ''شافعی'' کہے تو ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ندوۃ العلماء کے فارغ اپنے آپ کو ندوی اور دارالعلوم دیو بند کے فارغ اپنے آپ کو دیو بندی کہلانا پسند کرتے ہیں لیکن مسئلہ اس وقت گھمبیر ہو جاتا ہے جب یہ نسبتیں

[1] آل عمران 3:103. [2] الأنعام 6:159.

قرآن و حدیث سے ثابت شدہ کسی حکم یا سنت کو قبول کرنے میں آڑے آئیں اور دیگر اہل اسلام سے فطری قربت کو دوری اور وحشت میں تبدیل کر دیں۔

اپنے امام کو حرف آخر سمجھنا یا اس کی تقلید میں صحیح یا راجح بات کو قبول نہ کرنا چوتھی صدی کے بعد کی پیداوار ہے۔ چاروں ائمہ کرام دوسری اور تیسری صدی کے وسط میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور جیسا کہ ہم بعد میں بحث کریں گے، انھوں نے دین کی تفہیم، فقہی امور کی تشریح اور اپنی رائے کے اظہار میں اپنی صوابدید کے مطابق حق بات پیش کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے اپنے کسی شاگرد کو اپنی رائے کا پابند بنانے پر مجبور نہیں کیا۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''دو صدیوں کے بعد ان میں تخریج مسائل کی کچھ کوششیں ہوئیں لیکن چوتھی صدی کے لوگ کسی ایک مذہب کی تقلید خالص پر اکٹھے نہیں ہوئے جیسا کہ تحقیق اور تتبع سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں علماء بھی تھے اور عام لوگ بھی۔ عام لوگوں کا یہ دستور تھا کہ وہ ان اجماعی مسائل میں کہ جن میں مسلمانوں میں اختلاف نہیں ہے، صرف شارع کی تقلید کرتے تھے اور یہ لوگ وضوء، غسل، نماز، زکاۃ اور ایسے دوسرے مسائل اپنے آباء سے یا اپنے شہر کے اساتذہ سے سیکھا کرتے تھے اور اگر کوئی نیا مسئلہ پیش آ جاتا تھا تو بغیر تعیین مذہب کسی بھی مفتی سے مسئلہ پوچھ لیا کرتے تھے۔''

آج ایک غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ بظاہر وہ اسی فرقہ میں داخل ہوگا جس کے نام لیوا کسی دوست کی بنا پر وہ اسلام سے متعارف ہوا ہے لیکن اگر وہ اپنی تحقیق سے مسلمان ہوا ہو یا کسی بھی اہل علم سے یہ سوال کرے کہ میں کس فرقے میں

● شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ: 1/122۔

داخل ہوں تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

کیا سب سے بہتر جواب یہ نہ ہوگا کہ اسلام کے اس ماڈل کو اپنانے کی کوشش کرو جسے محمد عربی ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لانے والوں نے اختیار کیا تھا یا کم از کم اس جماعت میں داخل ہونے کی کوشش کرو جو اپنی نسبت صرف اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف کرتی ہے۔ ایک امام نہیں بلکہ چاروں ائمہ کرام اور ائمہ محدثین کی کاوشوں کا احترام کرتی ہے اور سب سے استفادہ کرنا اپنا مسلک اور شعار سمجھتی ہے۔

ہمارے اس جواب کی بنیاد نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''یہود 71 فرقوں میں اور نصاریٰ 72 فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ یہ امت 73 فرقوں میں تقسیم ہوگی، جو سب کے سب جہنم میں ہوں گے، سوائے ان لوگوں کے جو میرے طریق پر ہوں گے اور میرے صحابہ کے طریق پر۔''[1]

لاریب کہ ''مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي'' کا راستہ اپنانے کا تمام اہل سنت بشمول اہل حدیث دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ دعویٰ دلیل و برہان کا محتاج ہے۔ آیئے صحابہ کے طریق کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ کون سی جماعت اس طریق کے قریب ترین ہے۔

طریق صحابہ کے بنیادی خدوخال: ① صحابہ کرام میں عام مسلمان بھی تھے اور اہل علم

[1] یہ حدیث اس سیاق سے مجھے نہیں مل سکی، محسوس ہوتا ہے کہ یہ روایت یہاں مفہوماً بیان کی گئی ہے کیونکہ اس کا مفہوم صحیح احادیث سے ملتا ہے جو مختلف صحابہ حضرت ابوہریرہ، عبداللہ بن عمرو بن العاص، معاویہ بن ابی سفیان، انس بن مالک، عوف بن مالک ﷺ اور دیگر صحابہ سے مفصل اور مختصر الفاظ میں منقول ہے۔ دیکھیے: سنن أبي داود، السنة، حديث:4597,4596، وجامع الترمذي، الإيمان عن رسول الله ﷺ، حديث:2641,2640، وسنن ابن ماجه، الفتن، حديث:3991-3993، وسلسلة الأحاديث الصحيحة:204,203/1.

بھی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''اہل ذکر (وحی الٰہی کا علم رکھنے والوں) سے سوال کرو اگر تم نہیں جانتے ہو۔''[1]

اس کے مصداق عام افراد اہل علم صحابہ سے مسائل میں رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔ چونکہ صحابہ مختلف شہروں میں سکونت پذیر تھے، اس لیے ہر علاقے کے لوگ اپنے شہر کے اہل علم سے مسائل معلوم کیا کرتے تھے لیکن حج کے موقع پر لوگ اس کی طرف رجوع کرتے تھے جو اپنے علم میں زیادہ نمایاں ہو چکا ہو۔

لیکن صحابہ کے ماننے والوں میں کسی ایک صحابی کی طرف نسبت کرنے کا رجحان قطعاً نہیں پایا جاتا تھا، یعنی لوگ بکری، عمری، عثمانی اور علوی کے نام سے نہیں پہچانے جاتے تھے۔

② صحابہ میں یہ امتیاز پایا جاتا تھا کہ بعض صحابہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں شب و روز رہنے کی بنا پر ایسی کئی سنتوں سے واقف تھے جن سے دوسرے صحابہ اتنی واقفیت نہیں رکھتے تھے، اس لیے جونہی رسول اکرم ﷺ کی کوئی سنت ایک ناواقف حال کے علم میں لائی جاتی تھی، وہ سر تسلیم خم کر دیا کرتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حج کے موقع پر ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حج تمتع کے بارے میں کیا خیال ہے؟ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جائز ہے۔ وہ کہنے لگا: لیکن تمہارے والد تو حج تمتع سے منع کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے کہ اگر ایک کام سے میرے والد منع کریں اور رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کیا ہو تو کیا ہم اپنے باپ کے حکم کی اتباع

[1] الأنبياء 7:21۔

کریں گے یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی؟ اس آدمی نے کہا: بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تو اس کام (حج تمتع) کو رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ ●

یہی ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں جن کے ایک بیٹے بلال نے اس بنا پر اپنے گھر کی عورتوں کو مسجد میں جانے سے روک دیا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے باعث فتنہ بنتی ہیں۔ اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے تو اجازت دی ہے اور پھر آپ ﷺ کا یہ قول پیش کیا: ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھروں سے نہ روکو!'' بلال نے کہا: لیکن میں تو روکوں گا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما اتنے جلال میں آئے کہ نہایت شدید لہجے میں اسے برا بھلا کہا اور فرمایا: میں تیرے سامنے اللہ کے رسول کا قول پیش کر رہا ہوں اور تو کہتا ہے کہ میں تو انھیں ضرور روکوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے وفات تک اپنے بیٹے سے بات نہ کی۔ ●

③ اگر کسی امر میں اختلاف ہو جاتا تو قولِ رسول ﷺ سب کے لیے قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد تین مسائل میں اختلاف ہوا: آپ کو کہاں دفن کیا جائے؟ آپ کا ترکہ کیا وارثین میں تقسیم کیا جائے؟ مہاجرین و انصار میں کون خلافت کا زیادہ مستحق ہے؟

تیسرا مسئلہ تو انتہائی نزاعی مسئلہ تھا جس پر تلواریں میان سے نکل سکتی تھیں لیکن ان تینوں مسائل پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قولِ رسول ﷺ پیش کیا جسے سب نے بلا تامل قبول کیا۔

پہلے مسئلے کی بابت یہ حدیث پیش کی: **«مَا قُبِضَ نَبِيٌّ إِلَّا دُفِنَ حَيْثُ يُقْبَضُ»** ''نبی وہیں دفن کیا جاتا ہے جہاں اس کی روح قبض ہوتی ہے۔'' ● چنانچہ نبی کریم ﷺ

● جامع الترمذي، الحج، حديث: 824. ● صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 442، ومسند أحمد: 36/2. ● سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث: 1628، وصحيح جامع الصغير، حديث: 10607.

کو حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دفن کیا گیا۔

دوسرے مسئلے کے بارے میں یہ حدیث پیش کی: «إِنَّا مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورَثُ، مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ» ”ہم انبیاء کا گروہ ہیں جن کی وراثت نہیں ہوتی، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔“ ●

تیسرے مسئلے کے بارے میں یہ حدیث سنائی: «اَلْأَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ» ”امام قریش میں سے ہوں گے (بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ رکھتے ہوں)۔“ ●

● صحيح البخاري، الفضائل، حديث: 3712، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، حديث: 1759، والمعجم الأوسط: 64/4 واللفظ له ● یہ حدیث اگرچہ صحیح ہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مذکورہ الفاظ اور مذکورہ سیاق کے ساتھ یہ روایت باسند صحیح مجھے نہیں مل سکی۔ ہاں تاریخ کی بعض کتب میں یہ الفاظ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے موجود ہیں۔ (دیکھیے: العواصم من القواصم: 61/1، والإصابة في تمييز الصحابة: 607/1، والسيرة الحلبية: 480/3 وغیرہ) ان کتب میں اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے۔ علامہ بلاذری نے اپنی سند کے ساتھ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ سے جو سقیفہ بن ساعدہ کا قصہ نقل کیا ہے، اس میں یہ الفاظ اسی سیاق کے ساتھ موجود ہیں۔ (أنساب الأشراف: 250/1-251) لیکن اس کی سند واقدی کی وجہ سے شدید ضعیف ہے کیونکہ واقدی کذاب راوی ہے۔ اس سیاق کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی جو الفاظ کچھ بہتر سند کے ساتھ مجھے ملے ہیں، وہ یہ ہیں: «قريش ولاة هذا الأمر» (مسند أحمد: 5/1، وتاريخ الطبري: 234/2، والبداية والنهاية: 268/5) یہ روایت اگرچہ منقطع ہے کیونکہ اس میں حمید بن عبدالرحمن کا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے لیکن ائمہ محققین نے اس روایت کی تحسین کی ہے، چنانچہ امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”هذا الحديث حسن وإن كان فيه إنقطاع فإن حميد بن عبدالرحمن بن عوف لم يدرك أيام الصديق وقد يكون أخذه عن أبيه أوغيره من الصحابة وهذا كان مشهورًا بينهم.“ (كنزالعمال: 638/5) ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں: ”وهو مرسل حسن.“ (منهاج السنة: 536/1) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے الصحیحة: (146/3، حدیث: 1156) میں ذکر کیا ہے۔ اور شعیب ارنؤوط اس کے بارے میں فرماتے ہیں: ”صحيح لغيره، رجاله ثقات رجال الشيخين وهو مرسل.“ (الموسوعة الحديثية مسند الإمام أحمد: 199/1)

اس حدیث کے سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا: ہاتھ بڑھائیں تاکہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے اور پھر بقیہ مہاجرین اور انصار بھی بیعت کے لیے لپک پڑے۔

④ قرآن کے کسی لفظ یا آیت کے بارے میں ابہام پیدا ہوجاتا تو صحابہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیا تفسیر پیش کی تھی۔ اگر آپ کا قول نہ ملتا تو ان صحابہ کی طرف رجوع کیا جاتا جنھیں قرآن سے خصوصی شغف تھا، جن میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ اور خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

◂◂ مذکورہ الفاظ صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ (مسند طیالسي: 284/1، ومسند أحمد 129/3) حضرت ابوبرزہ، (مسند أحمد: 421/4) حضرت علی رضی اللہ عنہ (سنن الکبرٰی للبیهقي: 143/8) اور دیگر صحابہ سے مروی ہیں۔ امام ابن حجر اور سخاوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ (نظم المتناثر، ص: 159) کیونکہ یہ روایت متعدد صحابہ کرام سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے "لذة العیش بطریق حدیث الأئمة من القریش" نامی جزء میں اس حدیث کے طرق اکٹھے کیے ہیں جو تقریباً 40 صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ (فتح الباري: 530/6، 32/7، 152/12) ان میں سے بعض طرق صحیحین میں بھی موجود ہیں۔ دیکھیے: (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 7139، 7140، وصحیح مسلم، رقم الحدیث: 1818-1822)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ روایت اگرچہ صحیح ہے لیکن مذکورہ سیاق سے مذکورہ الفاظ کے ساتھ ثابت نہیں ہے، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ یہ حدیث انھی الفاظ میں اسی سیاق کے ساتھ مشہور ہے تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ یہ حدیث چونکہ متعدد طرق سے مختلف الفاظ سے مروی ہے لیکن یہ سب طرق حدیث "الائمة من القریش" کے نام سے معروف ہیں، اس لیے شارحین اور مورخین نے ان الفاظ کی شہرت دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہی الفاظ منسوب کر دیے جبکہ انھوں نے اس سے ملتے جلتے الفاظ بیان کیے تھے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، لہٰذا الفاظ کے اختلاف کی بنا پر اس واقعے کو ضعیف نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایک تو دونوں روایات کا مفہوم ایک ہے اور دوسرا یہ روایت بالمعنی ہو سکتی ہے جس کے جواز کے سبھی قائل ہیں۔

بعض آیات کی تفسیر اور توجیہ میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، جیسے سورۂ نور کی آیت ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ ''اور عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہوجائے۔'' [1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے چہرہ اور دونوں ہاتھ مراد لیے ہیں۔

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ چہرہ اور ہاتھ دونوں چھپائے جائیں، الا یہ کہ ہوا کی بنا پر اگر نقاب ہٹ جائے یا کسی اور اتفاقی سبب کی بنا پر تو ایسی صورت میں عورت پر کوئی حرج واقع نہیں ہوگا۔

ایسے ہی مطلقہ خاتون کی عدت کے بارے میں ثلاثة قروء کے الفاظ وارد ہوئے۔ [2] بعض کے نزدیک قروء سے مراد حیض اور بعض کے نزدیک طہر ہے۔ صحابہ میں سے پہلی رائے حضرت عمر، علی، ابن مسعود اور ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہم ہے۔ دوسری رائے حضرت عائشہ، ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور یہی اختلاف پھر امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے میں بھی رہا ہے۔

ایک اور مثال لیجیے: قرآن کی رو سے حاملہ عورت (اگر اسے طلاق ہوجائے تو اس) کی عدت وضع حمل ہے۔ [3] اور بیوہ عورت کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ [4] لیکن بیوہ عورت اگر حاملہ بھی ہو تو اس کی عدت کیا ہوگی۔ جمہور علماء کے نزدیک دونوں مدتوں میں جو پہلے ختم ہوجائے اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک دونوں مدتوں میں سے جو زیادہ لمبی ہو وہ قرار پائے گی۔

اس قسم کی متضاد آراء میں ائمہ کرام نے دونوں طریقے اختیار کیے ہیں۔

[1] النور 31:24۔ [2] البقرۃ 228:2۔ [3] الطلاق 4:65۔ [4] البقرۃ 234:2۔

اوّل: کسی ایک صحابی کے قول کو اپنا لیا۔

دوم: اس صحابی کے قول کو اپنایا جس کی تائید میں مزید قولی یا عملی سنت نبویہ یا اثر صحابی موجود ہو، مثلاً: مذکورہ مسئلے میں سُبَیعہ الاسلمیہ کا واقعہ [1] پہلی رائے کی تائید کرتا ہے۔

⑤ صحابہ میں یقیناً سیاسی محاذ آرائی کی کیفیت ضرور پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں جنگ جمل اور جنگ صفین رونما ہوئیں لیکن اس میں بھی زیادہ دخل ان فتنہ پردازوں کا تھا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون ناحق کیا اور پھر قاتلین عثمان سے قصاص لینے کے مطالبے کو نمایاں کر کے اس جماعت باصفا کو آپس میں لڑا دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی لڑائی کسی مذہبی اختلاف کی بنا پر نہیں تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کئی مسائل میں صحابہ سے اختلاف کیا لیکن اس اختلاف کی بنا پر آپس کی مودّت و شفقت میں کمی نہیں آئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی نسبت سے اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت عامہ ہونے کے بعد آپ نے سکوت اختیار کیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد کھلے عام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ [2] اور پھر وہ خلفائے ثلاثہ کے دور خلافت میں ان کے وزیر اور مشیر رہے بلکہ ان کا دایاں بازو رہے، ان کی تعریف و توصیف کرتے رہے اور بعد میں آنے والوں کے لیے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی مثال قائم کرتے گئے۔

⑥ حدیث رسول کی عظمت کی بنا پر انھوں نے حدیث کو قبول کرنے کے لیے پوری

[1] صحيح البخاري، التفسير، حديث: 4909، وصحيح مسلم، الطلاق، حديث: 1485.
[2] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4240، 4241.

احتیاط سے کام لیا۔ اگر کسی نے حدیث پیش کی تو اس پر مزید ایک اور شاہد صرف احتیاط کی بنا پر طلب کیا۔ ایسے کئی واقعات حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سیرت میں ملتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ راوی سے قسم اٹھانے کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی جھوٹی بات منسوب نہ کی جا سکے۔

تابعین میں یہ سلسلہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور راوی سے پوری اسناد بیان کرنے کا مطالبہ کیا جاتا۔ ابن سیرین (تابعی) کہتے ہیں: اگر اسناد نہ ہوتی تو جو چاہتا جیسا چاہتا بیان کر دیتا۔ اور کہا: یہ تو علم ہے علم، اس لیے دیکھ بھال کر لو کہ یہ علم تم نے کہاں سے لیا ہے؟

⑦ صحابہ کے لیے دین کے بنیادی مراجع قرآن و سنت تھے۔ اللہ کی اطاعت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر قرآن میں متعدد آیات ہیں۔

قرآن میں اللہ کی محبت کی نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو بتایا گیا ہے۔[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی مخالفت کرنے والوں کو فتنہ میں مبتلا ہونے یا عذاب الیم سے دوچار ہونے کی وعید سنائی گئی ہے۔[2]

بروایت حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔''[3]

خلفائے راشدین کی سنت کو اپنی سنت کا تسلسل قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''میری سنت کو لازم پکڑو اور میرے بعد آنے والے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو۔''[4]

[1] آل عمران 3:21. [2] النور 24:63. [3] الموطأ للإمام مالك، القدر، حديث: 1594، والمستدرك للحاكم: 1/172. [4] سنن أبي داود، السنة، حديث: 4607، وسنن ابن ماجه، المقدمة، حديث: 42.

صحابہ نے قیاس صحیح کو مانا ہے اور قیاس فاسد کو مسترد کیا ہے۔ قیاس کو اس لیے قبول کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بعض مسائل میں قیاس کا اعتبار کیا ہے، مثلاً: ایک عورت نے سوال کیا: ''میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن حج کیے بغیر وہ فوت ہو چکی ہے، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا تمھاری ماں پر قرض ہوتا تو تم اسے ادا نہ کرتیں؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو پھر اللہ کا قرض اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔''[1]

صحابہ نے بعض باتوں پر اجماع کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ فرما گئے ہیں:

«إِنَّ أُمَّتِي لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَةٍ»

''میری امت گمراہی پر اتفاق نہ کرے گی۔''[2]

جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کا ایک مصحف کی شکل میں جمع کرنا، مرتدین اور مانعینِ زکاۃ سے قتال کرنا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے قرآن سے اجماع کی دلیل معلوم کرنے کے لیے کوئی سو دفعہ قرآن پڑھا یہاں تک کہ سورۂ نساء کی یہ آیت اجماع کی دلیل قاطع بن کر ابھر آئی:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴾

''اور جس شخص کے سامنے واضح شکل میں ہدایت آجائے، اس کے بعد وہ رسول (ﷺ) کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے

[1] صحيح البخاري، جزاء الصيد، حديث: 1852. [2] جامع الترمذي، الفتن، حديث: 2167، وسنن ابن ماجه، الفتن، حديث: 3950.

کی پیروی کرے، تو ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ جانا چاہے
اور ہم اسے جہنم میں ڈالیں گے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

⑧ صحابہ اس حدیث نبوی کے سب سے پہلے مصداق تھے اور یہ حدیث اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ طائفہ منصورہ کا وجود ہر زمانے میں رہے گا۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كَذٰلِكَ»

''میری امت میں قیامت تک ایک جماعت رہے گی جو حق پر قائم رہنے والی ہوگی۔ ان کا ساتھ نہ دینے والے ان کا کچھ نقصان نہ کرسکیں گے حتیٰ کہ اللہ کا امر آ جائے گا اور وہ اسی طرح (غالب) ہوں گے۔''[2]

یہ چند نمایاں اوصاف ہیں جو صحابہ کے دور سے متعلق تھے۔

ہمیں یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ ائمہ اربعہ نے اپنی فطری استعداد کی بنا پر احادیث میں یا فقہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں لیکن جہاں تک قرآن کے ساتھ حدیث کے قول فیصل ہونے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رکھا۔

ائمہ اربعہ کے اقوال ملاحظہ ہوں:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے: ''حدیث اگر صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔''[3]

امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں ایک انسان ہوں، کبھی غلطی کرتا ہوں اور کبھی

[1] النسآء 4:115. [2] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، حديث: 7311، وصحيح مسلم، الإمارة، حديث: 1920. [3] حاشية ابن عابدين: 63/1.

درست بات کہتا ہوں، اس لیے میری رائے کے بارے میں دیکھ بھال کر لو۔ جو کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو اسے چھوڑ دو۔'' [1]

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت واضح ہو جائے تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اسے کسی کے قول کی بنا پر چھوڑ دے۔'' [2]

اس بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر ایک حنفی یا شافعی (وغیرہم) صحیح حدیث پر عمل کرتا ہے اور اپنے امام کا قول چھوڑ دیتا ہے تو وہ اپنے امام کے بتائے ہوئے راستے ہی پر عمل کر رہا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص حدیث کے مقابلے میں اپنے امام کے قول ہی کو حجت گردانتا ہے، وہ اپنے امام کی مخالفت کر رہا ہے۔

حالتِ سفر میں دو نمازوں (جیسے ظہر اور عصر یا مغرب اور عشاء) کو جمع کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل [3] سے اتنا واضح ہے کہ اسے صرف مذہب کی بنا پر نہ ماننا ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ خیال رہے کہ قصر کرنے میں اختلاف نہیں ہے۔

اسی طرح مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف چمڑے کے موزوں پر (جسے عربی میں خف کہا جاتا ہے) بلکہ مطلق جرابوں پر (چاہے سوتی ہوں یا اونی) بھی مسح کیا ہے۔ [4] بعض احناف اس بات کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کرتے ہیں اور جب انھیں یہ بتایا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے وفات سے قبل اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور تساخین (ہر وہ جراب جس سے پیر کو گرم رکھا جا سکے)

[1] جامع بيان العلم: 2/32. [2] إعلام الموقعين: 2/302. [3] صحيح البخاري، الجمعة، حديث: 1106-1108، وصحيح مسلم، صلاة المسافرين وقصرها، حديث: 703،704. [4] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 159.

پر مسح کرنے کی ہدایت کی تھی، تب بھی انھیں اس بارے میں انشراح صدر نہیں ہوتا۔

اختلاف رائے کے ضمن میں فقہ کی کتب اس بات پر شاہد ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دو معتمد شاگردوں امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ نے اپنے استاد سے دو تہائی مسائل میں اختلاف کیا ہے۔ بعد کے فقہاء نے صرف ترجیح دی ہے اور کبھی امام صاحب کی رائے کے مطابق فتویٰ دیا ہے اور کبھی صاحبین کی رائے کے مطابق۔

یہی اصول اگر باقی ائمہ کی آراء کا بھی احاطہ کر لے تو امت کے لیے یقیناً آسانی پیدا ہوگی۔ ائمہ نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا لیکن معاصرانہ چشمک کو ہوا نہ لگنے دی۔

ہم عصر ائمہ ایک دوسرے کا احترام کیا کرتے تھے اور فقہی اختلاف کی بنا پر آپس میں دیواریں نہیں کھڑی کرتے تھے۔

موجودہ زمانے میں بھی شیخ ابن باز، شیخ الالبانی اور شیخ ابن عثیمین رحمہم اللہ کی روشن مثالیں ابھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔ ان علماء کا بعض مسائل میں اختلاف ہوا لیکن ایک دوسرے کے احترام و اکرام میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اہل حدیث اپنے مسلک کے اعتبار سے ائمہ کرام اور ان کے تلامذہ کے طریق پر ہی قائم ہیں کہ جس کی ابتدا دور صحابہ سے ہوگئی تھی۔ ان کے مسلک کے بارے میں چند نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

- قرآن و حدیث دین کے بنیادی مآخذ ہیں، قیاس اور اجماع دونوں حجت ہیں۔
- کسی آیت کی تفسیر و تعبیر میں اختلاف ہو تو اس صحابی کا قول لے لیا جائے جس پر مزید شواہد موجود ہوں۔
- كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ کی روشنی میں بدعات کی بیخ کنی کی جائے نہ کہ ان کی سرپرستی۔

- تمام ائمہ اہل سنت قابل احترام ہیں۔ ان کے علم سے استفادہ کیا جائے اور ان کے اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دی جائے جس کے دلائل قرآن و حدیث سے ثابت ہوں۔
- ائمہ نے اصول فقہ کے نام سے ایسے اصول وضع کیے ہیں جن سے مسائل کی تنقیح میں مدد ملتی ہے لیکن کسی ایسے اصول سے حدیث نبوی کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔
- رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے بعد کسی ایک شخص (امام) کی تقلید کو لازم قرار دینا، دین میں اضافہ ہے۔ دین رسول اللہ ﷺ پر مکمل ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ کا قول حرفِ آخر ہے۔
- اجتہادی مسائل میں ائمہ کے اجتہادات سے یقیناً فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اگر ان کی کسی رائے کو اختیار کیا جائے تو اسے شریعت کا درجہ حاصل نہیں ہوگا کہ جس سے اختلاف کرنا ناجائز ہو۔
- اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [1] آج کل کے دور میں فرقوں کی کثرت کی وجہ سے ایسا وصفی نام، جس کی تائید قرآن و حدیث سے ہوتی ہو، رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تاکہ مخاطب کو معلوم ہو سکے کہ آپ کس بات کے داعی ہیں۔ جس طرح قرآن میں یہود و نصاریٰ کے لیے اہل کتاب کا لفظ آیا ہے، حالانکہ وہ اپنے دور میں مسلمان ہی تھے۔ اور جیسے ایک حدیث میں قراء کو یا أهل القرآن کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ [2] اسی طرح اگر قرآن و سنت کی طرف بلانے والے اپنے آپ کو اہل الحدیث کہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ حدیث کا لفظ

[1] الحج 22:78 [2] سنن أبي داود، الوتر، حديث: 1416، وجامع الترمذي، الوتر، حديث: 453.

قرآن اور قول رسول ﷺ دونوں پر حاوی ہے، جیسے فرمایا:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾

''اللہ سے زیادہ اور کس کی بات سچی ہو سکتی ہے۔''[1]

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ﴾

''وہ اللہ ہے جس نے بہترین بات (یعنی قرآن) اتاری۔''[2]

صحابہ میں سے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے تو یہ لفظ اپنے شاگردوں کے لیے استعمال کرتے ہوئے فرمایا: «إِنَّكُمْ خُلُوفُنَا وَأَهْلُ الْحَدِيثِ بَعْدَنَا»

''تم ہمارے خلف ہو اور ہمارے بعد اہل حدیث ہو۔''[3]

- اہل حدیث چونکہ تمام ائمہ سے استفادہ کرنے کے قائل ہیں، اس لیے ان کا ذہنی افق وسیع اور ان کی استعداد علمی نمایاں رہی ہے۔ اللہ کی کتاب کے بعد اصح ترین کتاب کا لقب امت نے امام بخاری رحمہ اللہ کے مجموعہ (صحیح بخاری) کو دیا ہے، جو کہ زمرہ محدثین کے سرخیل ہیں۔

اہل حدیث اگر ابن حزم رحمہ اللہ سے استفادہ کرتے ہیں تو امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہما اللہ کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اس دور میں ان کی کتب سے جو علم پھیلا ہے، خود ان کے اپنے زمانے میں انھیں اتنی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

- اہل حدیث تصوف کے مختلف طریقوں میں بیعت ہونے کے بجائے تزکیہ نفس کے لیے قرآن و حدیث کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ متقی اور پرہیز گار علماء و مشائخ کی صحبت اختیار کرنے اور ان کے علم و تقویٰ کی خوشہ چینی کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں۔

[1] النسآء 4:87. [2] الزمر 39:23. [3] شعب الإيمان: 2/275، وشرف أصحاب الحديث، ص: 21.

بدعات کے خلاف اصلاحی تحریکات ہوں یا اعدائے اسلام کے خلاف جہاد، اہل حدیث نے دونوں تحریکوں میں اپنا پورا وزن ڈالا ہے۔ ہندوستان میں سید احمد شہید و سید اسماعیل شہید ﷭ کی تحریک جہاد اور جزیرۃ العرب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب ﷫ کی اصلاحی تحریک اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تلك عشرة كاملة.

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ اکیسویں صدی میں اگر غور سے مسلمانوں کی حالت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ فکر اہل حدیث غیر شعوری طور پر علماء کی صفوں میں گھر کر چکا ہے۔ بلاد اسلامیہ میں جابجا فقہی کونسلیں قائم ہو چکی ہیں جن میں نت نئے مسائل پر بحث مباحثہ کیا جاتا ہے اور تمام فقہاء بشمول ابن حزم ﷫ کی آراء تک کو لیا جاتا ہے۔

پچھلی صدی میں گو مذہب سے تعصب عروج پر تھا لیکن مولانا اشرف علی تھانوی ﷫ نے (الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة) لکھ کر اپنے ہم مسلک علماء کے سامنے دوسرے مذاہب سے استفادے کا راستہ کھول دیا۔ اس کتاب میں کئی مسائل پر بحث کی گئی ہے لیکن مرکزی مضمون اس عورت کی حالت سے متعلق ہے جس کا شوہر مفقود ہو کیونکہ حنفی مذہب کے مطابق ایسی عورت اس وقت تک اپنے نکاح سے فارغ نہیں سمجھی جائے گی جب تک کہ مفقود شوہر اپنی طبعی عمر کو نہ پہنچ جائے، اس لیے مولانا تھانوی ﷫ نے مالکی مذہب کا قول لینے کا عندیہ ظاہر کیا جس کی بنیاد حضرت عمر ﷛ کا یہ فتویٰ ہے کہ ایسی عورت صرف چار سال انتظار کرے اور اس کے بعد قاضی اس کے نکاح کو فسخ کر سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے مذہبی جمود کے دور میں یہ وقت بھی آیا ہے کہ حنفی شافعی کے پیچھے اور شافعی حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہ تھا۔ خود حرم مکہ میں چاروں مذاہب کے

نام پر چار مصلے تھے۔ موجودہ سعودی حکومت کی حسنات میں سے ایک عظیم نیکی یہ بھی ہے کہ حرم میں اب صرف ایک جماعت ہوتی ہے جیسا کہ اسلام کے زرّیں دور میں ہوتی رہی ہے۔ اہل حدیث امت کی اسی وحدت کے داعی ہیں۔

بشری کمزوریوں کی بنا پر ان میں بہت سی خامیاں دیکھی جاسکتی ہیں لیکن جہاں تک ان کے مسلک اور ان کی دعوت کا تعلق ہے، اس کے ڈانڈے صحابہ کی جماعت سے ملتے ہیں۔ ہم اپنی کوتاہی، خامی اور بے بضاعتی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے ہیں:

أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ   لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا

''میں نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہوں گو ان میں سے نہیں ہوں، شاید کہ اللہ مجھے بھی نیکی کی توفیق عطا فرما دے۔''

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِينَ.

''علمائے مسلمین کا عالمی اتحاد'' پچھلے سال 11 جولائی 2004ء کو قائم کیا گیا تھا۔ تاسیسی اجلاس لندن میں منعقد ہوا تھا، جس میں برطانیہ اور عالم اسلام سے تین سو کے قریب مندوبین شریک ہوئے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ امت مسلمہ کو پیش آمدہ مسائل میں علماء رہنمائی دے سکیں اور کسی بھی داخلی یا خارجی دباؤ کے بغیر کلمہ حق کہتے رہنے کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ اتحاد کے اولین داعی شیخ محمد یوسف قرضاوی کو بالاتفاق صدر منتخب کیا گیا اور ان کی معاونت کے لیے تین نائب صدور کا انتخاب عمل میں آیا، جو امت مسلمہ میں موجود تین فقہی اور عقائدی رجحانات کی نمائندگی کر رہے تھے، اور وہ تھے: موریتانیہ کے سابق وزیر عدل اور ایک علمی شخصیت شیخ عبداللہ بیہ، تقریب بین المذاہب کی عالمی مجلس کے روحِ رواں ایران کے آیت اللہ محمد علی تسخیری اور سلطنت عمان کے شیخ احمد بن حمد خلیلی۔ مصر کے ایک مشہور وکیل اور صحافی جناب سلیم العواء کو سیکرٹری جنرل کا اعزاز دیا گیا۔ مندوبین میں سے بیس افراد پر مشتمل مجلسِ امناء (ٹرسٹیز کونسل) ترتیب دی گئی، جن میں مذکورہ پانچ افراد کے علاوہ مندرجہ ذیل افراد شامل ہیں:

شیخ فیصل مولوی (لبنان)، ڈاکٹر احمد العال (مصر)، شیخ عبداللطیف المحمود (بحرین)، ڈاکٹر احمد الریسونی (مراکش)، شیخ خالد المذکور (کویت)، ڈاکٹر علی قرہ داغی (قطر)، شیخ عبدالرحمٰن آل محمود (قطر)، شیخ صہیب حسن (برطانیہ)، شیخ احمد لیمو (نائیجیریا)، ڈاکٹر جمال بدوی (کینیڈا)، شیخ عصام الدین بشیر (سوڈان)، ڈاکٹر محمد ہیثم الخیاط (شام) ڈاکٹر محمد عمر الزبیر (سعودی عرب)، ڈاکٹر محمد ہدایت (انڈونیشیا)، ڈاکٹر عمار الطالبی (تیونس)، ڈاکٹر بسام الصباح (شام)۔

اس کے ساتھ ساتھ تیس افراد پر مشتمل مستشارین (ایڈوائزرز) کا بورڈ بھی تشکیل دیا گیا۔ اتحاد کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے مجلس اُمناء کے اب تک دو اجلاس بیروت میں ہو چکے ہیں۔ پہلا اجلاس نومبر 2004ء میں اور دوسرا اجلاس مئی 2005ء کو منعقد ہوا۔

مؤخر الذکر اجلاس میں تقریباً ستر صفحات پر مشتمل ''میثاق الاسلامی'' کو متعارف کرایا گیا، جسے اتحاد کے منشور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اراکینِ کونسل کو میثاق کی ایک ایک شق پر بحث کرنے کے لیے کافی وقت درکار تھا، اس لیے طے کیا گیا کہ ایک ماہ کے اندر اندر تمام اراکین، سیکرٹریٹ کو اپنی آراء، تجاویز اور تصحیحات سے آگاہ کر دیں گے تاکہ اس میثاق کو جلد از جلد آخری شکل دی جا سکے۔

اجلاس کے دوران میں کئی انتظامی امور پر بحث کی گئی، چند کمیٹیوں کی رپورٹس گوش گزار کی گئیں اور پچھلی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا۔

یہاں اختتامی بیان کے مندرجات پیش کیے جاتے ہیں جس میں حالاتِ حاضرہ سے متعلق اکثر حالات کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔

اختتامی بیان: اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی ﷺ پر درود و سلام کے بعد عرض ہے کہ علمائے مسلمین کے عالمی اتحاد کی مجلسِ اُمناء نے اپنے حالیہ اجلاس منعقدہ بیروت (لبنان) میں ان حالات کا تفصیلی جائزہ لیا جن سے امت مسلمہ آج کل دو چار ہے، اور بحیثیت اہل علم اور بر بنائے نصیحت اور رہنمائی امت کے تمام طبقات اور خاص طور پر حکام اور عوام کے سامنے ان امور کا بیان کرنا ضروری سمجھا۔

علمائے مسلمین کا عالمی اتحاد امت اسلامیہ کو انتہا پسند صیہونی یہودیوں کی جانب سے مسجد اقصیٰ کو لاحق ان خطرات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے جو ان جنونی شر پسندوں کے عبادت کے بہانے زبردستی مسجد میں داخل ہونے اور وہاں قابض ہو جانے کی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں اور جس کے نتیجے میں وہ اپنے ناپاک ارادوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مسجد اقصیٰ کو شہید کر کے اس کے کھنڈروں پر اپنے مزعومہ ہیکل کی تعمیر کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

- اتحاد، بیت المقدس سے متعلق ان تنظیموں کے اس بیان کی بھرپور تائید کرتا ہے کہ اس نئی صیہونی سازش سے مسجد اقصیٰ کو بچایا جائے اور اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ مسجد اقصیٰ کی حفاظت کرنا تمام مسلمانوں، تنظیموں، حکومتوں اور اقوام کا فرض ہے بلکہ مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے ہر مسلمان کا دامے درمے قدمے سخنے اٹھ کھڑا ہو جانا اب فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔
- اتحاد، امت کے تمام علماء، مبلغین، مفکرین اور اہل دانش سے اپیل کرتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں، امت مسلمہ کو مسجد اقصیٰ کو لاحق اس خطرے سے اچھی طرح باخبر کریں اور اس گھناؤنی صیہونی سازش کا یک جسم و جان ہو کر مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں۔

- اتحاد، ان تمام ممالک اور عالمی تنظیموں سے جو اس مسئلے سے تعلق رکھتی ہیں، اپیل کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق اور ان کے متبرک مقامات پر کسی قسم کے ظلم میں شریک نہ ہوں کیونکہ یہی حق کا تقاضا ہے اور اسی طرح ان کے اپنے مفادات کا بچاؤ بھی ہوسکتا ہے اور عالم اسلام سے ان کے تعلقات بھی برقرار رہ سکتے ہیں۔
- جس طرح سے فلسطینی انتہائی بہادری سے اپنے موقف کا دفاع کررہے ہیں، وہ ان بہترین اور قابل تکریم معرکوں کی یاد دلاتا ہے جو ماضی اور حال میں اس امت کا شعار رہا ہے۔ ان کا یہ دفاع ناجائز قبضے کے مقابلے میں ایک شرعی اور قانونی حق بنتا ہے، جسے نہ صرف اسلام بلکہ ساری دینی شریعتیں جائز قرار دیتی ہیں اور جس کے جائز ہونے کا اقوام متحدہ کی بیشتر قراردادوں میں بھی ذکر ہے۔ اب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ حسب استطاعت ان کی امداد کرے۔ فلسطینیوں کی مزاحمتی تحریک اس تعریف و تحسین کی مستحق ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرتے وقت اس نے خوب معاملہ فہمی اور بردباری کا مظاہرہ کیا ہے اور فلسطینیوں کی صفوں میں داخلی یا خارجی طور پر کسی قسم کی تفرقہ بازی سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔
- اتحاد، مزاحمتی تحریک کے تمام فریقوں کو شاباش دیتا ہے کہ انھوں نے آپس میں خونریزی کو حرام قرار دے رکھا ہے اور مسئلہ فلسطین کے ضمن میں وطن اور اسلام کے مسلمہ اصولوں کی پاسداری کی ہے۔
- اتحاد، اللہ کے حکم سے فتح اور مکمل آزادی کے حصول تک ان کے اس موقف پر ثابت قدم رہنے کے لیے دعا گو ہے۔
- اتحاد، امت اسلامیہ کے تمام افراد کو اس بات کی طرف دعوت دیتا ہے کہ ہر طرف

سے ہونے والی یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ خوب سے خوب تر استعداد پیدا کریں کہ یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ ﴾ ''ایمان والو اپنے بچاؤ کا سامان مہیا کرو۔''[1]

دشمنانِ اسلام ہر طرح سے اسلام کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ اسلامی شعائر، نشانات اور متبرک مقامات کو کسی سبب یا بغیر سبب کے نشانہ تضحیک بناتے رہیں۔ انھی دنوں عالمی اور امریکی میڈیا نے گوانتا ناموبے میں قرآن کریم کی بے حرمتی کے واقعات پیش کیے ہیں، جس سے صراحتاً مسلمانوں کی مقدس ترین متاع کی بے حرمتی، تمام دنیا میں مسلمانوں کے جذبات میں اشتعال اور ان اخلاقی اقدار کی توہین کی غمازی ہوتی ہے جس کے بارے میں دو صاحب عقل اختلاف نہیں کر سکتے۔

- اتحاد، امریکی ذمہ دار افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس معاملے کی فوری تحقیق کی جائے، جلد از جلد اس تحقیق کے نتائج کا اعلان کیا جائے، اس مجرمانہ فعل کے مرتکب حضرات کو قرار واقعی سزا دی جائے اور اس افسوسناک واقعے پر تمام مسلمانوں سے معافی مانگی جائے۔

- اتحاد، ان کوششوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو عالم اسلامی کے مختلف ممالک میں سرکاری اور عوامی طور پر اس واقعے کی مذمت کے لیے کی گئیں۔ اتحاد امریکی سپاہ کی ان حرکتوں کی بھی شدید مذمت کرتا ہے جو انھوں نے گوانتا ناموبے اور ابوغریب کی جیلوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے ضمن میں کی ہیں اور ان انسانیت سوز حرکتوں کا ارتکاب کرنے والوں کا مؤاخذہ کرنے اور انھیں سزا دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

[1] النسآء 4:71.

* اتحاد، اقوام متحدہ کی حقوق انسانیت سے متعلق ذیلی کمیٹی کی اس تاریخی قرار داد کو خوش آمدید کہتا ہے جس میں اسلاموفوبیا کے ضمن میں کی گئی تمام کارروائیوں کا مقابلہ کرنے کی شدید ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے اور اس نسلی اور گروہی ظلم و بہیمیت کی مذمت کی گئی ہے جو اس جنگ کا حصہ بن چکا ہے جسے مغربی ممالک نے دہشت گردی کو مٹانے کی آڑ میں مسلمانوں پر مسلّط کیا ہوا ہے۔

اس موضوع کو اٹھانے پر اتحاد تنظیم اسلامی کانفرنس (او آئی سی) کے قابل تکریم موقف کی تعریف کرتا ہے اور ان اسلامی ممالک کی بھی جنھوں نے یہ موقف اپنایا اور ان کی اس بات کی بھی تائید کرتا ہے کہ دین اسلام کو اس طرح پیش کرنا کہ جس میں شدت پسندی کا دخل ہو اور جس کے ڈانڈے دہشت گردی سے جوڑے جا سکیں، دین اسلام کی صحیح تصویر کو بگاڑنے اور نفرت کی ثقافت کو اجاگر کرنے کے مترادف ہے اور اس کی بنا پر مسلمان مزید زیادتیوں کا نشانہ بنے ہیں اور ان کی عبادت گاہیں اور قابل احترام جگہیں پچھلے دنوں بار بار غارتگری کا نشانہ بنتی رہی ہیں۔

* اتحاد، امریکہ، کینیڈا اور یورپین یونین ممالک کے اس قرار داد سے اس بنا پر موافقت نہ کرنے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ یہ قرار داد بقول ان کے اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان اور مذہبی گروہوں کا احاطہ نہیں کر پائی، حالانکہ وہ بھول جاتے ہیں کہ ''سامیت دشمنی'' (anti-semitism) کے نام پر وہ خود ایک جانبدارانہ موقف اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس طرح ایک دُہرے معیار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

* اتحاد، پوری دلچسپی کے ساتھ پوپ بینیڈکٹ XVI کے مختلف ادیان کے مابین مذاکرات کے اصول کو اپنانے سے متعلق آگاہ ہے اور ہر اس شخصیت کو خوش آمدید کہتا

ہے جو باہمی بات چیت کی حامی ہو اور ہر ممکن وسیلے کو بروئے کار لا کر بنی نوع انسان کے مابین نفرت و کراہیت کو دور کرنے کے لیے کوشاں ہو اور یورپ کے ان کیتھولک کارڈینلز کی دعوت کو بھی خوش آمدید کہتا ہے جس میں اسلام اور عیسائیت کو پیش آمدہ تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو مستقبل کے حلیف قرار دیا گیا ہے میں سب سے بڑا چیلنج وہ موجودہ طرز حیات ہے جو نہ صرف مادیت میں پوری طرح غرق ہے بلکہ ان تمام اخلاقی اقدار اور ضابطوں سے بھی مادر پدر آزاد ہے جو کہ تمام ادیان کے نزدیک مسلمہ اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اتحاد ان قابل احترام کارڈینل حضرات کی اس رائے کو قابل قدر نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ مل کر کام کرنا نہ صرف یورپ میں بلکہ تمام عالم اسلام میں امن قائم کرنے میں بڑا مددگار ثابت ہوگا۔

- اتحاد، بین الاقوامی کانفرنس کے اتحاد اسلامی کے موضوع پر تہران (اسلامی جمہوریہ ایران) میں منعقدہ اٹھارھویں اجلاس کے اختتامی بیان کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور خاص طور پر اس تجویز کو کہ بین الاقوامی سطح پر مسلم مفکرین کے مابین تعلقات اور تعاون کے طریقوں کو مزید مضبوط بنایا جائے تا کہ امت کے مسائل کا حل نکالا جاسکے، مسلم ممالک کے ذرائع نشر و اشاعت کی مناسب رہنمائی کی جاسکے اور جدید سے جدید معلومات کا ساتھ دینے کے لیے ان کے معیار کو بلند کیا جاسکے۔ اسلام کے خلاف میڈیا میں پھیلائے گئے افکار کا منہ توڑ جواب دیا جاسکے اور ایسے ہی وہ کانفرنس کی اس تجویز کو بھی خوش آمدید کہتا ہے کہ عالم اسلام میں جہاں کہیں بھی غیر ملکی قبضے کے خلاف اسلامی مزاحمتی تحریکیں جاری ہیں، ان کی مدد کی جائے اور تمام ایسے مخلص حضرات کے

نام اس دعوت کو بھی سراہتا ہے کہ وہ اس منفی طرزِ عمل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کریں جس میں اسلامی تحریکات مبتلا ہو سکتی ہیں اور جس میں فکری اور عملی انتہا پسندی اور بلا منصوبہ بندی عمل بھی شامل ہے کہ جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

- اتحاد، عراق اور فلسطین میں قابض فوجوں کی ان تمام گھناؤنی حرکات کی شدید مذمت کرتا ہے کہ جن کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، جو تمام معاہدوں اور خاص طور پر جنیوا کنونشن کی کھلی خلاف ورزی پر مشتمل ہیں اور ایسے ہی ان کے ان کرتوتوں کی بھی مذمت کرتا ہے جن میں بین الاقوامی قانون کے علی الرغم ممنوعہ اسلحے کا استعمال، گھروں، پبلک عمارتوں، مساجد، گرجا گھروں اور دیگر عبادت گاہوں کو نشانہ بنانا، ملک کے بنیادی ڈھانچے کو تباہ کرنا، فصلوں اور حیوانات کو برباد کرنا، مساجد کے اندر زخمیوں کو تہ تیغ کرنا، مصیبت زدہ افراد تک مدد پہنچنے میں حائل ہونا، ہسپتالوں پر اندھا دھند بمباری کرنا اور طبی امداد دینے والوں کو اپنے انسانی فرائض کی بجا آوری سے روکنا شامل ہیں۔
- اتحاد، عراق کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو باہمی رسہ کشی اور خانہ جنگی کے فتنے سے بچاؤ کے لیے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ مناسب وسائل بروئے کار لاتے ہوئے ارضِ عراق کو قابض فوجوں سے پاک کرنے کے لیے یکجا مزاحمت کی جا سکے جو کہ ان تمام اقوام کا دینی اور قانونی حق ہے جو غیر ملکی قبضے کا شکار ہو چکی ہوں اور یہ وہ حق ہے جسے بین الاقوامی معاہدات اور اقوام متحدہ کی آشیر باد بھی حاصل ہے۔

عراقی عوام کا عمومی طور پر اور وہاں کے مفکرین اور علماء کا خصوصی طور پر یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان گروہوں سے باخبر رہیں جو اسلام اور اہل اسلام کو اور مزاحمتی تحریک کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔ قومی سطح پر مزاحمتی تحریک کو ایسی تمام کوششوں کی مذمت کرنی

چاہیے اور سامراج کے ایجنٹوں سے خبردار کرنا چاہیے۔ اتحاد تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ عراقی عوام کی دامے درمے قدمے سخنے پوری پوری مدد کریں اور ناجائز قبضے کو جلد از جلد ختم کرانے اور ارضِ عراق کے ایک وحدت میں پروئے جانے کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں ان کی ہمنوائی کریں۔

❁ اتحاد، امت کے تمام فعال عناصر کے درمیان مکمل مصالحت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ وہ عناصر ہیں جن کا تعلق عوام سے بھی ہے اور حکام سے بھی، ان میں علماء اور مبلغین بھی شامل ہیں اور مختلف جماعتیں اور تنظیمیں بھی۔ بایں ہمہ انسانی حقوق کی ضمانت، آزاد ماحول کا قیام، باہمی اشتراک میں وسعت اور اقوال و اعمال میں پر امن طریق اپنانا اتحاد کے بنیادی دعاوی میں شامل ہیں۔

❁ اتحاد، اصلاح امت، دعوت الی اللہ اور امت کے دینی اور وطنی مسلمہ قواعد اور اصولوں کے پابند ہونے اور ان کا دفاع کرنے میں علماء کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ ان کے فعال ہونے سے امت اس قابل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کو صحیح طریق سے انجام دے سکے اور ان لوگوں کا راستہ کاٹ سکے جو اس کی خانہ بربادی کے لیے کوشاں ہیں۔

❁ اتحاد اس ضروری امر کو انتہائی تاکید کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی ممالک کو اپنے سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی نظام اور اپنے تعلیمی اور تربیتی مناہج کی اس طرح اصلاح کرنی چاہیے کہ ان کے مآخذ امت کے مسلمہ قواعد اور اصول ہوں اور تمدنی خصوصیات اور ثقافتی اقدار کا لحاظ رکھا گیا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے تاریخی و تشکیلی مراحل اور دینی و وطنی اقدار پر آنچ نہ آتی ہو اور نہ ان سے کسی بیرونی ہدایتکاری کی بُو آتی ہو۔

● اتحاد، اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ساری کی ساری امت چاہے وہ رعیت ہو یا حکومت، جسد واحد کی طرح ان تمام حکومتوں پر دباؤ ڈالے جو اپنے مسلمان شہریوں پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہیں اور جو آئے دن اسلامی شعائر اور مسلمانوں کے احساسات کی توہین کرتی رہتی ہیں اور جن میں خاص طور پر چیچنیا (روس)، مقبوضہ کشمیر، برما، تھائی لینڈ، فلپائن اور چند دوسرے ممالک سرفہرست ہیں، تاکہ ان ملکوں کے مسلمان شہری اپنے حقوق کامل طریق پر حاصل کرسکیں جن میں آزادیِ رائے، دینی شعائر کی ادائیگی اور مسلم اکثریتی علاقوں میں حق رائے دہی برائے آزادی شامل ہیں۔

● اتحاد، لبنانی عوام سے ان اندرونی اور بیرونی سازشوں کے مقابلے کے لیے ایک صف میں کھڑا ہونے کی اپیل کرتا ہے جو اس کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے اور اس کی قوت کو زک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں اور انھیں اس قابل تعریف لبنانی مزاحمتی تحریک کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑنے ہونے کی دعوت دیتا ہے جس نے صیہونی دشمن کے چھکے چھڑا دیے اور ارض لبنان کے بڑے حصے کو آزاد کرا لیا۔ اتحاد کی نظر میں اس وقت تمام لبنانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ گروہی انتشار چاہنے والوں اور داخلی طور پر فتنے کھڑا کرنے والوں کے سامنے پوری قوت کے ساتھ سینہ سپر ہو جائیں تاکہ لبنان اہل لبنان کے لیے ایک شریفانہ اور آزاد وطن اور تمام اہل عرب کے لیے ایک محفوظ قلعہ کا روپ دھار سکے۔

صدر اتحاد

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

محرم 1423ھ / اپریل 2002ء کے اواخر میں رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے اپنی چوتھی عالمی کانفرنس مکہ مکرمہ میں منعقد کی جس میں اطراف عالم سے پانچ سو کے قریب علماء، قائدین اور سیاستدانوں نے شرکت کی۔ موضوع سخن ''اسلام اور عالمگیریت (گلوبلائزیشن)'' چنا گیا تھا۔ کانفرنس کے افتتاحی اور اختتامی اجلاسوں کے علاوہ نو اجلاس ترتیب دیے گئے تھے جس میں کانفرنس کے مرکزی موضوع کے علاوہ کئی دوسرے موضوعات کو جگہ دی گئی تھی۔

کانفرنس ایسے وقت منعقد ہوئی جبکہ فلسطین میں مسلمانوں کا خون بے دردی سے بہہ رہا ہے، اس لیے پہلے سے ترتیب شدہ پروگرام میں معمولی سی تبدیلی کے بعد ایک اجلاس صرف بیت المقدس کے لیے وقف کیا گیا۔ اتفاق سے یہ وہی اجلاس تھا جس میں اصلاً مجھے اور دو دوسرے مندوبین کو ''دیار مغرب میں مسجد کا کردار'' پر اپنے اپنے مقالات کا خلاصہ پیش کرنا تھا لیکن اس بروقت تبدیلی کی بنا پر مجھے اس مقالے کی تلخیص پیش کرنے کا موقع تو نہ مل سکا، تاہم اپنے مقالے کو مطبوع مقالات کے ضمن میں دیکھ کر اطمینان حاصل ہوا۔

ہر اجلاس میں مقالات کی تلخیص کے بعد حاضرین کو دو یا زیادہ سے زیادہ تین منٹ کے لیے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جاتا رہا جس میں بیشتر مندوبین اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کرتے رہے۔ اس مختصر سے مضمون میں کانفرنس کی ساری کارروائی کا احاطہ تو مقصود نہیں ہے بلکہ اصلاً کانفرنس اور اس کے بعد اقامت مکہ کے چند تاثرات کا اظہار مقصود ہے۔

قاری شیخ عبداللہ بصفر کی مسحور کن تلاوت سے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا اور پھر اس اجلاس سے رابطہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، جمہوریہ مصر میں جامعہ ازہر کے چانسلر سید طنطاوی، مالدیپ کے سربراہ مامون عبدالقیوم، سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل شیخ اور امیر مکہ شہزادہ عبدالمجید بن عبدالعزیز آل سعود نے خطاب کیا۔

یہ بات باعث اطمینان رہی کہ ان تمام حضرات کی تقاریر میں فلسطینی عوام پر یہودیوں کی مسلط کردہ جنگ کا تذکرہ نمایاں رہا۔ عالم اسلام کی جانی پہچانی شخصیت اور قطر میں مقیم مصری عالم ڈاکٹر شیخ محمد یوسف قرضاوی نے مسئلہ فلسطین کو نمایاں کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ایک موقع پر جب بوسنیا کے رئیس العلماء والمشائخ جناب مصطفیٰ سیرچ نے سابق صدر بوسنیا جناب عزت بیگووچ کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم بوسنیا کے تلخ تجربے کی روشنی میں یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ عربوں کو اسرائیل سے صلح و آشتی کا راستہ اختیار کر لینا چاہیے تو شیخ یوسف قرضاوی فوراً مائیک پر آئے اور گویا ہوئے:

"میں ابتدا میں کہہ چکا ہوں کہ عالم اسلام کے اس بھرپور اجتماع میں سیاستدان

ضرور شریک ہوں لیکن سیاست کا چولا اتار کر اور صرف ایک مفکر یا عالم کی حیثیت سے، لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جناب عزت بیگووچ نے اپنے اس موقف میں ایک سیاستدان کا روپ اختیار کیا ہے۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ فلسطینیوں پر جنگ مسلط کی گئی ہے اور بفحوائے قول ربانی:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾

''قتل وقتال تم پر فرض کیا گیا ہے، حالانکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔''[1]

اس جنگ میں ثابت قدم رہنا ہی مطلوب ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ دشمن آپ کو مرنے مارنے پر تلا ہوا ہو اور آپ امن و آشتی کا نعرہ بلند کرتے رہیں۔''

جناب مصطفیٰ سیرچ فوری جواب تو نہ دے پائے لیکن اگلے اجلاس میں انھوں نے وضاحت کی کہ میرے ممدوح جناب شیخ قرضاوی، عزت بیگووچ کی بات صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ہمارا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ٹینکوں کا مقابلہ پتھروں سے نہیں کیا جاسکتا، اس لیے فی الحال ہمارے پاس دوسرا کوئی متبادل حل موجود نہیں ہے لیکن ہم جہاد سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں اور میں مفتی فلسطین شیخ عکرمہ صبری سے درخواست کروں گا کہ وہ میرا نام مجاہدین کی فہرست میں لکھ دیں اور جب بھی وہ آواز دیں گے، میں حاضری کے لیے بے تاب رہوں گا۔

یمن کے ایک درویش منش عالم شیخ عمر سیف اپنی گرجتی برستی آواز میں جہاد کی

[1] البقرة 2:216.

دعوت دے رہے تھے اور واشگاف الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ یہ سب ٹینک، توپیں اور جہاز جن کے انبار ہم اپنے اپنے ملکوں میں لگا رہے ہیں، کس لیے ہیں؟ کیا اپنوں کو دبانے کے لیے یا دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے؟ انھوں نے عالم اسلام کی بے حسی، عرب اور مسلم ممالک کی جہاد سے ہچکچاہٹ اور امریکہ اور اس کے حواریوں کی دیدہ دلیری کی جی بھر کر مذمت کی۔ ان کے الفاظ تازیانہ بن کر دل و دماغ کے تاروں کو جھنجوڑ رہے تھے لیکن فغانِ درویش صدا بصحرا ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

ایران کے آیت اللہ تسخیری نے بھی اعدائے اسلام کی ان مذموم حرکتوں کو للکارا جو بیت المقدس کے تقدس اور اہل فلسطین کی آبرو کو داغ دار کرنے کے لیے اسرائیل کے ہم نوا بن چکے ہیں۔ گجرات میں مسلمانوں پر جو قیامت بیت گئی، اس کا ذکر کسی مقرر کی زبان پر نہ آیا تھا، اس لیے راقم الحروف نے دو منٹ کے مختصر وقت میں یہ الفاظ عربی جامہ میں منتقل کر کے حاضرین کے گوش گزار کر دیے:

''حمد و ثنا کے بعد! کوئی شک نہیں کہ مسئلہ فلسطین ہر مسلمان کا اپنا مسئلہ ہے جس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں لیکن کلام الٰہی میں یہود کی عداوتِ مسلمین کے ساتھ ساتھ مشرکین کی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا﴾

''ایمان والوں سے سب سے زیادہ دشمنی رکھنے والوں میں تم یہود کو پاؤ گے اور مشرکین کو۔''

اس دور کے مشرکین جو سر زمین ہند میں بتوں کے پجاری ہیں، اس آیت کی کھلی

تفسیر ہیں۔

شرکائے کانفرنس! چشم تصور سے دیکھیے کہ خونخوار فسادیوں کا ایک ہجوم ہے جو ایک گھر سے میاں بیوی کو کھینچ کر باہر لاتا ہے اور ان کے بچوں کے سامنے انھیں پہلے مٹی کے تیل میں نہلا دیا جاتا ہے اور پھر ان کے بدنوں کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ مرد و عورت کو انتہائی سفاکی کے ساتھ زندہ جلا دیا گیا جو کہ لمحوں میں کوئلے کا ڈھیر بن گئے اور یہ قصہ صرف ایک مرد و زن کا نہیں بلکہ دو ہزار سے زائد ان مقہور و مظلوم انسانوں کا ہے جنھیں سرزمین گجرات پر موت اس عالم میں آئی کہ کسی کو آگ کھا گئی، کوئی تلوار سے گھائل ہوا، کوئی بندوق کی گولی کا شکار ہوا اور کوئی کنویں کی نذر ہوا۔

دوسری طرف مسلم کشمیر میں چھ لاکھ سے اوپر بھارتی فوج مسلمانوں کے سینوں پر دندنا رہی ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی فدایانہ کارروائی ہوتی ہے، فوجی نواحی آبادی پر بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور پھر بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں ان کا نشانۂ انتقام بنتے ہیں۔

رابطہ عالم اسلامی چونکہ ایک اسلامی پلیٹ فارم ہے، اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ رابطہ کی طرف سے مختلف ممالک کے افراد پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا جائے جو خاص طور پر گجرات کا دورہ کرے اور عالم اسلام کو حقائق سے آگاہ کرے تاکہ ہم دوست اور دشمن کی پہچان کرسکیں اور یقیناً اللہ انھی کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ والسلام!''

مقام مسرت ہے کہ اگلے دن اجلاس میں برطانیہ کے لارڈ نذیر احمد اور مسلم کونسل برطانیہ کے سیکرٹری جنرل یوسف بھائی لوک نے بھی اپنے اپنے خطاب میں اس موضوع

کی طرف توجہ دلائی۔ آزاد کشمیر کے مولانا عبدالرشید ترابی نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں حاضرین کو حقائق سے آگاہ کیا۔

کانفرنس کے موضوعات: کانفرنس کے مرکزی مضمون سے صرف دو اجلاس متعلق رہے، ایک ''عالمگیریت کے چیلنج'' اور دوسرا ''میڈیا اور عالمی نظام''۔ باقی اجلاسوں میں مختلف دوسرے موضوعات کو موضوعِ سخن بنایا گیا، جیسے: عصر حاضر میں مسلم خاندان، اتحاد عالم اسلامی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے فرائض، یورپ میں مسلمانوں کے احوال، مسلم اقلیات، دعوتِ اسلام کی آفاقیت، دہشت گردی اور اسلام کے خلاف حملوں کی نوعیت۔

نامور شرکاء: مقالات پیش کرنے والے حضرات میں سے اکثر عالم اسلام کے جانے پہچانے علماء ومفکرین تھے، قابل ذکر یہ ہیں: متعدد فقہی وعلمی کتب کے مصنف ڈاکٹر وہبہ مصطفی زحیلی، ندوۃ العلماء کے موجودہ روح رواں شیخ محمد رابع ندوی، مصر کے معروف محقق ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق، اٹلی کے نومسلم سفیر ماریو شالویا، موریطانیہ کے فقیہ ڈاکٹر عبداللہ بن بیہ، مفتی فلسطین شیخ عکرمہ صبری، سوڈان کی وزارت مذہبی امور کے وزیر ڈاکٹر عاصم البشیر، جنھوں نے اپنے خوبصورت عربی خطاب میں ادب و بلاغت کی رنگینیوں اور حسن ادا کی لطافت سے حاضرین کو بہت متاثر کیا، ندوہ شباب اسلامی عالمی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مانع بن حماد جہنی، بوسنیا کے رئیس العلماء ڈاکٹر مصطفیٰ سیرچ، کویت کے ڈاکٹر عبدالرحمٰن السمیط جو عرصہ دراز سے افریقہ میں سرگرم عمل ہیں، ڈاکٹر علی قرہ داغی جنھوں نے قطبین اور انتہائی شمالی ممالک کے ان مسائل کا تذکرہ اور حل پیش کیا جو موسم گرما میں دن کی غیر معمولی طوالت کے باعث پیش آتے ہیں۔ نائیجیریا میں اردن کے سابق سفیر ڈاکٹر کامل شریف جو اپنی کبر سنی کے باوجود ہر

مسلم بین الاقوامی کانفرنس میں سرفہرست رہتے ہیں۔ شیخ عبدالرحمن الحسبنکۃ میدانی جو اپنی دعوتی اور فقہی تحقیقات کی بنا پر علماء میں امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد بن سعد الشویعر جو سابق مفتی اعظم عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ کے برسوں پرسنل سیکرٹری رہے اور مجلۃ البحوث الاسلامیہ کے مدیر کے طور پر سعودی عرب کی مقتدر شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ نائیجیریا کے شیخ احمد لیمو جو بلاد افریقہ میں دعوتی و علمی کام کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ سوڈان کے ڈاکٹر جعفر شیخ ادریس جو طبقہ اساتذہ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور آج کل امریکہ کی اسلامی اوپن یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ عراق کے ڈاکٹر احمد فتحی الرّاوی جو یورپ کی مسلم تنظیم کی فیڈریشن کے صدر ہیں۔

ناقدین ومبصرین: کانفرنس کے ہر اجلاس میں پیش کردہ مقالات پر تنقیدی نظر ڈالنے کے لیے جن اصحاب کا انتخاب کیا گیا، ان میں سے چند شخصیات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا۔ کویت کے ڈاکٹر خالد عبداللہ المذکور، ایران کے ڈاکٹر محمد شریعتی، لاس اینجلس (امریکہ) کے اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر مزمل صدیقی جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ التحصیل ہیں، بعد میں برطانیہ اور امریکہ کی جامعات سے استفادہ کیا اور اب اپنے دعوتی کام کی بنا پر امریکہ کی معروف شخصیت ہیں۔ سوڈان کے ڈاکٹر احمد علی الامام، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ التحصیل، پھر گلاسگو یونیورسٹی سے علم قراءت پر تحقیقی کام کیا اور اب سوڈان میں دعوتی مہم سنبھالے ہوئے ہیں۔ اب آیئے، ان مقتدر شخصیات کا تذکرہ ہو جائے جنھوں نے مختلف اجلاسوں کی صدارت کی۔

مجالس کی صدارت: افتتاحی اجلاس کی صدارت مکہ کے امیر شہزادہ عبدالمجید بن عبدالعزیز آل سعود نے کی۔ باقی اجلاسوں کے صدر مندرجہ ذیل حضرات تھے: سوڈان کے ایک

سابق فوجی صدر عبدالرحمٰن سوار الذہب جو ایک مختصر سے عرصے کے لیے سوڈان کے صدر رہے لیکن سویلین حکومت کے قیام کے وعدے کو اس خوبصورتی سے نبھا گئے کہ اب تک اپنی شرافت اور نجابت کی بنا پر یاد کیے جاتے ہیں، آج کل دعوت اسلامیہ کے بین الاقوامی مرکز (خرطوم) کے صدر ہیں۔ سعودی عرب کے وزیر عدل اور آل شیخ کے ہونہار نقیب ڈاکٹر عبداللہ بن محمد بن ابراہیم آل شیخ، نائیجیریا میں اردن کے سابق سفیر اور الاخوان المسلمون کی معروف شخصیت جناب کامل شریف، ڈاکٹر جعفر عبدالسلام، ڈاکٹر عصام البشیر جن کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے، رابطہ عالم اسلامی کے سابق سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ بن صالح العبید، رابطہ عالم اسلامی کے دور اول کے انتہائی متحرک اور بااثر سیکرٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف، سعودی عرب کے سابق وزیر اطلاعات ڈاکٹر محمد بن عبدہ اور جامعہ ازہر کے چانسلر ڈاکٹر احمد عمر ہاشم۔

قرار دادیں اور یادداشتیں: موتمر کے اختتام پر 32 صفحات پر مشتمل قرار دادوں اور سفارشات کا مجموعہ سامنے آیا، آخری اجلاس اس ''کمیونکے'' کی ریڈنگ اور بحث مباحثے پر ختم ہوا۔ اس مجموعہ سفارشات و قرار داد میں مندرجہ ذیل تین مرکزی موضوع سرفہرست رہے: ① امت مسلمہ اور فریضہ دعوت الی اللہ۔ ② امت مسلمہ اور نیا عالمی نظام (گلوبلائیزیشن) ③ مسلمان اقوام اور اقلیات کے مسائل

پہلے موضوع کے ضمن میں ذیلی عنوانات: شریعت اسلامیہ کا نفاذ، فریضہ دعوت الی اللہ، قرآن کریم کی اشاعت، اس ضمن میں اسرائیل کے طبع کردہ ناقص عبرانی ترجمے کی نشاندہی اور ایک صحیح عبرانی ترجمے کی تیاری پر زور دیا گیا تھا۔ مسجد ایک مشن اور پیغام کی حیثیت سے، اسلامی تعلیم کا فروغ۔

دوسرے موضوع کے ذیلی عنوانات: اتحاد اسلامی کی ضرورت، امت مسلمہ کے شاہراہ وسط اور عدل پر ہونے کی اہمیت، اسلام کا دفاع اور اسلام کی صحیح تصویر اجاگر کرنے کی ضرورت، اسلامی رفاہی اداروں کی پشت پناہی اور ان کا دفاع، اسلام میں تجدید دین اور اجتہاد کا مقام، امت مسلمہ کے لیے پائیدار امن کی ضرورت، اسلامی جدوجہد میں تعاون اور مشارکت، اسلامی محکمہ عدل کے قیام کی ضرورت، مسلم معاشروں کی ترقی کے لیے اقدامات کی ضرورت، انسانی حقوق، مسلم معاشرے کو پیش آمدہ چیلنج اور ان کا جواب، خاندان، بچوں اور خواتین سے متعلق مسائل، غیر مسلم ممالک میں اسلامی مراکز و جمعیات، اسلام اور دہشت گردی، اسلامی ذرائع ابلاغ، امت مسلمہ اور دوسری تہذیبوں کے درمیان مکالمہ، اسلام ایک تہذیبی متبادل نظام کی حیثیت سے۔

تیسرے موضوع کے ذیلی عنوانات: فلسطین، بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ، بلاد بلقان، چیچنیا، مسلم اقلیتیں۔

کعبہ مشرفہ میں داخلے کی سعادت اور اس کا احوال: کانفرنس کے دوران میں دنیا بھر سے آئے ہوئے کئی شناسا چہرے نظر آئے، بعض ایسے کہ جن سے مل کر بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس عظیم اجتماع کی مناسبت سے ایک عظیم سعادت بھی حاصل ہو گئی۔ کانفرنس کے آخری دن کی کارروائی باقی تھی کہ فجر کی نماز اور طواف کعبہ کے بعد لندن اسلامک کلچرل سینٹر کے ڈائریکٹر جناب احمد الدبیان نظر آئے۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات شرکائے کانفرنس کی ایک بڑی تعداد کو عمارت کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔ میں چونکہ اس کارروائی سے ناواقف تھا، اس لیے انھوں نے براہ کرم مجھے اپنے ساتھ لیا اور مکبرہ (اذان دینے کی جگہ) کے ساتھ کانفرنس کے مدعوین

کے لیے مخصوص جگہ میں آنے کی اجازت دلوائی اور پھر عمارت کعبہ کے اندر جانے کا اجازت نامہ بھی دلوایا۔ زہے نصیب کہ زندگی میں تیسری مرتبہ یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے!! چھتیس یا سینتیس سال قبل زمانہ طالب علمی میں ایک دفعہ آٹھ ذوالحجہ کو غسل کعبہ کی تقریب کے بعد عوام الناس کی بھیڑ کے ساتھ کعبہ میں داخل ہونے کا موقع ملا تھا لیکن بڑی کشاکش اور دھکم پیل کے بعد۔ دوسری مرتبہ دس گیارہ سال قبل رابطہ ہی کی ایک کانفرنس نے یہ موقع بہم پہنچایا تھا اور اب پھر نگاہ دید باب کعبہ کھلنے کی منتظر تھی۔ اس دوران میں بارانِ رحمت خوب بج دھج سے مکہ کے در و بام کو نہلا گئی، اشتیاق کے لمحات طویل ہوتے گئے، پھر کچھ امید افزا آثار نظر آنے لگے، سعودی سپاہیوں نے کعبہ کو گھیرے میں لے لیا اور طواف کرنے والوں کا دائرہ تنگ ہوتا گیا، پھر جونہی لکڑی کی ایک سیڑھی باب کعبہ سے آ کر لگی، وصال کی گھڑیاں نوید جاں فزا کا پیغام لائیں۔

ہمارے وفود رکن یمانی کی جانب سے ہوتے ہوئے ''حطیم'' میں داخل ہوئے اور پھر یہاں سے باب کعبہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے قطار در قطار آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ حطیم اصلاً چونکہ کعبہ ہی کا حصہ ہے، اس لیے ایک کے بعد دوسری جبین نیاز پرنم آنکھوں کے ساتھ فرش حطیم کو بحالت سجود چھونے لگی۔ قافلہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا گیا۔ جونہی پہلے داخل ہونے والے باہر کا رخ کرتے، باقی مشتاقانِ دید کے لیے راستہ صاف ہو جاتا۔ بارے سیڑھی تک رسائی ہوئی۔ پروانہ راہداری ''شرطہ'' کو تھمایا، سیڑھی کے چند قدموں کو تیزی سے عبور کیا، کعبہ کی چوکھٹ پار کرنے کے بعد ایک دفعہ پھر میں کعبہ کی گود میں تھا! سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

نماز کا یہ انوکھا منظر کہ جس سمت چاہو، کھڑے ہو کر نیت باندھ لو، کہاں اور نظر آئے گا؟ ہمارے ساتھی سربسجود تھے یا دعاؤں میں مشغول، آہوں اور سسکیوں کی مدھم

آوازیں کعبہ کی پرسکون فضا میں تلاطم برپا کر رہی تھیں۔ وفود کے صف بستہ ہجوم میں جس رخ میں نے دو رکعت نماز ادا کی وہ حطیم کی جہت تھی۔ اس بار میں کعبہ کا بھرپور جائزہ لینا چاہتا تھا، اس لیے بارگاہِ الٰہی میں اپنی دعائیں، التجائیں، درخواستیں پیش کرنے کے بعد کعبہ کے اندرونی ماحول کو ٹٹولنا شروع کیا۔

اس مکعب کمرے کے وسط میں تین ستون ہیں، جن کے درمیانی بالائی سطح پر ایک تار ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تنا ہوا ہے، اس تار میں ساتھ ساتھ کثیر تعداد میں ظروف لٹکے ہوئے نظر آئے۔ تانبے، پیتل اور نکل کے یہ ظروف قندیل ہیں یا قندیل نما کسی زمانے میں مستعمل رہے ہوں گے یا بطور ہدیہ نذر کیے گئے ہوں گے۔ تار کے عین نیچے فرش پر چند چوبی صندوق نظر آئے، جو ان عطریات اور خوشبوؤں سے مالا مال ہیں جو کعبہ کی اندرونی فضا کو معطر کیے رکھتے ہیں، دیواروں کی اندرونی بالائی سطح سبز رنگ کے منقش غلاف سے ڈھکی ہوئی ہے یا یوں کہیے کہ غلاف دیوار پر پیوست ہے، حطیم کی جانب کا دایاں کونہ دو دیواروں سے فرش تک چھت بند دکھائی دیا، جس کے ایک طرف سونا چڑھے ''مذہب'' دروازے کی موجودگی کعبے کے اندر ایک اور بند حجرے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ دروازے کے ساتھ بائیں جانب کتبے کی موجودگی نے اس عقدہ کو حل کیا۔ یہ کتبہ بتا رہا تھا کہ شاہ خالد بن عبدالعزیز کے عہد 1397ھ میں کعبے کی سیڑھی کی تجدید کی گئی۔ اس وقت تو دھیان اس سیڑھی کی طرف گیا جس پر چڑھ کر ہم کعبہ میں داخل ہوئے تھے لیکن بعد میں امام کعبہ شیخ عبدالرحمٰن سدیس سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ اس سے مراد وہ گول آہنی سیڑھی ہے جو صفائی کرنے والوں کو چھت تک لے جاتی ہے اور جسے یہ حجرہ زائرین کی نگاہوں سے اوجھل کیے رکھتا ہے۔

دل تو چاہتا تھا کہ کچھ دیر اور رکوں لیکن نقیب کی آواز ''چلو چلو'' کی صدا لگا رہی تھی، اس لیے ناچار باہر کا رخ کیا، اترتے وقت دیکھا کہ لوگوں کا ہجوم جس میں کانفرنس کے چند شرکاء بھی تھے، کعبے میں داخل ہونے کی آس لگائے کھڑا ہے لیکن سپاہِ حرم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، اس لیے مزید افراد کو اندر آنے کی اجازت نہ مل سکی، وعدۂ فردا پر ٹرخائے ہوئے ان افراد سے نجانے یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے!!

اس دفعہ غلاف کعبہ کا بھی چہار اطراف سے جائزہ لیا، سونے کے تاروں سے نقش کندہ تحریر میں وہ تمام آیات شامل تھیں جو بیت اللہ الحرام، تطہیر کعبہ، حج بیت اللہ، ندائے ابراہیمی اور توحید باری سے متعلق ہیں، جگہ جگہ اسمائے حسنیٰ منقش ہیں، موجودہ غلاف کعبہ میں کلام الٰہی کے علاوہ صرف یہ تحریر شامل ہے:

صنعت هذه الكسوة في مكة المكرمة وأهداها إلى الكعبة خادم الحرمين الشريفين الملك فهد بن عبدالعزيز آل سعود ...... تقبل الله منه، عام١٤٢٢هـ

''یہ غلاف مکہ مکرمہ میں تیار کیا گیا، جسے خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود نے 1422ھ میں کعبہ کو ہدیتاً پیش کیا...... اللہ ان کی طرف سے قبول فرمائے۔''

جمعیت اہل حدیث کا استقبالیہ: کانفرنس کی مناسبت سے جناب فضل الرحمٰن نے جدہ کے احباب جمعیت اہل حدیث کے تعاون سے شاہین ریسٹورنٹ میں بلاد ثلاثہ (پاکستان، بھارت اور برطانیہ) کے وفودِ جمعیت کے اعزاز میں استقبالیہ دیا، پاکستان سے پروفیسر ساجد میر، ہندوستان سے مولانا عبدالوہاب خلجی، برطانیہ سے راقم الحروف،

مولانا شعیب احمد میر پوری، برادر عجائب خان، برادر عبدالاول محمود اور مکہ مکرمہ سے جناب شیخ وصی اللہ خصوصی مہمان تھے، جامعہ سلفیہ بنارس کے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، شیخ الجامعہ مولانا رضاء اللہ اور جمعیت اہل حدیث ہند کے نومنتخب ناظم اعلیٰ مولانا اصغر علی بھی مدعو تھے لیکن بوجوہ شریک نہ ہو سکے۔ عشاء کے بعد ہونے والی اس باوقار تقریب میں شرکائے محفل کا تعارف کرایا گیا اور ہم میں سے ہر شخص نے دعوت الی اللہ یا جمعیت کے کام کے بارے میں چند کلمات کہے۔ آدھی رات ہونے کو تھی کہ یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی اور کوئی ایک بجے رات ہم اس خوشگوار محفل کی یادیں سمیٹے مکہ میں اپنے مستقر واپس پہنچے۔

امام کعبہ سے ملاقات: مکہ کے قیام کے دوران فضیلۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل کے درِ دولت پر ان کے جوان بیٹے، خطیب حرم، استاد جامعہ ام القریٰ شیخ عمر السبیل کی ناگہانی وفات پر بغرضِ تعزیت جانا ہوا، شیخ صبر وعزیمت کا پہاڑ نظر آئے۔ باتوں سے ذرا فراغت ہوئی تو اپنے بیٹے عبداللطیف سے ابن مفلح کی ''الآداب الشرعیۃ'' پڑھنے کو کہا۔ وہ کتاب پڑھتے جاتے اور شیخ موقع ومحل کی مناسبت سے شرح کرتے جاتے۔ شیخ سے ایک دوسری ملاقات بھی تھی اور برادرم وصی اللہ کی معیت میں دوبارہ ان کے گھر کا قصد بھی کیا لیکن اس روز شدید اور موسلادھار بارش کی بنا پر راستے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ مکہ سے ''عوالی'' کا راستے کوئی زیادہ نہیں لیکن اس روز کاروں کا سیلِ رواں ابر رحمت کے طوفان بلاخیز کے سامنے جم نہ سکا، چنانچہ ہمیں گاڑی کا رخ واپس مکہ کی طرف پھیرنا پڑا۔ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ۔ یار زندہ صحبت باقی!

فتویٰ کے موضوع پر رابطہ کی عالمی کانفرنس

سترہ جنوری سے بیس جنوری 2009ء تک مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے وسیع و عریض کانفرنس ہال میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس میں صرف ایک ہی موضوع پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی اور وہ یہ کہ فتویٰ دینے کا اہل کون ہے؟ فتویٰ جاری کرنے کے لیے کیا کیا قواعد وضوابط ہونے چاہئیں؟ زمان ومکان کی تبدیلی سے فتویٰ کہاں تک تبدیل ہوسکتا ہے؟ ان موضوعات پر کوئی چالیس کے قریب تحقیقی مقالات پہلے سے لکھوائے جاچکے تھے اور ان کے مصنفین کانفرنس کی آٹھ نشستوں میں اپنے اپنے مقالے کی تلخیص پیش کرنے کے لیے بلائے گئے تھے۔

ہفتہ سترہ جنوری کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی (سیکرٹری جنرل رابطہ عالم اسلامی)، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ آل الشیخ (مفتی اعظم سعودی عرب)، مفتی رفیع عثمانی (پاکستان) اور امیر خالد الفیصل (گورنر مکہ مکرمہ) نے اپنے اپنے خطابات سے نوازا۔ اس کے بعد مقالات کی تلخیص اور ان پر بحث ومناقشہ کی نشستوں کا آغاز ہوگیا۔

اتوار کی صبح کا اجلاس شیخ صالح بن حمید (اسپیکر مجلس شوریٰ اور امام حرم مکی) کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مفتی اعظم بھی تشریف فرما تھے۔ اسی نشست میں مصر

کے مفتیِ اعظم شیخ محمد جمعہ نے زمان و مکان کے اختلاف پر فتویٰ کی تبدیلی کے بارے میں اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔

مقالات کی تلخیص کے بعد سوالات اور بحث کے وقفے میں راقم الحروف نے زمان و مکان کے اختلاف کی بنا پر فتویٰ کی تبدیلی کے تناظر میں دو مسائل مزید غور و خوض کے لیے پیش کیے۔

ایک تو رضاع الکبیر (بڑے بچے کو دودھ پلانا) سے متعلق تھا اور دوسرا مسئلہ دیار مغرب میں احتجاجی جلوس اور مظاہرے کا اہتمام تھا۔

پہلے مسئلے کی شان نزول یہ ہے کہ مکہ کانفرنس کے لیے روانگی سے ایک دن قبل مجھے لندن میں تبنّی Adoption کے موضوع پر ایک مذاکرے میں شرکت کا موقع ملا جسے اسلام چینل نے برونائی ہال (اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز) میں منعقد کیا تھا اور جس میں میرے علاوہ نومسلم بیرسٹر احمد تھامسن، چند سوشل ورکرز، ایک نوجوان امام اور اجمل سرور (بحیثیت کنوینر) شامل تھے۔ منتخب حاضرین کی تعداد ایک سو افراد کے لگ بھگ تھی۔

اس مذاکرے میں سوشل ورکرز کی طرف سے یہ نکتہ اٹھایا گیا تھا کہ چونکہ اسلام میں تبنّی (پرائے بچے کو بیٹا یا بیٹی بنا لینا) ناجائز ہے، اس لیے اس ملک میں مسلمان جوڑے، تبنّی کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ وہ کفالت Fostering کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں، لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے کفالت کی اجازت محدود وقت کے لیے ہے اور جونہی بچے کو کوئی بھی جوڑا بحیثیت بیٹا یا بیٹی اپنا لیتا ہے تو وہ بچہ اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور اس طرح کئی مسلمان بچے غیر مسلم

خاندانوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

اس موضوع پر میں نے یہ کہا تھا کہ تبنی سے متعلق تین باتیں لوگوں کے لیے باعث تشویش ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچے کو گود لینے والے شخص کا نام بحیثیت باپ نہیں دیا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس شخص کا وارث نہیں بن سکتا اور تیسرے یہ کہ جونہی یہ بچہ بلوغت کے سن تک پہنچے گا، نامحرم ہونے کی بنا پر اسے ستر و حجاب کی حدود کا پابند رہنا ہوگا، یعنی اگر لڑکا ہے تو گود لینے والی ماں اور اس کی لڑکیاں اس کے سامنے حجاب کی پابند ہوں گی اور اگر وہ خود لڑکی ہے تو اس کا گود لینے والا باپ اور اس کے لڑکے اس کے لیے نامحرم متصور ہوں گے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس وضاحت کے بعد کوئی اشکال باقی نہیں رہتا کہ حکومت کی طرف سے ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ بچے کو ہر صورت میں گود لینے والے شخص کا نام دیا جائے، یعنی وہ اپنی اصلی ولدیت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ دوسری بات، یعنی جہاں تک وراثت سے محرومی کا تعلق ہے تو یہ شخص اپنی وصیت میں ایک تہائی مال تک اس بچے کے لیے چھوڑ سکتا ہے اور جہاں تک تیسری بات کا تعلق ہے تو اس کا مداوا دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

جس بچے کو گود لیا گیا ہے، اگر وہ دودھ پیتا بچہ ہے، یعنی ڈیڑھ دو سال کی عمر کا ہے تو اسے گود لینے والی عورت دودھ پلا کر اپنا محرم بنا سکتی ہے۔ وہ اگر دودھ والی نہ بھی ہو تو اس کی بہن، بھتیجی یا بھانجی بھی دودھ پلا دے تب بھی وہ عورت بحیثیت رضاعی خالہ یا پھوپھی اس کی محرم بن جائے گی۔

لیکن جن بچوں کو تبنی کے لیے پیش کیا جاتا ہے وہ عموماً چھ سات سال سے اوپر کے

ہوتے ہیں، اس لیے ان کا فطری طور پر دودھ پینا متصور نہیں ہوسکتا۔ یہاں ضرورت کے پیش نظر رضاعت کبیر کے مسئلے کو اپنایا جاسکتا ہے اور اس کی بنیاد سہلہ بنت سہیل رضی اللہ عنہا کا قصہ ہے۔ سہلہ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں۔ ابو حذیفہ نے سالم نامی ایک لڑکے کو چھ سات سال کی عمر میں غلام کی حیثیت سے خریدا اور پھر آزاد کر دیا۔ یہ بچہ جب ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں سن بلوغت کو پہنچا تو سہلہ کو بہت تشویش ہوئی اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا: اللہ کے رسول! سالم ہماری اولاد کی طرح گھر میں پلا بڑھا ہے، اب جبکہ وہ بالغ ہوگیا ہے تو میں اس کے سامنے بغیر حجاب کے نہیں آسکتی، حالانکہ میرے نزدیک وہ میرے بچوں کے مانند ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
''تم اسے اپنا دودھ پلا دو تو وہ تمھارا محرم بن جائے گا۔''●

اس حدیث کے بارے میں علماء کی ایک رائے تو یہ ہے کہ یہ ایک خصوصی اجازت تھی، اسے عام نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسری رائے جواز کی ہے جسے شاذ رائے قرار دیا گیا ہے لیکن امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ اگر ایسی کوئی صورت پیش آجائے تو شاذ رائے پر عمل کیا جاسکتا ہے اور جہاں تک دودھ پلانے کا تعلق ہے تو اس کی یہ شکل بھی جائز قرار دی گئی ہے کہ پلانے والی کا دودھ بوتل میں محفوظ کر لیا جائے جسے متعلقہ بچہ بعد میں پی سکتا ہے، یعنی بالواسطہ نہ کہ بلا واسطہ۔ اگر خاتون دودھ والی نہ بھی ہو تب بھی آج کل مصنوعی طریقوں سے دودھ کو انگیز کیا جاسکتا ہے۔

میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ گو یہ ایک شاذ رائے ہے لیکن یہاں دو قباحتوں میں سے کم تر کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بڑی قباحت یہ ہے کہ ایک مسلمان بچہ، کسی مسلمان خاندان

● صحيح البخاري، النكاح، حديث:5088، وصحيح مسلم، الرضاع، حديث:1453.

کی طرف سے تبنّی نہ ہونے کی بنا پر ایک غیر مسلم جوڑے کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور کم قباحت یہ ہے کہ مذکورہ شاذ رائے، یعنی بڑے بچے کو دودھ پلانے والی روایت پر عمل کر لیا جائے تاکہ مسلمان خاندان بچوں کو گود لینے سے نہ ہچکچائیں۔

مکہ کانفرنس کے اجلاس میں چونکہ نقطۂ اعتراض پیش کرنے والوں کو دو تین منٹ سے زائد وقت نہیں دیا جاتا، اس لیے میں نے اپنی رائے بہت اختصار کے ساتھ پیش کی، اس کی ساری شانِ نزول بیان نہ ہوسکی۔

دوسری مثال مظاہرے کرنے سے متعلق تھی، اس کی شان نزول بھی غزہ پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری تھی۔ تمام دنیا میں اس پر سخت احتجاج ہوا اور اس کی سب سے طاقتور شکل مظاہروں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ گو اس سے بمباری تو نہ رک سکی لیکن کم از کم اسرائیل کو یہ تو اندازہ ہوگیا کہ ساری دنیا اس کے بھیانک اعمال پر شدید نفرت کا اظہار کر رہی ہے۔

میں نے ''دیارِ غرب'' کا خاص طور پر اس لیے حوالہ دیا کہ جمہوری نظام میں احتجاجی مظاہرے کرنے کی گنجائش روا رکھی گئی ہے، گویا یہ عمل ملکی قوانین کے خلاف نہیں ہے۔

میرا خیال تھا کہ میری ان دونوں آراء پر تنقید ہوگی لیکن مفتیٔ اعظم کی طرف سے پہلی رائے پر تنقید کا اظہار ہوا، ان کا موقف یہ تھا کہ رضاعت کبیر کے مسئلے سے اور مشکلات پیدا ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ اس بات کو بند ہی رہنے دیا جائے۔

میں نے ایک نماز کے بعد جبکہ مفتیٔ اعظم مصلے ہی پر تھے، موقع غنیمت جانا اور ان سے رضاعت کبیر کے مسئلے کی شان نزول ذکر کی جس کی وضاحت پچھلی سطور میں آچکی ہے لیکن مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ مغرب میں گود لینے والے خاندانوں کو جن مشکلات

کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اللہ اس کا کوئی اور حل نکال دیں گے، اس لیے وہ اس کے جواز کے حق میں نہیں ہیں۔

سوموار کی ایک نشست میں ڈاکٹر محمد احمد صالح کی زبان سے ان کے مقالے کی تلخیص سنی۔ ڈاکٹر محمد احمد صالح سے میری پرانی شناسائی ہے۔ وہ ریاض کی جامعہ الامام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی میں فقہ کے استاد ہیں اور ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں اہل و عیال سمیت برطانیہ تشریف لاتے ہیں۔ شروع شروع میں لندن میں قیام کیا کرتے تھے، پھر برمنگھم اور اب نیو کاسل کا مستقر پسند آ گیا ہے۔ نابینا ہیں، اس لیے اپنا سارا وقت دعوت و تدریس میں گزارتے ہیں۔ ایک دقیق فقہی موضوع پر وہ اپنے حافظے سے اس روانی کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے جیسے کہ ایک دریا بہہ رہا ہو۔ ان کا موضوع شاذ فتاویٰ کے بارے میں تھا۔

منگل کی ایک نشست میں، میں نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی جس میں انھوں نے مصلحت کی بنا پر کسی شاذ روایت کو اختیار کرنے کی اجازت پر زور دیا ہے۔

اس روز کانفرنس کا آخری اجلاس منعقد ہوا جس میں رابطہ کی فقہی اکیڈیمی کے سیکرٹری ڈاکٹر صالح مرزوقی نے کانفرنس کا اعلامیہ پڑھا جو 37 صفحات پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ الترکی کی تقریر پر کانفرنس کا اختتام ہوا۔

لیکن ابھی ''علماء اور مفکرین اسلام کے بین الاقوامی ملتقیٰ'' کے دو اجلاس باقی تھے جس کا قیام دو سال قبل عمل میں آیا تھا۔ اس ملتقیٰ (کلب) کی مجلس عاملہ کے تیس ارکان ہیں جن کا تعلق دنیا کے مختلف ممالک سے ہے۔ برطانیہ سے میرا نام شامل کیا گیا تھا، اس لیے اس مجلس میں حاضری کا شرف بھی حاصل ہوگیا۔

ملتقیٰ کی پہلی نشست منگل 20 جنوری کی شام منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر عبداللہ الترکی نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں مسلم امہ کے تنزل کے اسباب پر روشنی ڈالی اور اس موضوع پر اظہار رائے کی دعوت دی۔ شیخ الازہر محمد طنطاوی، اردن کے مفتیٔ اعظم اور بوسنیا کے رئیس العلماء مصطفیٰ سیرچ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پاکستان سے ڈاکٹر محمود غازی اور امریکہ سے مزمل صدیقی نے جچی تلی باتیں کیں۔

میں نے اپنی مختصر گفتگو میں اس بات پر زور دیا کہ اگر آپ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کی آخری جلد اٹھا کر دیکھ لیں تو پچھلے دو سو سال کے عظیم انکشافات اور ایجادات کی فہرست نظر آئے گی جس میں کسی ایک مسلمان کا نام بھی نظر نہیں آئے گا، یعنی موجودہ دور میں جتنی سہولتیں اور آسائشیں ہمیں حاصل ہیں، ان سب کے پیچھے اہل مغرب کے سائنسدانوں کا ہاتھ ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ علوم شرعیہ کے ساتھ مسلم اُمہ کو سائنسی علوم پر بھی کما حقہ توجہ دینی چاہیے۔

بدھ 21 جنوری کو ملتقیٰ کا دوسرا اجلاس ہوا جس میں غزہ کے حالات پر بات چیت کے ضمن میں مسلمانوں کے لیے بیت المقدس کی زیارت کا موضوع بھی زیر بحث آیا۔ ڈاکٹر ترکی کی رائے تھی کہ جو مسلمان وہاں جانے پر قدرت رکھتے ہوں وہ ضرور جائیں تاکہ اہل قدس کو تنہائی کا احساس نہ ہو اور دوسرے مسلمانوں کا مسجد اقصیٰ سے رابطہ بھی قائم رہے جو مسئلہ آزادیٔ فلسطین کے مفاد میں ہے۔ شیخ الازہر محمد طنطاوی کی رائے اس سے مختلف تھی، ان کا کہنا تھا کہ چونکہ ہم اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے اور بیت المقدس کا سفر بغیر اسرائیلی ویزے کے ممکن نہیں، اس لیے ہم وہاں کیسے جاسکتے ہیں؟

خیال رہے کہ مصری حکومت کے جتنے گہرے تعلقات اس وقت اسرائیل سے ہیں

وہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی ملک کے ہوں۔ غزہ پر بمباری کے وقت مصر اور اسرائیل کے اندرونی تعلقات پوری طرح آشکار ہو چکے ہیں۔

میں نے شرکائے مجلس کو بتایا کہ ہم (زوجین) ستمبر 94ء میں مسجد اقصیٰ کیسے جا سکے تھے اور ہمیں وہاں کے زمینی حالات سے بلا واسطہ کیسے آگاہی ہو سکی۔ اور اگر ہماری طرح دیارِ مغرب کے دوسرے مسلمان بھی فلسطین آتے جاتے رہیں تو اہل فلسطین کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے گی اور اس مسئلے کی بھی ذہنی سطح پر تجدید ہوتی رہے گی۔ شیخ الازہر نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا تمھیں اسرائیلی سفارت خانہ سے ویزا نہیں لینا پڑا؟ میں نے کہا: نہیں! اس کی نوبت نہیں آئی۔ انھوں نے استفسار کیا: ایئر پورٹ پر کس نے تمھارا پاسپورٹ چیک کیا؟ جواب دیا: اسرائیلی سٹاف نے۔ کہا: تو ظاہر ہو گیا کہ اسرائیل کے اذن سے تمھیں وہاں جانے کا موقع ملا۔ اور یوں شیخ الازہر کو اپنی رائے پر اصرار رہا۔

نماز ظہر کے بعد ہمارے لیے ایک غیر متوقع ملاقات منتظر تھی۔

دو دن قبل آگاہ کیا گیا تھا کہ کانفرنس کے شرکاء شاہ عبداللہ سے ملاقات کے لیے ریاض جانا چاہیں تو اپنے نام لکھوا دیں کہ ایک خصوصی جہاز بدھ کی سہ پہر ریاض روانہ ہوگا اور شاہ عبداللہ سے ملاقات کے بعد یہی جہاز ان شرکاء کو مدینہ منورہ لے جائے گا، جہاں وہ مسجد نبوی کی زیارت کا شرف حاصل کر سکیں گے اور پھر رات گئے تمام حضرات جدہ پہنچیں گے اور وہاں سے بذریعہ بس واپس مکہ مکرمہ آ سکیں گے۔

میرا پروگرام پہلے سے طے شدہ تھا کہ جمعرات کی صبح آٹھ بجے اسلام آباد کے لیے روانگی ہوگی اور یہ خیال مجھے ستاتا رہا کہ اگر مدینہ سے ہماری واپسی میں تاخیر ہو گئی تو اسلام آباد کا سفر متاثر ہو سکتا ہے، اس لیے میں نے اپنا نام نہیں لکھوایا لیکن منتظمین نے یقین

دہانی کرائی کہ ہر صورت واپسی بدھ کی شب کو ہوگی، اس لیے اگر میں چاہوں تو اپنا سامان ساتھ رکھ لوں اور جدہ پہنچ کر ایئر پورٹ پر ہی صبح کی پرواز کے لیے انتظار کرتا رہوں۔

اس یقین دہانی کی روشنی میں ظہر کے بعد شرکاء کے ساتھ ریاض جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے ساتھ چند دوسرے احباب اپنی بیگمات کے ہمراہ تھے، ہم نے اپنا سامان ساتھ لیا اور یوں جدہ روانگی ہوئی جہاں خصوصی جہاز ہمارا منتظر تھا۔

ریاض کے وی آئی پی لاؤنج میں خواتین کی خاطر داری کا انتظام موجود تھا۔ مرد حضرات جن کی تعداد اسی کے قریب تھی، دو بسوں میں شاہی محل کی طرف روانہ ہوئے۔ غالباً یہ محل ایئر پورٹ سے زیادہ دور نہ تھا، اس لیے ہم جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ ایک کشادہ ہال میں کرسیاں بچی تھیں جہاں قہوہ اور کھجور سے ہماری تواضع کی گئی۔

شاہ عبداللہ کی آمد پر مختصر سا اجلاس ہوا جس میں ڈاکٹر عبداللہ الترکی نے کانفرنس کی غرض و غایت کے بارے میں روشنی ڈالی۔ مفتیٔ اعظم سعودی عرب نے موضوع کو اور نکھارا اور شرکائے کانفرنس کی طرف سے بوسنیا کے مفتی ڈاکٹر مصطفیٰ سیرچ نے شاہ کو خطاب کیا۔ آخر میں شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے اپنا مختصر خطاب پڑھا جس میں مہمانوں کو خوش آمدید کہا گیا تھا اور ان کے لیے دعائے خیر کی گئی تھی۔

پھر شرکاء سے کہا گیا کہ وہ ایک قطار میں آئیں اور شاہ سے مصافحہ کرتے وقت اپنا نام اور وطن بتائیں۔ میں نے اپنا نام اور ملکِ رہائش کے ساتھ شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ بلند آواز کہے:

حَمَيْتُمْ جَانِبَ التَّوْحِيدِ فَحَمَاكُمُ اللهُ.

''آپ نے توحید کی حفاظت کی تو اللہ نے آپ کی حفاظت کی۔''

شاہ ہر مہمان کو ''بَارَكَ اللّٰهُ فِيكُمْ'' کی دعا سے نوازتے رہے۔

قصر شاہی میں مغرب وعشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم کوئی آٹھ بجے واپس ایئر پورٹ پہنچے جہاں سے ہمارا اگلا پڑاؤ مدینہ منورہ تھا۔ بتایا گیا کہ ہمیں ایک گھنٹہ دیا جاتا ہے جس میں ہم روضۂ نبوی پر سلام اور مسجد میں نوافل کی سعادت حاصل کر سکتے ہیں۔

رات کے دس بج چکے تھے۔ چونکہ رات کا وقت تھا، اس لیے باب السلام کے علاوہ سب دروازے بند کیے جا چکے تھے۔ ہم تین حضرات (میں، برادرم مزمل اور برادرم مصطفیٰ سیرچ) کے ساتھ خواتین بھی تھیں، اس لیے دربان نے کہا: خواتین باب النساء سے داخل ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ہم مسجد کی قبلی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ خیال تھا کہ کوئی قریب کا دروازہ کھلا ہوگا جہاں سے وہ داخل ہو سکیں گی لیکن ہر دروازہ مقفل پایا۔ ہم بقیع کی سمت سے ہوتے ہوئے مسجد کی پچھلی جانب چلتے گئے، جہاں بالآخر باب النساء پہنچے۔ ہمارے بوسنوی دوست کا اصرار تھا کہ ہم اتنا چل کر آئے ہیں تو ہمیں بھی اسی دروازے سے جانے دو کہ اس وقت یہاں عورتوں کا جمگھٹا بھی نہیں ہے لیکن دربان کے ساتھ تکرار بے سود رہی۔ پندرہ منٹ پہلے ہی گزر چکے تھے، ہم باب مجیدی سے ہوتے ہوئے دوبارہ باب السلام پہنچے، گویا آدھ گھنٹہ مسجد کے مکمل طواف میں گزر گیا۔ اب چونکہ خواتین کو لینا بھی تھا، اس لیے مسجد میں مختصر وقت گزار سکے۔ مواجہہ پر سنت صحابہ کے مطابق نذرانہ سلام پیش کیا۔ روضہ میں چند نوافل ادا کیے اور باہر آ گئے۔ سعادت کے ان لمحات کے میسر آنے پر بارگاہ الٰہی میں شکریہ ادا کیا اور پھر دوبارہ مسجد نبوی پہنچے۔ خواتین ابھی اندر ہی تھیں، موبائل سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا، دربان سے پھر تکرار ہوئی کہ یا تو خواتین کو بلا دو یا ہمیں اندر جانے دو لیکن

اس نے دربان عورت کے نہ ہونے کے سبب ہمیں انتظار کرنے کے لیے کہا لیکن عین اس وقت یہ خواتین برآمد ہوگئیں اور ہم بھاگم بھاگ بس تک پہنچے جہاں باقی حضرات ہمارا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

ہم کوئی رات کے ایک بجے جدہ ایئر پورٹ پہنچے جہاں ہم نے اپنا سامان وصول کیا۔ ساتھیوں کو الوداع کہا اور وی آئی پی لاؤنج کی راہ لی جہاں مردوں، عورتوں کے لیے علیحدہ انتظار گاہیں تھیں۔ دیکھا کہ برادرم مصطفیٰ سیرچ مجھ سے پہلے لاؤنج میں تشریف فرما ہیں، ان کی پرواز رات دو بجے تھی۔ اور چند لمحات کے بعد وہ مجھے الوداع کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ میں نے اگلے چھ گھنٹے ہال کے اندر ایک بڑی سی ٹی وی اسکرین پر خبریں دیکھتے، صوفے پر کروٹیں لیتے اور قہوہ پیتے گزار دیے۔ خدا خدا کر کے فجر کا وقت ہوا تو لاؤنج کے محافظین کے ساتھ باجماعت نماز ادا کی۔

نماز کی ادائیگی کے بعد دوبارہ لاؤنج میں اپنی نشست سنبھالی۔ اب ہماری پرواز میں آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا کہ ایک پرانے شناسا، مربی اور استاد شیخ صالح سدلان سے ملاقات ہوگئی جو کانفرنس میں شرکت کے بعد اب ریاض جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ شیخ صالح سدلان بھی علم فقہ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود کے استاد ہیں۔ اپنے گھر سے متصل ایک شاندار مسجد کے خطیب ہیں جہاں کئی سال قبل ان سے ملاقات ہوئی تھی، یہ غیر متوقع زیارت باعث مسرت ہوئی۔

جمعرات آٹھ بجے سعودیہ کی پرواز ہمیں سوئے اسلام آباد لے گئی اور یوں پانچ دنوں میں ہم مکہ، ریاض، مدینہ اور جدہ کا سفر مکمل کر پائے اور یہ دعا شامل حال رہی کہ

یہ سعادت بار بار نصیب ہوتی رہے!

امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب "الأدب المفرد" کے حوالے سے

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ڈاکٹر طاہر القادری نے ایک نشست میں عصر حاضر کے محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی (رحمہ اللہ) کی شخصیت وعلمیت پر تنقید کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے معتقدین نے یوٹیوب پر اس تنقیدی نشست کی ویڈیوز فراہم کر رکھی ہیں جو ذیل کے روابط پر دیکھی جا سکتی ہیں:

ڈاکٹر طاہر القادری کی علامہ البانی رحمہ اللہ پر تنقید بحوالہ یوٹیوب ویڈیو:

ویڈیو نمبر1، ویڈیو نمبر2، ویڈیو نمبر3: ہم نے ڈاکٹر صاحب کے معتقدین سے ادبا گزارش کی تھی کہ اسے تحریری قالب میں بھی ڈھال کر پیش کیا جائے تاکہ ہمیں جواب دینے میں آسانی ہو مگر ہماری گزارش کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔

* برادرم عتیق الرحمٰن (لندن) نے بڑی عرق ریزی سے ڈاکٹر طاہر القادری کے ان ملفوظات کو آڈیو ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے جس میں انھوں نے نابغۂ عصر، محدث زمن حاضر، شیخ محمد ناصر الدین الالبانی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ برادرم نے میری رہنمائی میں اُن کے اعتراضات کے جوابات رقم کیے ہیں جو نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے حاضر ہیں۔ (صہیب حسن، لندن)

ہمارے ایک دوست نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ان تین ویڈیوز کے مواد کو تحریری صورت میں کمپوز کر ڈالا جسے ذیل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

ڈاکٹر قادری صاحب کی اس تنقید کو کمپوزنگ و پروف ریڈنگ کے مرحلوں سے گزارنے کے باوجود غلطی کا امکان ہوسکتا ہے، لہٰذا ڈاکٹر صاحب موصوف کے معتقدین سے گزارش ہے کہ جہاں تصحیح کی ضرورت ہو، اس کا بلا جھجک اظہار فرمائیں، غلطی درست کر دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

ویڈیو 1: اب جو یہ ہاتھ چومنے اور پاؤں چومنے کی حدیثیں ہیں، امام بخاری لائے۔ وہ میری پڑھی ہوئی تھیں۔ بڑی مدت پہلے تقریباً 30 سال یا اس سے بھی زیادہ پہلے پڑھی ہوئی تھیں، جب ''الادب المفرد'' میں نے اپنے والد گرامی سے پڑھی۔ یہ بڑے زمانے پہلے کی بات ہے، اس کے کئی نسخے پڑھے تھے تو یہ کتاب اب میرے سامنے تو تھی۔

میں ایک عرب ملک میں گیا، نام نہیں لوں گا تو مکتبہ سے کتابیں خرید رہا تھا تو یہ کتاب میری نظر سے گزری تو بے دھیانی سے میں نے اسے ''صحیح الادب المفرد'' پڑھا اور صحیح نہیں پڑھا تو میں نے سمجھا کہ یہ امام بخاری کی نئی تحقیق کے ساتھ ''الادب المفرد'' آئی ہے۔

یہ غالباً 3 جلدوں میں ہے تو میں نے خرید لی اور رکھ لی، اتفاق نہیں ہوا پڑھنے کا۔ میں نے سوچا اس میں نئی تحقیق آئی ہوگی نئی تخریج کے ساتھ۔ ایسے ہی میں نے ایک روز کھولا جو ''الادب المفرد'' سمجھ کر نئی اٹھا کر لے آیا، اٹھا کے جو میں نے متعلقہ باب کھولا (باب نمبر 484، ہاتھ چومنے کا بیان) اس کی حدیث 972 دیکھی تو اس میں ہے کوئی نہیں، حدیث ہی نکال دی گئی، حدیث 972 نکال دی گئی ہے۔

پھر میں بڑا حیران ہوگیا اور یہ جو تحقیق کرنے والے عصری عالم ہیں، پتہ نہیں فوت

ہو گئے ہیں، البانی صاحب اس کو کہتے ہیں، محمد ناصر الدین البانی۔ عرب کے ہر ملک میں جائیں تو تفسیر کی ہر کتاب میں ان کی تحقیق وتخریج ملے گی، ہر ایک کے نیچے اس نے حوالے بتا دیے ہیں، جو عقیدے کے خلاف ہے وہ سب موضوع کر دیا، ضعیف بنا دیا اور جو اس کے عقیدے کے مطابق ہے اس کو صحیح کر دیا۔

پھر میں نے آگے دیکھا تو آگے جو حدیثیں بتائی ہیں (حدیث نمبر: 974، جس میں تابعین نے صحابہ کے ہاتھ چومے تھے) وہ اگلی حدیث جس میں تابعیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے تھے، وہ بھی نکال دی اور پھر میں نے آگے دیکھا (حدیث نمبر: 975، پاؤں چومنے کا باب) تو وہ سارا باب ہی نکال دیا، وہ سارا عنوان ہی نکال دیا، اس میں جو حدیثیں ہیں وہ 2 لائے تھے (حدیث 975 اور 976 دو حدیثیں) امام بخاری کی وہ دونوں نکال دیں۔

یہ تو میں صرف ایک مقام بیان کر رہا ہوں اور میں نے جب غور سے دیکھا تو باب جو (حدیث 484 ہاتھ چومنے کا بیان والا) پورا باب ہی نکال دیا اور جو اب ان کے عقیدے کے خلاف تھے وہ سارے ابواب ہی نکالتے چلے گئے اور آگے دیکھا تو (باپ کا بیٹی کو چومنے والا باب) یہ باب نمبر 443 ...... تو نکالتے نکالتے انھوں نے یہ بیٹی کو چومنے والا باب ثابت رکھا اور اس باب کا نمبر 389 ہے، یعنی یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ 389 ...... 11 یہ ہوتے ہیں اور 43 اوپر ہو گئے اور یہ ہو گئے 54 باب۔ اس حدیث تک پہنچتے پہنچتے امام بخاری کی ''الادب المفرد'' میں سے 54 ابواب نکال دیے، پھر میں نے حدیث کے نمبر دیکھے، تقبیل الید پر پہنچے 972 ...... تو حدیث نمبر 747 رہ گئی ان کے ہاں۔ اور 747 امام بخاری کی حدیث نمبر 973 تھی ...... تو کتنی حدیثیں

نکل چکی ہیں؟ 226 حدیثیں امام بخاری کی ''الادب المفرد'' سے نکال دیں۔

اب میں آپ کو End بتاتا ہوں اس کا، یہ البانی صاحب ہیں، جو عالم عرب میں سب سے بڑے محدث گردانے جاتے ہیں، اب امام بخاری کی ''الادب المفرد'' کو End کردوں۔

الادب المفرد جو اصل ہے، اس کے کتنے باب ہیں؟ 684 ابواب امام بخاری کی اصل الادب المفرد میں۔ یہ کوئی عام کتاب نہیں ہے۔ سارے جہان میں ملتی ہے، جہاں سے چاہو لے لو، الادب المفرد تو آپ کو ہر مکتبہ سے مل جائے گی، عرب وعجم اور ہر عالم کے پاس ہے اور یہ جو البانی صاحب کی ہے اس کا نام ''تحقیق التخریج'' رکھا ہے۔

تخریج کا مطلب ہے حوالہ جات دینا، کہاں کہاں یہ حدیث ہے؟ اور یہ کام مخرج کا ہوتا ہے۔ مگر یہ اخراج ہے، البانی صاحب نے بجائے تخریج کے خارج کردیے، مخرج تو الٹا اندر سے نکالتا ہے حوالہ جات۔

اب ان کا آخری باب 561 یہ ختم ہوا تو گویا اس نے 83 ابواب نکال دیے اور امام بخاری کی آخری حدیث الادب المفرد میں 1322 نمبر پر ہے اور اس البانی صاحب کی ''الادب المفرد'' کی آخری حدیث 993 ہے۔ تو اس کا مطلب کہ 330 حدیثیں امام بخاری کی الادب المفرد میں سے نکال دیں تو چھوٹے امام بچارے کہاں بچیں گے؟

تو امام بخاری کو کون مانتا ہے؟ اس کو تو تب مانیں جب وہ ان کے مطابق لکھے اور خدا کا شکر ہے ابھی صحیح بخاری پر ان کا ہاتھ نہیں پڑا۔ اب یہاں ایک نکتہ بیان کروں، پہلے تو میں بہت پریشان ہوا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا، یعنی یہ بددیانتی کی انتہا ہے، اگر یہ کام حدیث کی کتابوں سے شروع ہوگیا تو 100 یا 200 سالوں میں تو...... أستغفر اللہ الأمان......

ویڈیو: 2: اب میں نے یہ ٹوہ لگائی کہ انھوں نے جو یہ ماجرا امام بخاری کے ساتھ کیا، بخاری پہ بھی ہاتھ ڈال دیا، ان کو بھی نہیں چھوڑا تو جہاں بات امام بخاری کی بھی اپنے عقیدے کے مطابق نہ ملی اسے نکال دیا، پھر جا کے بات سمجھ میں آئی کہ امام بخاری نے اپنی اس شرح کا نام لکھا تھا ''الادب المفرد۔''

اب بڑی لطیف بات ہے، لکھنے والے نے ڈنڈی مارنے کے لیے، حدیثیں نکالنے کے لیے، ابواب نکالنے کے لیے، کچھ تو کرنا تھا نا!!!

الادب المفرد کتاب کوئی ایسی غیر معروف تو ہے نہیں تو اس کے اوپر ''صحیح'' لکھ دیا پہلے، ''صحیح الادب المفرد'' یعنی جو امام بخاری کی ''الادب المفرد'' تھی وہ صحیح بھی تھی، ضعیف بھی تھی اور معروف بھی تھی۔ اب البانی صاحب امام بخاری کو بھی صحیح کر رہے ہیں یہ تو صحیح کرنے پہ آئیں تو ان کا مطلب ہے کہ امام بخاری بھی غلط ہیں۔

اب میں دوسرے معنوں میں لے رہا ہوں کہ امام بخاری کے پاس بھی بقول ان کے ضعیف حدیثیں ہیں اور غیر صحیح اور موضوع ہیں تو انھوں نے کہا کہ جو امام بخاری کی صحیح احادیث تھیں وہ اس میں ہیں اور جو صحیح نہیں تھیں وہ سب نکال دیں تو یہ امام بخاری کے استاد بن گئے، یہ امام بخاری کے شیخ ہوئے، اگر آج امام بخاری حیات ہوتے تو خدا جانے ان پہ کیا گزرتی!

اب ان سے یہ پوچھیے کہ چلو امام بخاری کی جو صحیح احادیث نہیں ہیں وہ آپ نے نکال دیں تو کیا آپ امام بخاری سے بھی بڑے جرح کے امام ہیں۔ امام بخاری نے تو ابواب قائم کیے تھے اور باب جو قائم کرتا ہے محدث، وہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے، وہ اس کے ساتھ منسلک ہوتا ہے، اس باب اور اپنے مسلک کی تائید میں حدیث لاتا ہے تو تم نے سند یں

ضعیف کر کے، موضوع کر کے معاذ اللہ امام بخاری پر ظلم کیا، کاٹ ڈالا، نکال دیا۔

مگر انھوں نے ابواب بنائے تھے کہ یہ عقیدہ صحیح ہے، آپ نے وہ ابواب بھی نکال دیے، کتنے ابواب نکالے؟ 83 باب نکال دیے۔ گویا جو امام بخاری نے اپنے عقائد بیان کیے تھے اس کی 83 شاخیں کاٹ ڈالیں۔ اس کا مطلب کہ امام بخاری نے جو باب بنایا (پاؤں چومنے کے لیے) اس کا مطلب ہے کہ اکابر کے پاؤں چومنے جائز ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے ابواب نکال کر ان کی حدیثیں ضعیف کر دیں اور ان کا عقیدہ بھی غیر صحیح کر دیا۔

یہ امام بخاری، یہ امام مسلم اور ابوداود ہیں سب ...... اور یہ دونوں امام بخاری اور امام مسلم کے استاد امام ابی شیبہ ہیں، ان کا عقیدہ دیکھیے۔

الحافظ امام ابوبکر الشیبہ 235ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔ دونوں اماموں کی اس وقت جوانی تھی جب یہ شیخ اپنی آخری عمر میں پہنچ کر وصال پا گئے۔ تو انھوں نے بھی حدیث پہ ایک کتاب لکھی ''کتاب الادب'' اور ان کی تصنیف ابن (یا) ابی شیبہ بھی ہے، یہ کتاب دین کا ادب سکھاتی ہے کہ دین کا ادب کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ کی ''کتاب الادب''۔

تو انھوں نے اس کتاب سے پہلے باب کی شروعات ہی کس چیز سے کی ''بزرگوں کے ہاتھ چومنے کا بیان'' سے کی۔ اتنی تو اہمیت تھی ان کے نزدیک ائمہ کی ...... تو یہ خود کیا تھے؟ اور آج اس چیز کو شرک و بدعت تصور کرتے ہیں، اگر کوئی ہاتھ چومتا دیکھے تو کہتے ہیں یہ بدعت ہے۔ مگر جو اماموں کے شیخ ہیں وہ اپنی کتاب الادب کی شروعات ہی بزرگوں کے ہاتھ چومنے سے کرتے ہیں اور اس میں وہ 5 حدیثیں لائے ہیں۔

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بس میں نے 5 بتادیں ...... تو یہ 5 حدیثیں امام بخاری بھی لے چکے ہیں۔ ابن عمر کی روایت سے، ابن ماجہ بھی لے چکے ہیں، ابوداود بھی لے چکے ہیں ابن عمر کی روایت سے، امام ترمذی بھی سنن میں لے چکے ہیں اور امام احمد بن حنبل بھی لے چکے ہیں۔ اور اس کے بعد اگلا باب لائے ہیں (ہاتھ اور پاؤں چومنے کا باب) حدیث نمبر 3 ہے، جس میں نبی پاک (ﷺ) کی محفل میں جب کچھ یہودی آتے ہیں اور آپ (ﷺ) کے ہاتھ بھی چومتے ہیں اور پاؤں بھی چومتے ہیں اور نہ انھیں صحابہ روکتے ہیں کہ یہ کیا کر رہے ہو، سجدہ کر رہے ہو اور نہ آپ (ﷺ) نے ہی روکا۔

آج کل اگر کوئی پاؤں چومے تو کہتے ہیں کہ سجدہ کر رہا ہے!

میرے ساتھ بھی ایک واقعہ ہوا، (میں کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی ایسے ہی تھوڑا سا نیچے ہو کر...... میری بات سن رہا تھا، مصافحہ بھی نہیں کیا اس نے ...... تو اسی وقت ایک عالم صاحب کے روپ میں آدمی آیا اور اس نے دیکھ لیا اور کہا: ''سجدہ کر رہے ہو تم؟''

ویڈیو: 3: تو میں نے اس سے پوچھا: سجدے کی شرعی تعریف کیا ہے؟ سجدہ کیسے بنتا ہے؟ یہ بندہ تو صرف ایسے ہی سر جھکا کے بات سن رہا تھا تو آپ اسے سجدہ کیسے کہہ رہے ہیں؟ خدا کا خوف کرو اور شرم کرو، سجدہ ایسے ہی شریعت میں ہوتا ہے!!!

صحابہ نبی پاک (ﷺ) کے قدم چومتے تھے اور وہ سجدہ نہیں ہوتا تھا ...... اور آپ سر جھکا کر حجرِ اسود کو چومتے ہیں تو کیا وہ سجدہ بن جاتا ہے؟ خدا کا خوف ہونا چاہیے آپ کو۔

یہودیوں نے چوما اور اسی حدیث کو امام ترمذی نے، نسائی نے، ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے، حجت ہے یہ حدیث اور امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اس کو۔ مگر جن کو مرض ہے، کم علم ہے، غصہ ہے، اپنے عقیدے کے برعکس ہے تو اس کو شرک اور

بدعت کہہ دو اور اگر حدیث ہے تو اس کو ضعیف کہہ دو، تو وہ یہ کہیں گے: وہ تو یہودی تھے تو ان کا عمل کیسے سنت بن گیا؟ نادان اس قسم کا بھی اعتراض کرتے تو میں بھی ان کو جواب دیتا ہوں کہ آپ کو بغض میں چومنے والے تو دکھائی دیتے ہیں مگر وہ دکھائی نہیں دے رہا جس کے قدم چومے جارہے ہیں اور وہ دکھائی نہیں دے رہا جو منع بھی نہیں کر رہا ہے؟ تو اس کا مطلب ہے کہ قدم چُھوا رہے ہیں، سنت ہوگئی ..... اور کسے سنت کہتے ہیں؟ پوری مجلس میں صحابہ رضی اللہ عنہم دیکھ رہے ہیں اور منع بھی نہیں کر رہے ہیں تو اس کو سنت نہیں کہتے تو اور کیا کہتے ہیں؟

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر کوئی مشائخ، استاذ، عالم اپنے پاؤں چھواتا رہے، ہر کسی کی ایک حد ہے اور ادب یہ ہے کہ مشائخ و عالم، استاذ و بزرگ خدا کا خوف رکھ کر چھوائے اور چھوٹا ادب سے اس کے پاؤں چومتا رہے...... یہ دین کے ادب ہیں۔

وکیع کی روایت ہے امام سفیان سے ...... ابو عبیدہ بن جراح گورنر شام کہتے ہیں:

"جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی طرف سفر کر کے آئے تو وہ ان کے ہاتھ چومتے تھے۔"

اس کا مطلب ہے کہ یہ سنت ہے اور ہر امام نے جاری رکھی۔ اور یہ ہی نہیں بلکہ امام مسلم نے امام بخاری سے اجازت طلب کی کہ "مجھے اجازت دو کہ میں آپ کے قدم چوموں" اور امام بخاری کا عقیدہ کیا ہے؟ انھوں نے اپنے استاذ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ سے کہا: کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں، میرا دل کرتا ہے کہ میں آپ کے قدم چوموں؟ اور اب البانی نے یہاں تک کی ساری حدیثیں نکال دیں، امام بخاری کے قائم کردہ ابواب نکال دیے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ ائمہ کے عقائد تھے مگر اس کو نکالنے والے نے نہیں دیکھا اور صحیح کہنے کے لیے جو کہ عقیدے کے خلاف تھے ان—

کی کتابوں سے نکال دیے۔ اب معیار یہ بن گیا کہ حقیقت میں صحیح اور غیر صحیح کا، صحیح ضعیف اور موضوع کا اور درست اور غلط کا پیمانہ نہ قرآن ہے نہ حدیث ہے، نہ اصول ہے، نہ فن ہے، نہ علم ہے۔ جو عقیدہ بن گیا، جس پر قائم ہیں وہ ہی عقیدہ ہے، جو عقیدے کے مطابق ہوئی وہ قبول کیا اور جو عقیدے کے خلاف ہوئی رد کیا۔

محترم ڈاکٹر طاہر القادری کی تنقید کا جواب: امام بخاری کی کتاب ''الادب المفرد'' دو عدد MS-Word فائلوں میں دستیاب ہے۔ اس کتاب کا نسخہ محمد فواد عبد الباقی کا مرتب کردہ ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی نے اسی مرتب کردہ نسخے کی تحقیق و تخریج کر کے اس کو دو حصوں میں تقسیم و شائع کیا ہے، یعنی، صحیح الادب المفرد اور ضعیف الادب المفرد۔ صحیح الادب المفرد اور ضعیف الادب المفرد بھی دو عدد MS-Word فائلوں میں دستیاب ہے۔ اس ربط سے آپ چاروں کتب ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ سب کو علم ہے کہ حضرت الامام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں بھی کتاب الادب کو شامل کیا ہے۔ صحیح بخاری یہاں سے دو عدد ورڈ فائلوں کی شکل میں ڈاؤن لوڈ کیجیے۔

صحیح بخاری کی کتاب الادب، حدیث نمبر 5625 سے شروع ہوتی ہے اور 5872 پر ختم ہوتی ہے اور یہ کل احادیث 248 ہوئیں اور اس میں 128 ابواب ہیں۔ دوسری طرف امام بخاری نے جب کتاب ''الادب المفرد'' تحریر کی تو اس میں ''ادب'' سے متعلق 1322 احادیث (بحوالہ ''الادب المفرد'' نسخہ فواد عبد الباقی) جمع فرمائیں۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ''صحیح بخاری'' میں 248 احادیث بیان کی ہیں تو اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں 1322 احادیث کیوں بیان کی ہیں؟

سادہ سی حقیقت صرف اتنی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے جو کتاب ''الادب المفرد'' مرتب کی تو اس میں انھوں نے ادب کے بارے میں ہر قسم کی احادیث تحریر کر دیں جس میں صحیح، حسن اور حسن سے کم درجے کی احادیث بھی شامل تھیں لیکن چونکہ صحیح بخاری میں ان کا معیار بہت اونچا تھا، اس لیے اس میں وہی احادیث شامل کی گئیں جو سند کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کی تھیں۔ یہ بات ڈاکٹر قادری صاحب کے علم میں نہیں آئی اور انھوں نے کتاب ''الادب المفرد'' کی ساری احادیث کو صحیح بخاری کے درجے پر رکھ دیا، حالانکہ اگر صحیح بخاری کی ''کتاب الادب'' پر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی غور کر لیتے تو فوراً فرق معلوم ہو جاتا۔

ڈاکٹر طاہر القادری نے جس اصل ''الادب المفرد'' کی بات کی ہے، گمان غالب ہے کہ وہ فواد عبد الباقی ہی کی مرتب کردہ ہوگی کیونکہ یہی نسخہ ان دنوں رائج ہے اور اسی میں جملہ احادیث کی تعداد 1322 بیان ہوئی ہے۔

حال ہی میں علامہ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق کردہ مکمل ''الادب المفرد'' شائع ہوئی ہے جس کی بنیاد فواد عبد الباقی کی ترتیب پر ہے، یعنی اس تالیف میں علامہ البانی نے مکمل 1322 احادیث پیش کی ہیں اور ان کی تحقیق و تخریج کی ہے۔

اس طرح ڈاکٹر قادری کا یہ الزام باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ علامہ البانی نے امام بخاری رحمہ اللہ کی ''الادب المفرد'' سے 330 احادیث نکال دی ہیں۔ فی الحال ہم نے قارئین کے سامنے علامہ البانی کی دونوں کتابیں، یعنی: صحیح الادب المفرد اور ضعیف الادب المفرد پیش کر دی ہیں اور ہمیں حیرت تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر علامہ البانی کی صرف ''صحیح الادب المفرد'' پر ہی کیوں پڑی؟ ''ضعیف الادب المفرد''

پر کیوں نہیں پڑی؟

تنقید کا طریق کار یہ ہے کہ پہلے کسی شخص کے پورے کام کا جائزہ لیا جائے اور اس سے مکمل واقفیت حاصل کر کے ہی تنقید کی جائے۔ علمی دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب ''ضعیف الادب المفرد'' پر تبصرہ بھی ارشاد فرما دیتے تاکہ ان کا موقف سامنے آ جاتا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ بدگمانی تو نہیں کرتے کہ انھوں نے جان بوجھ کر اسے چھپا لیا ہوگا، البتہ ہم حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہ کہنے کے مجاز ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے شاید ''ضعیف الادب المفرد'' نہ گزری ہوگی۔ ان سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنی رائے ضرور پیش فرمائیں۔

صحیح الادب المفرد کے مقدمے میں علامہ البانی لکھتے ہیں: ''فواد عبدالباقی کی نمبر شماری کے مطابق ہم تک احادیث مرفوعہ اور آثار موقوفہ کی تعداد 1322 پہنچی ہے۔ ضعیف احادیث کو الگ کر لینے کے بعد صحیح احادیث کی تعداد 998 اور ضعیف احادیث کی تعداد 215 ہے۔''

یعنی صحیح الادب المفرد کی 998 اور ضعیف الادب المفرد کی 215 احادیث کو ملایا جائے تو جملہ 1213 احادیث ہوتی ہیں، حالانکہ یہ صرف نمبر شماری کا مسئلہ ہے ورنہ صحیح اور ضعیف دونوں کتب کی احادیث کا تمام اصل متن وہی ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ کی ''اصل الادب المفرد'' کی احادیث کا متن ہے۔

ویسے یہ بھی اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ علامہ البانی کی نئی تحقیق کردہ ''الادب المفرد'' میں تمام کی تمام 1322 احادیث موجود ہیں۔

اب دیکھیے کہ علامہ البانی نے 215 احادیث کو ''الادب المفرد'' سے نکالا نہیں بلکہ

اسے ''ضعیف الادب المفرد'' میں شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے علامہ البانی رحمہ اللہ پر ''اخراج'' کا جو الزام لگایا ہے..... اگر اس تھیوری کو بنیاد بنایا جائے تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسی طرح امام بخاری کی ذات پر بھی یہی الزام لگ سکتا ہے کیونکہ اوپر یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ صحیح بخاری کی کتاب الادب میں صرف 248 احادیث ہیں جبکہ ''الادب المفرد'' میں امام بخاری نے 1322 احادیث جمع کی ہیں، حالانکہ موضوع تو وہی ''ادب'' کا ہے۔ اگر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی تھیوری کو یہاں بھی لاگو کیا جائے تو پھر ''اخراج'' کا یہی الزام امام بخاری کی ذات پر کیونکر نہ لگے گا؟

ڈاکٹر صاحب نے شاید ضعیف الادب المفرد پر نگاہ نہیں دوڑائی کہ البانی رحمہ اللہ نے وہ حدیثیں نکال باہر نہیں کیں بلکہ ان پر ایک اور کتاب ترتیب دی ہے۔

اب انصاف پسند قارئین اندازہ لگائیں کہ نکال باہر کرنے اور الگ ترتیب دینے میں کتنا فرق ہے؟

علامہ البانی نے امام بخاری کی کتاب ''الادب المفرد'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک کا نام ''صحیح الادب المفرد'' اور دوسری کا نام ''ضعیف الادب المفرد'' رکھا کہ عام مسلمانوں کو پتہ چلے کہ صحیح احادیث اور ضعیف احادیث کون کون سی ہیں؟

جیسے کہ خود امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری کی ''کتاب الادب'' میں 1322 احادیث کے بجائے صرف 248 احادیث پر ہی انحصار کیا، اس سے پتہ چل گیا کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے امام بخاری کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کی کتاب ''الادب المفرد'' کی تخریج کر کے دو حصوں میں تقسیم کیا نہ کہ اخراج کیا۔

جیسے مثال کے طور پر ایک استاذ ایک ہی کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے تو اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اتنے شاگردوں کا اخراج کیا بلکہ اسے یہ کہا جائے گا کہ اس نے آسانی پیدا کرنے کے لیے ایک ہی کلاس کے دو گروپ بنا دیے۔

آخری بات یہ کہ......

ہم لوگ علامہ البانی صاحب کے اندھے مقلد نہیں ہیں۔ البانی صاحب نے جن احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے، وہ اگر ڈاکٹر صاحب کے خیال میں صحیح احادیث ہیں تو محدثین کے معیار کے مطابق انھیں صحیح ثابت کریں اور علمی انداز میں البانی صاحب کی غلطی واضح کر دیں۔ ہمیں اپنی رائے سے رجوع کرنے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہ ہوگی۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو ہم بلا کسی تعصب کے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان احادیث کے بارے میں البانی صاحب کی تحقیق ہی درست ہے۔

تخریج کیا ہے؟: الشیخ ڈاکٹر سہیل حسن حفظہ اللہ اپنی ایک کتاب "معجم اصطلاحات حدیث" کے صفحہ نمبر 123 پر تخریج کے بارے میں لکھتے ہیں:

التخریج: حدیث کے اصل ماخذ کا بیان، مع اس کے مختلف طرق و روایات، جن کا ذکر کرنا ضروری ہو، یعنی اس فن میں ماخذ کے ساتھ یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ سند کا دار و مدار کس راوی پر ہے اور پھر رجال سند اور متن کی تحقیق اور اس روایت پر محدثین کا کیا حکم ہے۔ اگر حکم بیان نہیں کیا گیا تو خود اس پر صحت یا ضعیف کا حکم لگانا۔ صرف ماخذ کا بیان کر دینا، بغیر اس کی روایت بتائے اور بغیر حکم لگائے، تخریج نہیں کہلاتا، یہ صرف حدیث کی نسبت بتاتا ہے۔

تخریج کے دو طریقے ہیں:

- اطراف اسانید کے حوالے سے تخریج کرنا۔
- طرق اسانید کے حوالے سے تخریج کرنا۔

پہلا طریقہ مندرجہ ذیل حالات میں استعمال کیا جاتا ہے:

① جب روایت کے تمام طرق علتوں والے ہوں۔

② جب متن حدیث میں کمی یا زیادتی ہو۔

③ جب سند میں کوئی مخالفت یا ترجیح دینا مقصود ہو۔

④ جب الفاظ حدیث میں ترجیح مطلوب ہو، چاہے وہ صحیحین ہی میں کیوں نہ ہو۔

⑤ جب اصل راوی حدیث مختلط ہو۔

⑥ اگر سند میں مدلس راوی ہو اور اس نے سماع کی صراحت نہ کی ہو۔

⑦ اگر حدیث کے بارے میں یہ معلوم کرنا ہو کہ وہ متواتر یا مشہور یا غریب ہے۔

⑧ اگر سند کے عالی یا نازل ہونے کے بارے میں معلوم کرنا ہو۔

⑨ اگر حدیث مختلف طرق سے مرسل یا متصل یا مرفوع یا موقوف ہو۔

⑩ اگر حدیث کی تقویت مطلوب ہو، متابعت کے ذریعے سے۔

اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں، تاہم اہم اسباب یہی ہیں۔

دوسرا طریقہ اس وقت استعمال کیا جائے گا، جب سند یا متن میں کوئی علت نہ ہو، سند کسی ایک راوی کے گرد گھومتی ہو، اس صورت میں پہلا طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسرے مرحلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ جس روایت کی تخریج مطلوب ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

① کسی متعین کتاب سے کوئی حدیث معلوم کرنی ہو، جیسے ابوداود یا مسند احمد سے کسی حدیث کی تخریج کرنا ہے تو اس صورت میں وہ حدیث اس کتاب میں سے ڈھونڈنے کے بعد، اس کی سند کی تحقیق کی جائے گی اور پھر اس پر حکم لگایا جائے گا۔ اگر حدیث کی تقویت مطلوب ہے تو متابعات اور شواہد کی تلاش ہوگی اور متن کے بارے میں دیکھا جائے گا کہ وہ منکر یا شاذ تو نہیں ہے۔

② کسی حدیث کو بغیر کسی تعین کے تلاش کرنا۔ اس صورت میں پہلے یہ حدیث اس کے ماخذ سے تلاش کی جائے گی اور تمام اسانید جمع کی جائیں گی۔ مذکورہ دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کے ذریعے سے اور اس کے بعد اس حدیث کی صحت۔

درج بالا مقالے سے قارئین کو علم ہو گیا ہوگا کہ...... تخریج کیا ہے اور اس کی ضرورت کب اور کہاں ہوتی ہے اور اسے کس طریقے سے عمل میں لایا جاتا ہے؟ اخراج کے لغوی معنی تو کسی چیز کو خارج کرنا ہیں۔ مگر اصول حدیث کے تحت، اخراج کے معنی ہیں: کسی چیز کا درج کرنا، جیسے ''أخرجه البخاري في الأدب المفرد'' یعنی بخاری نے اس کو الادب المفرد میں درج کیا، یا ''أخرجه أبو داود'' یعنی اسے ابوداود نے درج کیا ہے، یا ''أخرجه سفيان في جامعه'' یعنی سفیان نے اپنی جامع میں اسے درج کیا ہے۔

لفظ اخراج سے ''تخریج'' کی مناسبت یوں ہے کہ گویا ایک چیز مستور تھی، چھپی ہوئی تھی، اسے ڈھونڈ کر باہر نکالا گیا اور لوگوں کے علم میں لایا گیا۔

امید ہے کہ قارئین کی سمجھ میں آچکا ہوگا کہ تخریج اور اخراج کیا ہے؟

اب انصاف سے بتایئے کہ کیا علامہ البانی نے احادیث کا اخراج کیا ہے؟ یقیناً نہیں!! بلکہ سچ اور حق تو یہ ہے کہ علامہ البانی نے امام بخاری ؒ کی کتاب الادب المفرد کو

دو حصوں میں تقسیم کیا ہے جو ''صحیح الادب المفرد'' اور ''ضعیف الادب المفرد'' پر مشتمل ہیں، جن میں سے ''ضعیف الادب المفرد'' پر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی نظر نہیں پڑی یا شاید ظاہر کرنا گوارا نہیں کیا اور پھر..... کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ اصول حدیث پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے ''اخراج'' کے لغوی معنی تو لے لیے مگر اصول حدیث کے مطابق اصطلاحی معنی نہیں لیے۔

تحقیق کیا ہے؟: تحقیق کے دو معنی ہیں:

① کتاب کی نسبت مؤلف کی طرف صحیح ہے یا غلط ہے۔

② کسی پرانی کتاب کو جس میں الفاظ کی غلطی ہے یا کسی آدمی کا نام غلط لکھا گیا تو اس کو نکال کر صحیح طریقے سے پیش کرنا۔

محدث کے سامنے جو اصل اصول ہے وہ علم اصول حدیث (جسے مصطلح کا علم بھی کہتے ہیں) ہے۔ اگر کسی عالم کو اس اصول کا علم ہے تو وہ محدث کہلاتا ہے۔

محدثین دو طرح کے ہوتے ہیں:

① ایک وہ جنھوں نے صرف احادیث کو جمع کیا لیکن ان پر حکم نہیں لگایا۔

② ایک وہ جنھوں نے ہر حدیث پر حکم بھی لگایا کہ یہ صحیح ہے یا حسن ہے یا ضعیف یا مرفوع ہے۔

اب جیسے صحیح بخاری اور صحیح مسلم ہیں اس میں دونوں ائمہ محترمین نے خود کہا ہے کہ ہم نے صرف صحیح احادیث جمع کی ہیں، اس لیے البانی رحمہ اللہ نے ان دونوں کتابوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔

باقی جو دیگر سنن کی کتابیں ہیں، جیسے سنن ابی داود یا سنن نسائی یا سنن ابن ماجہ......

تو ان کتب کے متعلقہ مؤلفین نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس میں ہر حدیث صحیح ہے۔ امام ترمذی تو خود حدیث بیان کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے یا یہ حدیث ضعیف ہے۔

مزید یہ کہ امام بخاری نے بھی اپنی کتاب ''الادب المفرد'' کے بارے میں یہ دعویٰ قطعاً نہیں کیا کہ اس میں کوئی حدیث ضعیف نہیں ہے۔

اسی طرح امام حاکم نے 373ھ کے بعد چوتھی صدی میں حدیثیں جمع کیں اور اپنی کتاب ترتیب دی جس کا نام ہے: ''المستدرك على الصحيحين'' یعنی وہ حدیثیں جو ان کے خیال میں صحیح تھیں لیکن امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی صحیحین میں درج نہیں کیں۔

پھر امام ذہبی نے ان کی کتاب پر حاشیہ لکھا اور تقریباً ایک تہائی احادیث کے بارے میں امام حاکم سے اختلاف کرتے ہوئے انھیں یا تو ضعیف قرار دیا یا موضوع، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر کسی محدث نے احادیث کی سند بیان کر دی تو وہ بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ بعد میں اگر کوئی دوسرا محدث آئے اور اس سند میں کسی ضعف کی نشاندہی کرے تو یہ ''الدين النصيحة'' کے بالکل مطابق ہے، جیسے علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ جو البانی رحمہ اللہ سے بہت پہلے کے جید محدث تھے انھوں نے ''تفسیر ابن کثیر'' اور ''مسند امام احمد'' پر تخریج کی مگر مکمل نہ کر سکے اور وفات پا گئے، اس میں انھوں نے تفسیر ابن کثیر اور مسند احمد کی لاتعداد ضعیف احادیث کی نشاندہی کی تھی۔

اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں آنے والا محدث ایک پرانے محدث پر برتری قائم کر رہا ہے، بلکہ علمی اور اصولی حقیقت یہ ہے کہ ایک محدث نے حدیثوں کی سندیں

جمع کر کے بہت بڑا کام کیا ہے تو دوسرے نے اس پر حکم لگا کر بھی ایک بہت بڑا کام کیا ہے اور دونوں بری الذمہ ہیں۔

صحیح بخاری کے ابواب اور امام بخاری کا عقیدہ: اقتباس: اصلی پوسٹ بذریعہ ڈاکٹر طاہر القادری: (امام بخاری نے تو ابواب قائم کیے تھے اور باب جو قائم کرتا ہے محدث وہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے، وہ اس کا مسلک ہوتا ہے، اس باب اور اپنے مسلک کی تائید میں حدیث لاتا ہے۔)

صحیح بخاری یا صحیح مسلم میں ابواب کی بنیاد ترتیب کے لحاظ سے ہے۔

جواب

ایک مشہور فقرہ ہے: ''فقه البخاري في تراجمه'' صحیح بخاری کے ابواب کے عناوین میں امام بخاری کی فقہ۔

امام بخاری نے اپنی ''صحیح بخاری'' کے ابواب کے جو عنوان قائم کیے ہیں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ احادیث اس باب سے مطابقت نہیں کرتیں مگر جب بڑے غور سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ امام بخاری نے بالکل اسی باب پر احادیث ترتیب دی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ صحیح بخاری کھولیں گے تو فہرست میں سب سے پہلا آپ کو جو باب (عنوان) ملے گا وہ ہے:

کتاب الوحی، اس کے بعد کتاب الایمان، اس کے بعد کتاب العلم، اس کے بعد کتاب الوضوء، اس کے بعد حیض، تیمم اور اس کے بعد آتا ہے کتاب الصلاۃ۔

امام بخاری نے ترتیب کے لحاظ سے ایسا مرتب کیا ہے کہ نبی پاک (ﷺ) پر سب سے پہلے وحی نازل ہوئی، اس کے بعد اس وحی پر ایمان لایا گیا، اس کے بعد علم آتا ہے، اس کے بعد نماز لیکن چونکہ نماز بغیر طہارت کے نہیں ہوتی، اس لیے کتاب الصلاۃ

سے پہلے طہارت، وضو، حیض، تیمم کے ابواب لے آئے۔

اب دیکھیے کہ اس وضاحت کے مقابلے میں ڈاکٹر طاہر القادری کا بلا دلیل یہ کہنا ''اور باب جو قائم کرتا ہے محدث وہ اس کا عقیدہ ہوتا ہے۔'' کس حد تک درست ہے؟

کوئی تو پوچھے ڈاکٹر صاحب سے کہ وحی اور اس پر ایمان، علم، وضو، تیمم، نماز وغیرہ، کیا صرف امام بخاری کا عقیدہ تھا یا یہ تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے؟؟ اور یہ سوال بھی ہمارے ذہن میں ضرور انگڑائیاں لیتا ہے کہ جب ''غیر مقلدین'' پر طعنہ زنی کرنا مقصود ہو تو فرمایا جاتا ہے کہ خواہش نفسانی کے یہ لوگ پرستار ہوتے ہیں کہ جو حدیث جی کو لگی لے لی اور جو سمجھ میں نہ آئی، اسے چھوڑ دیا، یعنی اتباع سنت کے بجائے خواہش نفسانی پر عمل کیا۔ اب کیا یہی سوال یہاں اٹھایا نہیں جاسکتا کہ چونکہ ہاتھ پاؤں چومنے والی احادیث آپ کو مرغوب لگتی ہیں (قطع نظر اس کے، کہ وہ صحیح ہوں یا ضعیف)، لہٰذا آپ ایسی احادیث پر عمل کو مقدم جانتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ رفع الیدین یا آمین بالجہر کی صحیح احادیث بیان کرتے ہیں تو چونکہ وہ آپ کے اپنے مسلک کے خلاف ہوتی ہیں، لہٰذا انھیں بآسانی صرف اتنا کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ امام بخاری کے ''اپنے عقیدے'' کو بیان کرتی ہیں۔

یعنی امام بخاری جو احادیث بیان کریں، اسے پرکھنے اور اس پر عمل کرنے کا معیار آپ کا اپنا نفس اور آپ کی اپنی پسند ہے، محدثین کا قائم کردہ معیار نہیں۔

ہاتھ/ پاؤں چومنے والی روایات کا جواب: اقتباس: اصلی پوسٹ بذریعہ ڈاکٹر طاہر القادری: (جو میں نے متعلقہ باب کھولا (باب نمبر 484، ہاتھ چومنے کا بیان) اس کی حدیث 972 دیکھی تو اس میں کوئی نہیں، حدیث ہی نکال دی گئی، حدیث 972 ہی

نکال دی گئی۔)

جواب یہ حدیث امام بخاری کی کتاب ''الادب المفرد'' سے نکالی نہیں گئی بلکہ اسے علامہ البانی نے ''ضعیف الادب المفرد'' میں شامل کیا ہے کیونکہ یہ ضعیف ہے۔

اقتباس: اصلی پوسٹ بذریعہ ڈاکٹر طاہر القادری: (پھر میں نے آگے دیکھا تو آگے جو حدیثیں بتائی ہیں (حدیث نمبر 974، جس میں تابعین نے صحابہ کے ہاتھ چومے تھے) وہ اگلی حدیث جس میں تابعی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ چومے تھے وہ بھی نکال دی اور پھر میں نے آگے دیکھا (حدیث نمبر 975، پاؤں چومنے کا باب) تو وہ سارا باب ہی نکال دیا، وہ سارا عنوان ہی نکال دیا، اس میں جو حدیثیں ہیں وہ دو لائے تھے (حدیث 975 اور 976 ..... دو حدیثیں امام بخاری کی وہ دونوں نکال دیں)۔

جواب حدیث نمبر 974 جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ کو بوسہ دیا گیا، یہ ضعیف ہے کیونکہ اس میں ''علی بن جدعان'' راوی ضعیف ہے۔ حدیث نمبر 975، اس میں یہودیوں کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومنے کا بیان ہے۔ یہ حدیث بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں راویہ ''ام ابان'' مجہول ہے، مجہول اسے کہتے ہیں جس کے حالات معلوم نہیں ہوتے۔

اقتباس: اصلی پوسٹ بذریعہ ڈاکٹر طاہر القادری: (الحافظ امام ابوبکر الشیبہ 235ھ میں ان کی وفات ہوگئی۔ دونوں اماموں کی اس وقت جوانی تھی جب یہ شیخ اپنی آخری عمر میں پہنچ کر وصال پا گئے۔ تو انھوں نے بھی حدیث پہ ایک کتاب لکھی ''کتاب الادب'' اور ان کی تصنیف ابن (یا) ابی شیبہ بھی ہے، یہ کتاب دین کا ادب سکھاتی ہے کہ دین کا ادب کیا ہے۔

ہر امام کی کتاب میں کتاب الادب ہے اور کچھ اماموں نے الگ کتابیں بھی لکھی ہیں جیسے امام بخاری کی ''الادب المفرد'' اور شیخ ابی شیبہ کی ''کتاب الادب'' تو انھوں نے اس کتاب کے پہلے باب کی شروعات ہی کس چیز سے کی ''بزرگوں کے ہاتھ چومنے کا بیان'' سے کی۔

جواب امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ نے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام ''مصنف ابن ابی شیبہ'' ہے، اس کی بہت ساری جلدیں ہیں اور ہر جلد کا ایک عنوان ہے۔

① ایک جلد نمبر 13 ہے جس کا عنوان ہے ''الادب'' جس میں امام ابن ابی شیبہ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں چومنے والی روایات ذکر کی ہیں۔

اس جلد کی تحقیق ''محمد عوامہ'' نے کی ہے اور اس میں 25812 سے لے کر 27260 تک صرف ادب کے بارے میں احادیث ہیں۔

② اور ایک جلد نمبر 20 ہے جس کا نام ''الرد علی ابی حنیفہ'' ہے۔ اور اس میں 37202 سے لے کر 37688 تک احادیث اور 125 ابواب ہیں۔ 125 ابواب میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے 125 مسائل میں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے، یعنی 786 احادیث مرتب کر کے ثابت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے۔ اور ابن ابی شیبہ کی وفات 235ھ میں ہوئی، یعنی امام بخاری سے پہلے فوت ہو گئے جبکہ امام بخاری کی وفات 256ھ میں ہوئی، یعنی ان سے 21 سال پہلے امام ابن ابی شیبہ وفات پا گئے۔ اب دیکھیے کہ محترم ڈاکٹر طاہر القادری کو مصنف ابن ابی شیبہ کی جلد نمبر 13 فی الادب تو نظر آ گئی مگر اسی مصنف ابن ابی شیبہ کی جلد نمبر 20 فی رد ابی حنیفہ نظر نہیں آئی کیونکہ اس میں امام ابن ابی شیبہ نے

امام ابوحنیفہ کی حدیث میں مخالفت ظاہر کی ہے۔

اقتباس: اصلی پوسٹ بذریعہ ڈاکٹر طاہر القادری (میں نے جب غور سے دیکھا تو باب (حدیث 484، ہاتھ چومنے کا بیان) والا پورا باب ہی نکال دیا اور جو باب ان کے عقیدے کے خلاف تھے وہ سارے ابواب ہی نکالتے چلے گئے اور آگے دیکھا تو (باپ کا بیٹی کو چومنے والا باب) یہ باب نمبر:443 تو نکالتے نکالتے انھوں نے یہ بیٹی کو چومنے والا باب ثابت رکھا اور اس باب کا نمبر:389 ہے۔)

جواب پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ہاتھ پاؤں چومنے کی جو احادیث ہیں ان کی سندیں کتنی صحیح ہیں کیونکہ اوپر اس مسئلے کی احادیث کی سندیں بیان کی جا چکی ہیں کہ وہ ضعیف ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان میں سے کچھ احادیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے مگر امام مالک رحمہ اللہ نے بزرگوں کے ہاتھ پاؤں چومنے کو مکروہ قرار دیا ہے، یعنی اگر کسی کے ہاتھ پاؤں اس کی تعظیم یا اس کی بڑائی سے، یعنی اس کے جاہ وجلال کے ڈر سے چومے جائیں تو مکروہ ہیں اور اگر اللہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے یا اس کے علم کی بنیاد پر یا اس کے شرف کی وجہ سے اس کے ہاتھ چومے جائیں تو یہ صحیح ہے (مگر اس میں فتنہ کا ڈر نہ ہو تو)۔ جیسے امام نووی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

«تَقْبِيلُ يَدِ الرَّجُلِ لِزُهْدِهٖ وَصَلَاحِهٖ أَوْ عِلْمِهٖ أَوْ شَرَفِهٖ أَوْصِيَانَتِهٖ أَوْ نَحْوِ ذٰلِكَ مِنَ الْأُمُورِ الدِّينِيَّةِ لَايُكْرَهُ بَلْ يُسْتَحَبُّ، فَإِنْ كَانَ لِغِنَاهُ أَوْ شَوْكَتِهٖ أَوْجَاهِهٖ عِنْدَ أَهْلِ الدُّنْيَا فَمَكْرُوهٌ شَدِيدَ الْكَرَاهَةِ. وَقَالَ أَبُو سَعِيدِ الْمُتَوَلِّي: لَايَجُوزُ»

"آدمی کے ہاتھ کا چومنا اس کے زہد، نیکی، علم، شرف، حفاظت دین اور اسی

طرح کے دوسرے دینی امور کی بنا پر ہو تو مکروہ نہیں بلکہ مستحب ہے لیکن ایسا کرنا اس کی دولت یا اس کی طاقت یا اہل دنیا کے نزدیک اس کی وجاہت کی بنا پر ہو تو انتہائی مکروہ ہے، ابو سعید متولی کہتے ہیں: جائز نہیں ہے۔''[1]

اور ایک جگہ ہے:

«أَنَّ يَهُودِيَّيْنِ أَتَيَا النَّبِيَّ ﷺ فَسَأَلَاهُ عَنْ تِسْعِ آيَاتٍ..... اَلْحَدِيثُ وَفِي آخِرِهِ: فَقَبَّلَا يَدَهُ وَرِجْلَهُ» قَالَ التِّرْمِذِيُّ: حَسَنٌ صَحِيحٌ»

''دو یہودی نبی ﷺ کے پاس آئے تو انھوں نے آپ سے 9 نشانیوں کے بارے میں پوچھا۔ صفوان نے یہ حدیث آخر تک بیان کی اور اس کے آخر میں کہا: ''پھر ان دونوں نے آپ کے ہاتھ پاؤں چومے۔'' ترمذی نے کہا: یہ حسن صحیح حدیث ہے۔''[2]

ان احادیث کا مطلب ہے کہ ہاتھ اور پاؤں چومنا جائز ہیں مگر ان کی بھی کچھ شرائط ہیں جیسے کہ ان احادیث میں بیان کی گئی ہیں اور جسے اقوالِ ائمہ سے ثابت بھی کیا گیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے صرف ان احادیث کو ضعیف قرار دیا جن کی اسناد راویوں کے اعتبار سے ضعیف تھیں اور انھوں نے ہر حدیث کو دلیل سے ضعیف ثابت کیا۔ ہاتھ اور پاؤں چومنے کا مسئلہ تو صحیح ہے مگر علامہ البانی نے صحیح احادیث کو الگ سے ترتیب دیا تا کہ صحیح اور ضعیف میں تمیز ہو جائے۔

مثال کے طور پر اسراء اور معراج کا واقعہ صحیح ہے مگر اس کے بارے میں بہت سی

[1] فتح الباري، ج: 11، باب الأخذ باليد، تحت حديث: 6265. [2] فتح الباري، ج: 11، باب الأخذ باليد، تحت حديث: 6265

احادیث ضعیف ہیں اور اگر کوئی محدث ان پر حکم لگا کر انھیں ضعیف قرار دے کر الگ کرے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ واقعہ غلط قرار دیا جا رہا ہے کیونکہ اس واقعے کے بارے میں صحیح احادیث بھی ہیں۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علامہ البانی ؒ نے صرف ان احادیث پر حکم لگایا جو باعتبار سند ضعیف تھیں نہ کہ صحیح احادیث کا رد کیا ہے۔

اب صاحبانِ علم و شعور ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اگر شیخ البانی ؒ نے "الادب المفرد" کی تخریج کر کے صحیح اور ضعیف احادیث علیحدہ کر دیں تو وہ موردِ الزام ٹھہریں اور اگر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب (جو ویسے تو امام بخاری ؒ کا ظاہری دم بھرتے ہیں) جب صحیح بخاری کی وہ تمام احادیث جو فاتحہ خلف امام یا رفع الیدین وغیرہ پر موجود ہیں، ان کو سرے ہی سے نہ مانیں تو یہ کوئی قابلِ اعتراض یا قابلِ گرفت معاملہ نہیں؟

کیا کوئی انصاف پسند مسلمان ہمیں یہ بتانا گوارا فرمائے گا کہ کسی بزرگ کے بارے میں یہ کہنا کہ میں اس کا بہت احترام کرتا ہوں، پھر پلٹ کر اس کی بات کو نہ ماننا۔ ایسا دوغلا رویہ بزرگ کا احترام کرنا ہے یا بزرگ کی تحقیر کرنا!؟

برطانیہ میں مسلمانوں کے سیاسی و مذہبی حالات کے متعلق انٹرویو

مارچ 2004ء کے اوائل میں مشہور انگریزی جریدہ ''اکانومسٹ'' کے رپورٹر نے راقم الحروف سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا جس میں برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے حوالے سے چند سوالات کیے گئے تھے۔ برطانوی پریس کی عمومی روایات کے مطابق اکانومسٹ نے اس انٹرویو میں سے اپنے مطلب کی چند باتیں ''یورپ میں اسلام'' کے عنوان سے ایک فیچر میں زیب قرطاس کی تھیں لیکن مجھ سے کیے گئے اکثر سوالات کے جوابات داخل در دفتر کر دیے گئے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ قارئین کے افادے کے لیے اپنی معروضات کو رقم کر دیا جائے۔

ملاحظہ کیجیے رپورٹر کے سوالات اور میرے جوابات:

سوال مغربی یورپ میں ایک سیکولر نظام نافذ ہے، مسلمان اس نظام کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا پسند کریں گے؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم دین اور ریاست میں جدائی کے قائل نہیں ہیں۔ اسلام جہاں انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط کرتا ہے وہاں دنیا میں ایک پاکیزہ معاشرہ تشکیل دینے کے لیے ان تمام احکامات وفرامین کو نافذ کرنے کا مطالبہ بھی کرتا ہے جو اس کائنات

کے خالق نے اس دنیا کو گہوارۂ امن و سلامتی بنانے کے لیے نازل فرمائے ہیں۔

ہم مغربی یورپ میں ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم اپنے عقیدے، کلچر اور نظام کو دوسروں پر زبردستی تھوپنے کی کوشش کریں لیکن ہمیں اس بات کا حق ضرور پہنچتا ہے کہ ہم اپنی اقدار و روایات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں اور اس سلسلے میں ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ نہ کھڑی کی جائے۔ اگر پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک میں عیسائی اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرسکتے ہیں تو یورپ میں مسلمانوں کے اپنا طرزِ حیات اپنانے میں کیوں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ فرانس میں مسلم خواتین کے حجاب پر پابندی اس کی نمایاں مثال ہے۔ کیا ہمیں اس بات کا حق نہیں کہ ہم شادی بیاہ، خاندان اور انسانی سلوک کے ضمن میں اسلام کی اعلیٰ اقدار کو لوگوں کے سامنے پیش کریں اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہم اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانیت کو پیش آمدہ مشکلات، شراب نوشی، کثرت فواحش، ایڈز وغیرہ کے بارے میں ہمارے پاس بہتر حل موجود ہیں۔ اگر مارکیٹ میں ہر شخص کو اپنا مال پیش کرنے کی اجازت ہے تو عالم اخلاقیات میں ہمیں بھی اپنی اقدار پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

اور جہاں تک اسلامی سیاسی نظام کا تعلق ہے، جسے عموماً خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اگر اس خطے کی معتد بہ اکثریت اسلام کو قبول کر لیتی ہے تو یہ اس کا دستوری حق بن جاتا ہے کہ وہ جس طرزِ حیات کو پسند کرتی ہے اسے نافذ کرنے کی بھی بات کرے۔

سوال یورپ کی سیاسی پارٹیوں سے غیر مسلم لیڈر وابستہ ہیں۔ کیا مسلمان ان پارٹیوں سے وابستہ ہونا پسند کریں گے یا اپنی پارٹیاں تشکیل دینا چاہیں گے؟

جواب یہ ایک حقیقت ہے کہ گو مسلمانوں کی تعداد صرف انگلستان میں بیس لاکھ کے قریب ہے لیکن لوکل کونسلوں، ایوانِ پارلیمنٹ، سرکاری دفاتر اور سفارتی حلقوں میں ان کی نمائندگی کا تناسب ان کی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جہاں تک ہمارے حقوق کا تعلق ہے وہ بھی ایک طویل سیاسی جدوجہد کے بعد حاصل ہو سکتے ہیں۔

صرف ایک مسجد کا قیام بھی طویل جدوجہد کا مرہونِ منت ہوتا ہے کہ جس میں مقامی کونسل کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے سو سے اوپر نجی مدارس موجود ہیں لیکن اب تک صرف دو مدارس کو ''والنٹری ایڈڈ'' کا رتبہ حاصل ہوا ہے۔

حلال گوشت کے سلسلے میں گو حکومت کی طرف سے یہودی طریق ذبح (کوشر) کی اجازت ہونے کی بنا پر مسلمانوں کے لیے بھی کوئی پابندی نہیں ہے لیکن مذبح خانوں کی طرف سے وہ تعاون نہیں مل رہا جس سے برقی جھٹکا دیے بغیر ذبح کا عمل مکمل ہو سکے۔

اسلامی طریق پر کیے گئے نکاحوں اور طلاق کے وثیقوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جاتا۔ اور یہ عجب طرفہ تماشا ہے کہ ایک شخص ایک عورت کے ساتھ بغیر نکاح کے تعلقات قائم رکھے رہے تو اسے قابلِ اعتراض یا قابلِ گرفت نہیں سمجھا جاتا لیکن اگر ایک مسلمان عقدِ ثانی کی جسارت کر لے تو وہ قانون کی نظر میں مجرم ٹھہرے۔

چند سال قبل یورپین نو مسلموں کی کوشش سے اسلامک پارٹی کا وجود عمل میں آیا تھا لیکن وہ بلدیاتی انتخاب میں بھی اپنی بقا کی حد تک قائم نہ رہ سکی، ایسی صورت میں ملک گیر سطح پر ایک اسلامی سیاسی پارٹی کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔

انگلستان کی حد تک میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی کے ساتھ اپنی ہمدردیاں وابستہ نہ کریں بلکہ اپنے اپنے علاقے میں اس امیدوار کی حمایت کریں جو کسی بھی درجے میں مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہو اور ان کے لیے پارلیمنٹ کے ایوانوں میں آواز اٹھانے کی ہمت بھی رکھتا ہو۔

جہاں تک مسلمان امیدواروں کا تعلق ہے، اگر وہ ذاتی شہرت اور وجاہت کی بنا پر پارلیمنٹ کا الیکشن لڑتے ہیں تو ہمیں ان سے کوئی سروکار نہیں لیکن اگر وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے جذبے سے ایوان تک پہنچنا چاہتے ہیں تو وہ موجودہ سیاسی نظام کا حصہ بن کر ہی ایسا کر سکتے ہیں لیکن ان میں ہر اس مسئلے پر جو اسلام کی تعلیمات کے منافی ہو یا مسلمانوں کے عمومی مفاد کے خلاف ہو، بیانگ دہل اپنی رائے کا اظہار کرنے کی جرأت ہونی چاہیے۔ مثال کے طور پر ان کی اپنی پارٹی ہم جنس طرز زندگی کو قانونی جواز مہیا کرنے کی مہم چلا رہی ہو تو کیا وہ صمٌّ بکمٌ عميٌ (اندھے، گونگے اور بہرے ہونے) کی پالیسی اپنا کر اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکتے ہیں؟

سوال کیا اب بھی سارے عالم کو دارالاسلام اور دارالحرب کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے، یورپ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب اللہ کے رسول ﷺ نے جس وقت مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم کی تھی، نہ صرف کفار مکہ بلکہ یثرب کے یہود اور جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور عیسائیوں کو یہ ریاست ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، اس لیے ان سب کی طرف سے اس ریاست کو آنکھ کھولتے ہی بند کرنے کی سازشیں شروع کر دی گئی تھیں۔ مدینہ کے مسلمانوں پر جنگ مسلط کر دی گئی، اس لیے مسلم اور غیر مسلم علاقوں کی حد بندی دارالاسلام اور دارالحرب

کے الفاظ سے کی گئی۔ دارالحرب اور دارالکفر دونوں متبادل اصطلاحات ہیں۔

فتح مکہ سے قبل مکہ کفار قریش کا سیاسی مرکز تھا، اس لیے دارالحرب کے مسلمانوں کے لیے ہجرت کرنا فرض تھا۔ مکہ کی فتح کے بعد مکہ دار الاسلام کی حیثیت اختیار کر گیا اور پہلا حکم باقی نہ رہا، البتہ ہر وہ جگہ جہاں مسلمان مکہ کی طرح مظلومیت کی زندگی گزار رہے ہوں انھیں مسلمان ممالک کی طرف ہجرت کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے۔

گویا شروع میں مسلم خلافت کے لیے دارالاسلام اور دیار کفر کے لیے دارالحرب کی اصطلاح ہی معروف تھی۔ جہاں کہیں بھی اہل اسلام کا غلبہ ہوتا اسے دارالاسلام سے معنون کیا جاتا اور جہاں کہیں اہل کفر کو غلبہ حاصل ہوتا اسے دارالحرب سے تعبیر کیا جاتا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مسلمانوں کے شعائر دین ادا کرنے کی جہاں کہیں بھی امن و امان کے ساتھ اجازت ہو اسے دارالاسلام کہا جائے گا، اس کے مقابلے میں اگر وہ خوف یا رعب کی فضا میں جی رہے ہوں تو اسے دارالحرب کہا جائے گا۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے کہ جب بعض ممالک پر تاتار کا غلبہ ہو چکا تھا لیکن ان کے تحت مسلمان فوجی کام کر رہے تھے، بعض علاقوں کو ایک لحاظ سے دارالاسلام اور ایک لحاظ سے دارالحرب قرار دیا، گویا اس اصطلاح میں وسعت پیدا ہونی شروع ہوگئی۔

اس صدی میں جبکہ مسلمانوں کی ستاون آزاد ریاستیں موجود ہیں اور وہ غیر ممالک سے کئی کئی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں، اس اصطلاح میں مزید توسع کی ضرورت محسوس ہوئی۔ معاصرین علماء میں سے شیخ مناع القطان رحمہ اللہ اور کئی دیگر محقق علماء نے دارالکفر کو دارالعہد اور دارالحرب میں تقسیم کیا۔ دارالعہد سے وہ تمام غیر مسلم ممالک مراد

ہیں جن سے مسلم ممالک کسی قسم کا معاہدہ رکھتے ہوں اور جہاں
بعد بآسانی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دارالحرب
جو عملاً مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں اور ان پر جنگ مسلط کیے
کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ کن ممالک کو دارالحرب

سوال کیا یورپ کے مسلمان کچھ ایسے روحانی اور اجتماعی م
مسلمان ممالک میں نہیں پائے جاتے؟

جواب کوئی شک نہیں کہ مغربی معاشرے کی اقدار ہم سے
مسلمانوں کے لیے کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ مسائل
چند مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

① ریٹائرڈ اور عمر رسیدہ افراد میں تنہائی اور وطن کی طرف مر
احساس صرف پہلی نسل کے لوگوں تک محدود نہیں رہا بلکہ
نوجوانوں تک بھی منتقل ہو چکا ہے۔

② انگلینڈ میں مقیم پاکستانی حضرات رہائش کے لیے تو یہاں
کے بعد دفن ہونے کے لیے اب بھی پاکستان کی سرزمین
مشاہدہ ہے کہ کثرت کے ساتھ جسد خاکی صرف دفنانے
ہیں۔ بہرصورت مسلم قبرستان کی موجودگی کی بنا پر اس پریکٹس

③ بعض علاقوں میں مسجد قریب نہ ہونے کی بنا پر انتہائی
ضرور آتا ہے کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں جمعہ کی نماز بھی نصیب

④ مسلم خواتین کا حجاب جو کہ بالکل ایک پرائیویٹ مسئلہ

مغربی اقدار کے مطابق ایک عورت کا برہنہ ٹانگوں یا برہنہ پیٹ کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا، اب اہل مغرب کی نظر میں کھٹکنا شروع ہوگیا ہے جس سے مسلمانوں میں اجنبیت کا احساس اجاگر ہونا شروع ہوگیا ہے۔

⑤ دکان چاہے گروسری کی ہو لیکن چونکہ شراب بیچنے سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، اس لیے اچھے خاصے نمازی لیکن صاحب تجارت افراد بھی شراب بیچنا مذموم نہیں سمجھتے۔ دل کو مطمئن کرنے کے لیے یہ جواب حاضر رہتا ہے: ''ہم شراب بیچتے ہیں، پیتے تو نہیں۔'' گویا منافقت کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھنا بہت آسان ہوگیا ہے اور جب سیڑھی پر قدم رکھ ہی دیا تو پھر اسفل سافلین کی طرف درجہ بدرجہ اترنے میں آسانی ہوتی چلی جاتی ہے۔

⑥ اگر دین کا حصار باقی نہ رہے تو مادیت چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ ایسے کیس بھی دیکھنے میں آئے ہیں جہاں ایک بیٹا اپنی ماں کو گالیاں دینے اور مارنے سے باز نہیں آتا، صرف اس لیے کہ مکان اب تک ماں کے نام ہے اور وہ اسے بیٹے کے نام منتقل کرنے پر تیار نہیں۔

⑦ مغربی معاشرے کی طرح مسلم خاندانوں میں بھی معمولی اسباب کی بنا پر طلاق کا رجحان بڑھتا چلا جارہا ہے اور بکھرے ہوئے خاندان کا تصور عام ہوتا جارہا ہے اور ایسے ہی گھر کے بڑوں کے احترام میں بھی کمی آتی جارہی ہے۔

⑧ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ کا ناقابل قبول تصور مسلمانوں کی نوجوان نسل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا ہے۔ بعض گھروں میں پہلی نسل (جس کا تعلق والدین سے ہے) اور دوسری نسل کے درمیان یہ امر مسلسل ناچاقی کا سبب بن چکا ہے۔ یورپ کی مادر پدر آزاد سوسائٹی نے اسلامی اقدار پر کاری ضرب لگائی ہے اور وہی گھر اس کے مضر

اثرات سے محفوظ رہ سکے ہیں جہاں اسلامی اقدار کی پاسداری کی جاتی ہے۔

برطانیہ کے مسلمانوں میں لڑکیوں کو والدین کی مرضی کے مطابق شادی کرنے پر مجبور کیے جانے کے بے شمار واقعات ملتے ہیں جس سے دونوں نسلوں کے درمیان تعلقات متاثر ہو رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ صرف بلادِ مغرب کے مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

⑨ مغرب میں پروان چڑھنے والے بچوں میں متضاد خیالات یا دو رنگی دنیا میں رہنے کا تجربہ اپنے اوج پر ہے۔ ایک طرف گھر اور مسجد میں اللہ کے وجود اور خیر و شر کی اقدار کا احساس دلایا جاتا ہے، جبکہ اسکول، ٹی وی اور بیرونی معاشرہ ایک بے خدا کائنات اور انسانی طاغوت اور استبداد کا بھرپور تصور دیتا ہے۔ یورپ کے بعض علاقوں میں مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور کہا گیا کہ کہاں ہے تمھارا خدا جو تمھیں بچا سکے؟ یہ الفاظ سفاک قاتلین کی زبان ہی سے نہیں نکلے بلکہ جیلوں اور تھانوں میں محبوس نوجوانوں کو جسمانی ایذا دیتے وقت بھی سنے گئے۔

⑩ ذہنی عدم سکون، خاندانی انتشار اور گھریلو ناچاقیوں پر مبنی گوناگوں مسائل کی موجودگی نے برطانیہ کو کالے جادو کے ماہرین اور جنات کو حاضر کرنے والے عاملین کی جنت بنا دیا ہے۔ گو یہ وبا بلادِ اسلامیہ میں بھی موجود ہے لیکن جس کثرت سے برطانیہ کی قلیل مسلم آبادی میں آکاش بیل کی طرح پروان چڑھ رہی ہے، اس کا مقابلہ برطانوی ہورسکوپ اور قسمت کا حال بتانے والوں سے بھی نہیں کیا جاسکتا اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ تجارت جتنی بار آور یہاں ہے اور کہیں نہیں۔

سوال اگر مسلمانوں کے نزدیک اسلامی خلافت ایک مثالی نظام ہے تو کیا وہ ایک سیکولر حکومت کسی بھی درجے میں قبول کر سکتے ہیں؟

جواب ہمارے سامنے اس وقت مغرب کے بہتر نظاموں میں سے ایک برطانیہ کا سیاسی و اجتماعی نظام ہے اور ہمیں یہ کہنے میں عار نہیں ہے کہ اس نظام میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں جو خلافتِ اسلامیہ کا جزو رہی ہیں، ان چند خوبیوں کا تذکرہ مناسب ہوگا:

① سوشل سکیورٹی (اجتماعی تحفظ)، جس کے طفیل بیکار افراد، کم آمدنی والے خاندانوں اور بچوں کی بہبود کے لیے وظائف دیے جاتے ہیں اور جس کی بنیادیں خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت پر استوار کی گئی ہیں۔

② زندگی کے تمام گوشوں میں پابندئ وقت اور نظام کا قیام جو کہ نماز اور روزہ کے اوقات کی پابندی کی شکل میں مسلمانوں کی اولیات میں سے ہے۔

③ خرید و فروخت میں امانت داری کا لحاظ جس پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔

④ مالی معاہدات میں غلط بیانی سے کام نہ لینا اور ہمیشہ سچائی اور راستی کو اپنانا جو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا جزوِ اعظم ہے۔

⑤ ججوں کا آزادانہ فیصلہ دینا اور حکومت وقت کا اس پر اثر انداز نہ ہونا۔ یہ پہلو بھی اسلامی نظام قضاء کا طرہ امتیاز رہا ہے۔

⑥ قانون کے سامنے تمام افراد کا مساوی ہونا، چاہے ان کا تعلق رعایا سے ہو یا حکام سے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی روشن مثالیں موجود ہیں کہ مدعی خلیفۂ وقت کو عدالت میں کھینچ لایا ہے اور دونوں قاضی کے سامنے بغیر کسی امتیاز کے حاضر ہیں۔

⑦ پولیس مین کا وجود خوف کا احساس نہیں دلاتا بلکہ ایک مددگار کا تصور پیش کرتا ہے۔ گو واقعہ گیارہ ستمبر کے بعد اس تصور میں قدرے تبدیلی کے آثار رونما ہو گئے ہیں۔

⑧ رشوت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ کسی بھی محکمہ سے کوئی کام متعلق ہو، قاعدے

اور سلیقے سے ہو جاتا ہے، رشوت لینے دینے کی نوبت نہیں آتی۔ رسول اللہ ﷺ نے «الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي فِي النَّارِ»[1] کہہ کر رشوت کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا۔

⑨ سوشل سکیورٹی کا نظام اس وقت چل سکتا ہے، جب لوگ امانت داری سے ٹیکس ادا کر رہے ہوں۔ گو کونسل ٹیکس، انکم ٹیکس اور وی اے ٹی کے نام سے عوام کو متعدد ٹیکس دینے پڑتے ہیں لیکن ان سے وابستہ وہ تمام سہولتیں بھی میسر ہیں جو ٹیکسوں کی ادائیگی کے مقابلے میں دی جاتی ہیں۔ اسلامی نظام میں زکاۃ وعشر کا نظام ان تمام برکات کا مظہر رہا ہے جنھیں حاصل کرنے کے لیے ''اجتماعی تحفظ'' کا نظام نافذ کیا گیا ہے۔

⑩ ایک رفاہی ریاست کی حیثیت سے درجہ ثانویہ تک مفت تعلیم کا اہتمام اور ہسپتالوں میں مفت علاج کا بندوبست کیا جاتا ہے بلکہ یونیورسٹی کے مرحلہ میں بھی کم آمدنی والے افراد کے بچوں کو فیس میں رعایت دی جاتی ہے جو کہ مسلم ممالک میں سوائے سعودی عرب اور چند گنے چنے ممالک کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔

⑪ بیکار افراد کا تخمینہ لگایا جاتا ہے اور ہر بیکار شخص کو اس وقت تک الاؤنس دیا جاتا ہے جب تک کہ اسے مناسب روزگار نہ مل جائے، یعنی بھوک اور افلاس کی بنا پر کوئی شخص خودکشی کرنے پر مجبور نہیں ہوتا۔

⑫ زندگی کے مختلف شعبوں کو نظم وضبط میں لانے کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں

[1] المعجم الأوسط: 296/2، والمعجم الصغير للطبراني: 57/1. شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (الضعيفة: 855/14، حديث: 6869) تاہم صحیح احادیث میں اس پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ ارشادِ گرامی ہے: ''رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (سنن ابن ماجه، الأحكام، حديث: 2313) جبکہ ابوداود کی روایت میں یہ الفاظ مذکور ہیں: ''ان پر رسول اللہ ﷺ کی لعنت ہے۔'' (سنن أبي داود، القضاء، حديث: 3580)

ان کی پابندی کی جاتی ہے، جس سے قانون کے احترام کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، اس لیے برطانیہ کی سڑکوں اور گلیوں میں کوڑے کرکٹ کے وہ ڈھیر نظر نہیں آتے جو کئی دوسرے مسلم و غیر مسلم ممالک میں نظر آتے ہیں۔ صفائی ستھرائی کے اعتبار سے اب کئی مسلم ممالک بشمول سعودی عرب، امارات، بحرین وغیرہ کئی یورپین ممالک سے بھی اعلیٰ معیار رکھتے ہیں، گویا قرآن حکیم ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ [1] ''یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو'' کا اطلاق زمینی حد تک تو ہو رہا ہے لیکن اخلاقی اور مذہبی حدود اس سے خارج ہیں، اس لیے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ان تمام متذکرہ بالا خوبیوں کے ہوتے ہوئے اگر یہ نظام اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کر لے تو اسے خلافت اسلامیہ سے قریب قرار دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا مطلب ہے قرآن اور صاحب قرآن دونوں پر ایمان لانا۔

البتہ مغرب کے پارلیمانی نظام اور اسلام کے شورائی نظام کا تقابل یہ الگ سے ایک بحث ہے۔ یہاں مقصود صرف اتنا ہے کہ برطانیہ کا موجودہ سیاسی و اجتماعی نظام کہاں تک اسلامی اقدار کے قریب ہے اور اس کے مقابلے میں مسلم ممالک کے اسلام کے دعویدار ہونے کے باوجود وہاں وہ خوبیاں کیوں نہیں پائی جاتیں جو ایک غیر مسلم ملک میں بآسانی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

سوال یورپین کونسل برائے فتویٰ و تحقیق کے رکن کی حیثیت سے آپ کونسل میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب میں اس کونسل کا ابتدا سے رکن چلا آرہا ہوں، 1997ء میں اس کا پہلا ورکنگ

[1] البقرة 2:229.

اجلاس سرائیوو (بوسنیا) میں منعقد ہوا تھا اور یہ کونسل کی روایت چلی آرہی ہے کہ موسم سرما کا اجلاس عموماً اس کے صدر دفتر اسلامک سینٹر ڈبلن (آئر لینڈ) میں ہوتا ہے اور موسم گرما کا اجلاس یورپ کے کسی دوسرے ملک میں۔ اب تک میں جرمنی، فرانس، سویڈن اور آئر لینڈ کے متعدد اجلاسوں میں شریک ہو چکا ہوں۔ کونسل کے صدر قطر کے ڈاکٹر یوسف قرضاوی ہیں جو عالم عرب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ نائب صدر لبنان کے شیخ فیصل مولوی ہیں۔ کونسل کے بتیس سے زیادہ ارکان ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق یورپ میں آباد مسلمانوں سے ہے لیکن ایک تہائی کا تعلق بلادِ عربیہ اور پاکستان سے ہے۔

کونسل میں دو طرح کے مسائل پیش کیے جاتے ہیں۔ انفرادی سطح کے مسائل جن کا جواب کونسل کے کسی ایک رکن کی تحریر اور باقی ارکان کی تائید کی شکل میں دیا جاتا ہے اور دوسرے وہ مسائل جن کا تعلق مسلمانوں سے عمومی طور پر ہے، جیسے یورپ کے شمالی علاقوں میں نماز کے اوقات کا تعین کرنا اور خاص طور پر ان مہینوں میں جبکہ فلکیاتی علامات ظاہر نہ ہوتی ہوں۔ ایسے مسائل میں ارکان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا تحقیقی مقالہ پیش کریں جس پر اجلاس کے دوران میں خوب بحث مباحثہ ہوتا ہے اور پھر اکثریت آراء سے کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اسلام کے اوائل سے مسائل کا حل پیش کرنے کے لیے فقہاء اور محدثین اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بحث کرتے رہے ہیں۔ میرا تعلق چونکہ اہل حدیث مکتب فکر سے ہے، اس لیے طبعی طور پر مجھے محدثین کے طرزِ تحقیق سے زیادہ مناسبت ہے، جبکہ رئیس مجلس اور دیگر ارکان فقہی قواعد وضوابط کا زیادہ لحاظ رکھتے ہیں۔

جب کونسل میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ آیا یورپ کے مسلمان سودی قسطوں پر

رہائشی مکان خرید سکتے ہیں تو دیگر چند ارکان کے ساتھ میں نے بھی کونسل کے اس فتویٰ کی تائید نہیں کی کہ مسلمان شدید حاجت کی بنا پر ایک مکان کی حد تک سودی معاملہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ حرام کا ارتکاب صرف حالت اضطرار ہی میں جائز ہے، اس لیے پہلے وہ تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں جو کہ جائز حد تک ایک شخص کی ضرورت بسلسلہ رہائش پوری کر سکیں، جیسے کرائے کے مکان کا حصول، کونسل سے سستے کرائے پر مکان حاصل کرنے کی کوشش، قرض حسنہ لے کر مکان کی خرید یا مرابحہ اجارہ کی بنیاد پر جاری کردہ اسلامی اسکیموں کے توسط سے مکان کا حصول۔

ہمارا یہ موقف بھی تھا کہ اگر شدید حاجت کی بنا پر اس امر کی اجازت دے دی گئی تو پھر متبادل اسلامی حل تلاش کرنے کا راستہ بند ہو جائے گا، جیسے ذبیحہ کا معاملہ، شروع شروع میں جب مسلمان یہاں آئے تو اگر انھیں غیر اسلامی بلکہ غیر کتابی ذبیحہ کو حلال سمجھ کر کھانے کا فتویٰ دے دیا جاتا تو پھر کوئی حلال ذبیحہ مہیا کرنے کی تگ و دو نہ کرتا۔ مسلمانوں میں چونکہ سود سے بچنے کی حس موجود رہی، اس لیے آج ہر طرف اسلامی مارگیج (گروی) مہیا کرنے کی اسکیمیں بار آور ہو رہی ہیں۔ اس مسئلے پر میں نے کونسل سے استعفاء بھی دے دیا تھا اور پھر ایک سال کے بعد کونسل کے صدر اور انتظامیہ کے اصرار پر میں نے مراجعت کی اور میرا یہ مطالبہ بھی تسلیم کیا گیا کہ اگر کسی فتویٰ پر کوئی رکن موافقت نہ کرے تو محضر پر اس کا اختلافی نوٹ درج کیا جائے۔

بہر حال میرا عمومی تاثر یہی ہے کہ کونسل نے اپنے متعدد فتاویٰ کے ذریعے سے یورپ کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ حلال وحرام کی حدود متعین کی ہیں اور اپنے فیصلوں میں کسی بھی دباؤ کے شکار نہیں ہوئے ہیں۔

حجاب کے مسئلے پر شیخ الازہر کی متساہلانہ یا رعایت آمیز رائے کے مقابلے میں کونسل نے جرأت آمیز مؤقف اختیار کیا ہے۔

آخر میں یہ کہتا چلوں کہ یہ صحیح ہے کہ کونسل کے ممبران میں سے اکثر کا تعلق الاخوان المسلمون کے فکر و مسلک سے ہے لیکن کونسل میں شیخ عبداللہ بن منیع اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے متعدد فارغ التحصیل علماء کی موجودگی سے یہ تاثر زائل ہو جانا چاہیے کہ کونسل کسی ایک فکر کی نمائندگی کرتی ہے جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا کہ فقہاء اور محدثین کی طرز بحث میں اختلاف شروع سے چلا آ رہا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کی خوشہ چینی کرتے رہے ہیں، اس لیے امت کو درپیش مسائل کے حل کے لیے دونوں فریقوں کا تعاون اشد ضروری ہے اور الحمد للہ اب مجالس علمیہ میں ایک خاص مذہب کی بات نہیں کی جاتی بلکہ چاروں فقہی مسالک کے علاوہ ابن حزم تک کے اقوال پیش نظر رہنے لگے ہیں۔ ہر قول کے پیچھے دلیل تلاش کی جاتی ہے اور یہ ایک صائب راستہ ہے، البتہ عصر حاضر کی کسی مصلحت کی خاطر ایک شاذ قول کو ترجیح دے لینا بہر صورت مناسب نہیں ہے۔

الله
رسول
محمد
فتاویٰ
صراط مستقیم
دیارِ مغرب میں مسلمانوں کو درپیش مسائل اور ان کا شرعی حل

عقائد، بدعات اور رسومات
کے مسائل

سوال دین اور مذہب میں کیا فرق ہے؟

جواب دین مخصوص عقائد رکھنے اور مخصوص اخلاقی، روحانی اور سماجی تعلیمات کے مجموعہ کا نام ہے۔ دین کے ساتھ جزا اور سزا کا تصور وابستہ ہے۔ لفظ دین، دَانَ یَدِیْنُ سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے بدلہ دینا۔ فرمایا:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ ''وہ جزا اور سزا کے دن کا مالک ہے۔''[1]

ایک عربی شاعر نے کہا: دِنَّا هُمْ كَمَا دَانُوا ''ہم نے انھیں ویسا ہی بدلہ دیا جیسا انھوں نے دیا تھا۔'' جزا و سزا کا تصور اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جبکہ انسان کسی امتحان سے گزرا ہو اور امتحان کے لیے قواعد اور قوانین کا ہونا ضروری ہے۔ اگر قانون نہ ہو تو پھر قانون کی خلاف ورزی کیا اور کیسے؟ اور پھر کیسا بدلہ اور کیسی سزا یا جزا؟ اور یوں دین کے ساتھ قاعدہ قانون کا ہونا ضروری قرار پایا۔ لوگوں نے بہت سے دین آزمائے، اللہ تعالیٰ نے صرف دین اسلام کو پسندیدہ قرار دیا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔''[2]

اور فرمایا:

[1] الفاتحۃ 3:1۔ [2] آل عمران 19:3۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

''اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں گھاٹا پانے والوں میں سے ہوگا۔''

یعنی دین کئی طرح کے ہوسکتے ہیں لیکن ''الدین'' صرف اسلام ہے، جسے دین اللّٰہ (اللہ کا دین) ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ اور دین الحق ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ﴾ بھی کہا گیا۔

کفار کے دین کو بھی ان کی طرف منسوب کیا گیا: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾

''تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''

دین اسلام اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی زندگی اور اس کے بنیادی عقائد تین ہیں: اللہ پر ایمان، رسولوں پر ایمان اور آخرت کی زندگی پر ایمان۔ زندگی بسر کرنے کے لیے جو قوانین اللہ کی طرف سے دیے گئے انھیں شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت میں اختلاف ہوا ہے، بنیادی عقائد میں نہیں، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور محمدی شریعت میں کئی باتوں میں اختلاف ہے۔ دین اسلام سے جوں جوں لوگ دور ہوتے گئے، وہ نئے نئے دین بناتے گئے، یعنی اصل تو صرف دین اسلام ہے، باقی ادیان اصل دین کی تحریف شدہ شکلیں ہیں۔

اب آیئے مذہب کی طرف۔ یہ لفظ ''ذَهَبَ'' سے نکلا ہے، یعنی جانا، گزرنا۔ مذہب کا مطلب ہوا وہ راستہ جس سے گزرا جائے اور پھر اس کا اطلاق اس طریقے پر

● آل عمران 3:85. ● آل عمران 3:83. ● الصف 61:9. ● الکافرون 109:6.

ہونے لگا جسے کوئی شخص اپنی زندگی گزارنے کے لیے اپنائے۔ اس لحاظ سے بعض اوقات مذہب کا لفظ دین کے مترادف بھی استعمال ہوا ہے اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے:

مذہب اسلام یا مذہب ہنود و یہود۔

میر تقی میر نے کہا:

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

پرندے کی زبان سے ایک عرب شاعر کہلواتا ہے:

اَلْحَبْسُ لَيْسَ مَذْهَبِي وَلَيْسَ فِيهِ طَرَبِي

”قید میں رہنا میرا مذہب نہیں اور نہ قید میں میری خوشی ہے۔“

لیکن اسے اگر دین اسلام کے تناظر میں دیکھا جائے تو مذہب کا تصور ایک ذیلی یا ثانوی طریقے کا نام ہے۔ اُردو میں اسے مسلک بھی کہا جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں دوسری صدی ہجری سے کئی فقہی اور کلامی راہیں نمودار ہوئیں جنھیں مذہب کا نام دیا گیا، جیسے فقہ کی بنیاد پر حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، جعفری مذاہب اور علم کلام (اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق علم) کی بنیاد پر بھی بہت سے مذاہب ہوئے جن میں مذہب سلف، معتزلہ، اشاعرہ، ماتریدیہ مذہب زیادہ مشہور ہوئے۔

تصوف میں اسے طریقت کا نام دیا گیا اور یوں جیلانی، نقشبندی، شاذلی، چشتی طریقے نمودار ہوئے۔ محمد جواد مغنیہ کی مشہور کتاب ہے: ”الفقه علی المذاهب الخمسة“ جس میں مذکورہ بالا پانچ فقہوں کے مسائل ذکر کیے گئے ہیں۔

اس تفصیل کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ تمام مسلمان بحیثیت دین، دائرۂ اسلام میں

داخل ہیں لیکن پھر مذاہب کے اعتبار سے ان کی تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔

مذاہب پر چلتے وقت ایک مسلمان کا وتیرہ یہ ہونا چاہیے کہ تعصب صرف دین اسلام سے ہو، مذہب یا مسلک سے نہیں۔

اصل قرآن وسنت ہے۔ جس مذہب کی جو بات قرآن وسنت سے قریب ہوگی وہ قابل قبول ہے ورنہ نہیں۔

ہر مذہب کے چند جید علماء نے اسی اصول کو اپنایا ہے۔ حنبلی فقہ کے پیروکار عموماً امام احمد کی ترجیحات پر عمل کرتے ہیں لیکن حنابلہ میں سے امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور موجودہ دور میں شیخ عبدالعزیز بن باز بہت سے مسائل میں حنبلی فقہ سے اختلاف رکھتے تھے اور عقائد میں سارے حنبلی، مذہب سلف کے قائل ہیں، معتزلہ یا اشاعرہ کے نہیں۔

خود امام ابوحنیفہ کے دو معروف شاگردوں ابو یوسف اور محمد بن حسن شیبانی نے امام صاحب سے دو تہائی مسائل میں اختلاف کیا۔ یہی حال مالکی اور شافعی فقہ کے جید علماء کا ہے۔ جعفری (شیعہ فقہ) سے انتساب رکھنے والوں میں محمد موسوی نے کتاب ''تصحیح عقائد الشیعة'' لکھی جس میں انھوں نے ان مسائل میں اصلاح کی دعوت دی ہے جو اہل سنت سے نزاع کا باعث ہیں اور جن میں قرآن وسنت کی روشنی میں اصلاح کی گنجائش ہے۔

ان پانچوں مذاہب نے ایک وسیع علمی ذخیرہ چھوڑا ہے اور ان سے استفادہ کرنا وقت کی ضرورت ہے اور یہ استفادہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہی مطلوب ہے تاکہ مسلمان اس عہد سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوسکیں جب صرف ایک ہی مذہب تھا اور وہ تھا: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي، یعنی ارشاد رسول کہ جب آپ سے فرقہ ناجیہ کے

بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: ''وہ راستہ جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔''

اور یہ بات واضح ہے کہ صحابہ کے دور میں صرف قرآن وسنت ہی کو بطور حجت پیش کیا جاتا تھا، زیادہ سے زیادہ کبار صحابہ کے اجتہادات کو لیکن اس وقت فقہی اور کلامی مذاہب کا ظہور نہیں ہوا تھا اور یہ بات بھی سب کے علم میں ہے کہ جن جن ائمہ کی طرف فقہی مذاہب کا انتساب ہوا ہے، انھوں نے صاف صاف کہا ہے کہ یہ ہماری رائے ہے، اسے قرآن و حدیث پر پرکھو، اگر ان کے مطابق ہو تو قبول کر لو، وگرنہ دیوار پر دے مارو۔

اور ہم بھی علماء سے یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ عصر حاضر کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اسی منہج کو اپنائیں گے کہ اسی میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

رسول اور نبی میں فرق

سوال رسول اور نبی میں کیا فرق ہے؟

جواب عموماً تفسیر کی کتب میں رسول کے لیے صاحب شریعت ہونا اور نبی کے لیے کسی پہلے رسول کی شریعت کے تابع ہونا مراد لیا جاتا ہے لیکن اس تعریف کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو نبی شمار کرنا چاہیے کیونکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے تابع تھے، حالانکہ قرآن انھیں رسول قرار دیتا ہے۔

دوسری تعریف یہ بیان کی گئی کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے جبکہ نبی کے اوپر کسی کتاب کا نزول نہیں ہوتا۔ اس تعریف کے مطابق داود علیہ السلام کو رسول قرار دیا جانا چاہیے کیونکہ ان پر زبور کا نزول ہوا تھا، حالانکہ قرآن نے انھیں صرف نبی قرار دیا ہے، اس

لیے سب سے بہتر تعریف وہ ہے جس کے مطابق رسول کے لیے غلبہ لازمی قرار دیا گیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے لیے اس دنیا میں غلبے کا ذکر کیا ہے، یعنی وہ مغلوب نہیں ہوتے اور نہ انھیں قتل ہی کیا جا سکتا ہے، اس کے مقابلے میں انبیاء مغلوب بھی ہوئے ہیں اور قتل کا نشانہ بھی بنے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ﴾

''اللہ تعالیٰ نے (تقدیر میں) یہ لکھ دیا کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔''•

اور انبیاء کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ﴾

''یہ اس لیے کہ وہ لوگ (بنی اسرائیل) اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کیا کرتے تھے۔''•

چنانچہ یہود نے زکریا علیہ السلام اور ان کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کیا۔ یہ دونوں نبی تھے لیکن وہ اللہ کے رسول عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر قادر نہیں ہو سکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ ﴾

''اور ان (یہود) کے یوں کہنے کے باعث (ملعون ہوئے) کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کیا، حالانکہ نہ تو انھوں نے اسے قتل کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ انھیں شبہے میں ڈال دیا گیا۔ یقین جانو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

• المجادلۃ 21:58۔ • آل عمران 113:3۔

بارے میں اختلاف کرنے والے ان کے بارے میں شک میں ہیں، انھیں اس کا کوئی یقین نہیں سوائے تخمینی باتوں پر عمل کرتے کے۔ اتنا یقینی ہے کہ انھوں نے انھیں قتل نہیں کیا۔''●

رسولوں کے لیے جس غلبے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ وہی غلبہ ہے جو ایک شخص کو اپنے دشمن پر حاصل ہوتا ہے کہ دشمن شکست سے دو چار ہوتا ہے جبکہ رسول کو فتح و نصرت نصیب ہوتی ہے کیونکہ جہاں تک دلائل و براہین سے غلبے کا تعلق ہے وہ تو ہر صورت میں ہر رسول اور ہر نبی کو حاصل رہا ہے۔

محسوس طریقے پر غالب آنے کے یہ معنی خود قرآن ہی سے اخذ کیے گئے۔ وہ اس طرح کہ قرآن میں جہاں جہاں غلبے کا ذکر ہے، وہاں یہی محسوس غلبہ مراد لیا گیا ہے۔ کافروں کی اس دنیا میں مغلوبیت کا تذکرہ کیا گیا، فرمایا:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾

''(اے نبی) کافروں سے کہہ دیجیے کہ تم عنقریب مغلوب کیے جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''●

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہود نے آپ سے دشمنی کی۔ مدینہ کے تین یہودی قبائل میں سے بنو قینقاع اور بنو نضیر جلا وطن ہوئے اور بنو قریظہ قتل کیے گئے۔ خیبر فتح ہوا اور یہودیوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا۔ سورۂ روم کے آغاز میں فارسیوں کے ہاتھوں رومیوں کی شکست اور پھر چند سال میں ان کے غالب آنے کی بشارت دی گئی۔ فرمایا:

● النسآء 4:157. ● آل عمران 3:12.

﴿الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ﴾

''الم، رومی مغلوب ہوگئے، زمین کے پست ترین حصے میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے، چند سال ہی میں۔''

اور تاریخ یہی بتاتی ہے کہ بازنطینی سلطنت (جو سلطنت روما کی مشرقی شاخ تھی) نے ارض فلسطین میں (جو کہ بحیرۂ مردار کے حوالے سے زمین کا پست ترین حصہ کہلاتی ہے) نبیٔ اکرم ﷺ کے مکی دور کے زمانے میں شکست کھائی اور پھر سات سال کے مختصر عرصے میں شاہ ہرقل کو دوبارہ فتح نصیب ہوئی اور اسی فتح کی خوشی میں وہ اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے بیت المقدس (موجودہ یروشلم) آیا تھا جہاں اسے نبی ﷺ کی طرف سے اسلام قبول کرنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ تب اس نے یروشلم میں موجود عربوں کے سردار ابوسفیان کو بلایا تھا اور اس سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں چند سوالات کیے تھے۔

سورۂ نساء کی آیت میں غلبے کو قتل کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ○﴾

''اور جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے، پھر یا تو وہ قتل ہوجاتا ہے یا غلبہ پالیتا ہے، پھر یقیناً ہم اسے بڑا ثواب عطا کریں گے۔''

البتہ سورۂ بقرہ کی آیت 87 سے اشکال پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسول بھی قتل کیے جاسکتے ہیں؟ فرمایا:

الروم 30:1-3. النسآء 4:74.

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾

"اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد اس کے پیچھے اور رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کروائی لیکن جب کبھی تمھارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمھاری طبیعتوں کے خلاف تھی، تم نے جھٹ سے تکبر کیا، پھر تم نے بعض کو تو جھٹلایا اور بعض کو قتل کر ڈالا۔"

اس اشکال کی وضاحت مولانا امین احسن اصلاحی سے مطلوب تھی جو کہ رسول اور نبی کے درمیان مذکورہ بالا فرق کے شدومد کے ساتھ قائل ہیں لیکن انھوں نے سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ کے ان دونوں مقامات پر جہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے، کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ میرے ذہن میں اس اشکال کا ایک حل آتا ہے، جو میں پہلے پیش کرتا ہوں اور اس کے بعد اپنے شیخ محمد امین شنقیطی کا، جو اس اشکال کو حل کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

① رسول یہاں مبعوث کے معنی میں لیا جائے۔ رسول لغوی لحاظ سے پیغامبر کے معنی میں ہے اور مبعوث وہ جسے بھیجا گیا ہو۔

مبعوث، بعث (بھیجا) سے نکلا ہے اور قرآن مجید میں یہ لفظ نبی اور رسول دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے، فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾

"وہی اللہ ہے جس نے اُمّی لوگوں میں، انھی میں سے ایک رسول بھیجا۔"

اور فرمایا:

البقرة 2:87. الجمعة 2:62.

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾

"لوگ ایک امت تھے تو اللہ نے انبیاء کو بھیجا بشارت دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے۔" ❶

گویا مبعوث میں رسول اور نبی دونوں آجاتے ہیں۔ اس اعتبار سے سورۂ بقرہ کی آیت میں جن دو فریقوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ایک سے مراد رسول ہوں گے، یعنی جنھیں جھٹلایا گیا اور دوسرا فریق انبیاء کا ہوگا جن میں سے بعض کو لوگوں نے قتل کیا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ یہاں رسول کے معنی مبعوث کے کیوں لیے گئے ہیں، خالص رسول ہی کے معنی کیوں نہیں لیے گئے، تو جواباً عرض ہے کہ اس آیت میں چونکہ دو فریقوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں قتل ہونے والوں کا بھی ذکر ہے، اس لیے یہاں رسول اور نبی بحیثیت دو الگ الگ فریق لیے گئے تاکہ قرآن کی ان آیات سے تعارض نہ ہو جہاں رسولوں کے لیے خصوصی نصرت ﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ ❷ اور غلبے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ❸

② شیخ شنقیطی نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں مذکورہ بحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولوں کے لیے غلبے کا وعدہ ایسے رسولوں کے لیے ہے جنھیں جہاد کا حکم دیا گیا ہو اور ان سے میدان جنگ میں مغالبہ (یعنی غلبہ حاصل کرنے کی جدوجہد) مطلوب ہو، برخلاف ان رسولوں کے جنھیں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، چنانچہ ان میں سے کچھ قتل بھی کیے گئے۔ یہ فرق انھوں نے سورۂ آل عمران کی اس آیت سے لیا ہے:

❶ البقرة 2:213. ❷ المؤمن 40:51. ❸ المجادلة 58:21.

﴿وَكَأَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا أَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○﴾

''بہت سے نبیوں کے ہم رکاب ہو کر، بہت سے اللہ والے جہاد کر چکے ہیں، انھیں بھی اللہ کی راہ میں تکلیفیں پہنچیں لیکن اس پر نہ تو انھوں نے ہمت ہاری، نہ سست رہے اور نہ دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں ہی کو چاہتا ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ایک قراءت قُتِلَ بصیغہ مجہول بھی ہے، قَاتَلَ کی جگہ اگر اسے قُتِلَ پڑھا جائے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

ا) کتنے ہی نبی ہیں جو قتل ہوئے اور ان کے ساتھ بہت سے اللہ والے تھے، (یعنی قُتِلَ کا نائب فاعل وہ ضمیر ہے جو نبی کی طرف لوٹتی ہے)۔

ب) کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والے قتل ہوئے، (یعنی نائب فاعل، لفظ ربیون، اللہ والے ہے)۔ اب یہاں پر قتال کا ذکر ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے لیے غلبے کی بشارت دی ہے اور غلبہ قتل کے منافی ہے، اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ میدان جنگ میں نبی یا رسول قتل نہیں ہو سکتا، اس لیے مذکورہ دونوں معنوں میں، دوسرے معنی ہی مراد لیے جائیں گے کہ جب کبھی قتال ہوا تو اس میں نبی نہیں قتل ہوئے بلکہ ان کے ساتھ کئی اللہ والے بے شک قتل ہوئے۔ اور اس طرح یہ فرق واضح ہو گیا کہ انبیاء و رسل کے لیے غلبہ لازمی ہے اور میدان جنگ میں وہ مقتول نہیں ہو سکتے، البتہ عام حالات میں یہ قتل واقع ہو سکتا ہے، جیسے وہ انبیاء جنھیں بنی اسرائیل نے قتل کیا تھا۔

آل عمران 3:146۔

نماز میں رسول اللہ ﷺ کا خیال گدھے کے خیال سے بدتر
(شاہ اسماعیل شہید کے حوالے سے استفسار)

سوال ایک صاحب نے اپنا نام ظاہر کیے بغیر شاہ اسماعیل شہید سے منسوب کتابوں تقویۃ الایمان اور صراط مستقیم میں درج چند عبارتوں کو گستاخی پر محمول کرتے ہوئے اُن کے بارے میں فتویٰ طلب کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ شاہ صاحب نماز کے دوران میں رسول اللہ ﷺ کا خیال آنے کو گدھے اور بیل کا خیال آنے سے زیادہ بدتر سمجھتے ہیں۔

جواب چونکہ اس مسئلے پر مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل سلفی خامہ فرسائی کر چکے ہیں، اس لیے ہم انھی کا جواب من وعن نقل کر رہے ہیں۔ اس جواب کی روشنی میں سائل کے دوسرے سوالوں کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ مولانا اسماعیل سلفی مرحوم کی یہ تحریر اُن کی کتاب ''تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی'' سے لی گئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا تصور: آپ ﷺ کا نماز میں تصور کرنا یا نہ کرنا عقیدے کا مسئلہ نہیں۔ عقائد کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ عقائد کی مشہور کتابیں شرح عقائد نسفی، عقیدہ طحاویہ، شرح عقیدہ اصفہانیہ، عقیدہ صابونیہ شرح مطالع یہ عقائد کی کتابیں عام کتب خانوں میں ملتی ہیں، کسی میں یہ عقیدہ موجود نہیں۔ معلوم نہیں بریلوی مولوی صاحبان نے یہ عقیدہ کہاں سے بنایا؟ صحیح یہ ہے کہ نماز خشوع و عاجزی سے پڑھی جائے۔ نماز میں جو پڑھا جائے اس کے مفہوم و مطالب کی طرف توجہ رکھنی چاہیے۔ باقی پریشان خیالات سے بچنے کی کوشش کرے۔ اگر خیالات ذہن میں آئیں تو دل

میں اعوذ باللہ یا لاحول پڑھے اور خیالات کی آمد کو روکے۔

غلطی کی وجہ: قریباً ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے۔ ایک بزرگ سید احمد بریلوی ہوئے۔ یہ حنفی المذہب تھے۔ نہایت پرہیز گار تھے۔ انھوں نے سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ جہاد کا فیصلہ کیا۔ بڑے بڑے عالم بھی اُن کے مرید تھے۔ اسی سلسلے میں مولانا اسماعیل بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ اور مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی حنفی ان کے عقیدت مند تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب اہلِ حدیث تھے۔ سید احمد صاحب بریلوی حنفی صوفی بزرگ تھے۔ انھوں نے تصوف میں ایک کتاب لکھوائی جس کا نام ''الصراط المستقیم'' ہے۔ یہ کتاب فارسی میں ہے۔ اس کے چار باب ہیں۔ اس کے دو ابواب کا ترجمہ مولوی عبدالحی صاحب بڈھانوی حنفی نے کیا ہے۔ اس میں ایسی عبارت موجود ہے جس میں بریلوی حضرات کو مغالطہ ہوا ہے۔ وہ عبارت کو صحیح نہیں سمجھ سکے۔ اصل عبارت اور اس کا مفہوم آگے آئے گا لیکن مہربانی فرما کر آپ دو چیزیں ذہن میں رکھیں۔ سید احمد بریلوی رحمہ اللہ بھی حنفی ہیں اور مولانا عبدالحی صاحب بڈھانوی بھی حنفی ہیں۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نہ اس کتاب کے مصنف ہیں نہ اس باب کے مترجم۔ وہ تاجران کتب حضرات کی ہوشمندی کہ انھوں نے شہرت کی وجہ سے کتاب پر شاہ اسماعیل صاحب کا نام لکھ دیا اور وہ بریلوی حضرات کی لاعلمی کا نشانہ بن گئے، حالانکہ وہ بیچارے بالکل بے قصور ہیں اور شاہ صاحب کے نام اور اہلحدیث ہونے کی وجہ سے جماعت اہلحدیث بدنام ہوگئی، حالانکہ ہماری کسی کتاب میں یہ مسئلہ نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم ان بزرگوں کو اختلاف فقہی کے باوجود نیک اور بزرگ سمجھتے ہیں لیکن ان کو پیشوا یا اپنا امام نہیں سمجھتے۔ ان میں بعض حضرات کی کچھ تصنیفات

ہیں۔ جن میں ہر قسم کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ ہم ان حضرات میں سے کسی کے مقلد نہیں۔ انھیں اچھے عالم اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ بریلوی حضرات معلوم نہیں یہ غلط بیانی کیوں کرتے ہیں کہ یہ حضرات ہمارے امام ہیں۔ آپ یقین فرمائیں نہ ان کی کتابیں ہمارے لیے حجت ہیں نہ یہ بزرگ ہمارے امام۔ اب ہمارا فرض نہیں کہ میں اصل عبارت کی تشریح کروں یا مغالطے کا اظہار، لیکن آپ کی تسکین کے لیے اصل عبارت اور اس کا مطلب عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

سید احمد کا مقصد یہ ہے کہ نماز پوری توجہ سے ادا ہونی چاہیے۔ اس میں خیالات اور وسوسوں کو قریب نہیں آنے دینا چاہیے۔ خصوصاً ایسے خیالات جن سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی میں فرق آئے کیونکہ عبادت میں پہلی چیز اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی عظمت اور برتری ہے۔ دوسری چیز عبادت میں انسان کا عجز و انکسار اور حاجت مندی۔ ان دو چیزوں میں جن خیالات سے نقص پیدا ہو، اللہ کی عزت اور برتری میں فرق آئے یا انسان اپنے آپ کو بڑا سمجھے، اس کے دل میں تکبر آ جائے، عبادت میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر بطور عبدہ و رسولہ آئے اس میں کچھ حرج نہیں، اس لیے کہ یہ اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا بلکہ اس میں ان کی عبدیت اور رسالت کا اقرار ہے۔ اسی لیے مغضوب اور منعم علیہ گروہوں کے خیال سے اللہ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔ اس لحاظ سے یہ خیال اللہ کی عظمت سے نہیں ٹکراتا۔ اگر کسی ولی، بزرگ یا نبی کا خیال آجائے تو ان کی عظمت، اُن کی بزرگی کا خیال اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی سے ٹکرائے گا۔ آپ اس کے لیے أعوذ پڑھ سکتے ہیں نہ لاحول۔ اس کے خلاف اگر

بیل، گدھے یا کسی ذلیل اور حقیر چیز کا خیال آجائے تو آپ فوراً لاحول یا اعوذ پڑھ

کر اسے دور کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور عزت اس سے متاثر نہیں ہوگی۔

سید صاحب کا مقصد یہ ہے: وسوسہ کوئی بھی نماز میں نہ ہی آنا نہ ہی لانا چاہیے لیکن بعض وسوسے نماز میں زیادہ خلل پیدا کریں گے بعض کم۔ صوفیانہ لحاظ سے سید صاحب نے واقعی عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے لیکن کند ذہن آدمی جو اتنی گہرائی تک نہ جا سکے وہ کفر کے فتوے لگانے شروع کر دے گا۔ مقابلہ حضرت کی ذاتِ گرامی اور گاؤ خر میں نہیں۔ مقابلہ وسوسے کے نقصان اور مضرت میں ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ گرم لوہا جلانے کے لحاظ سے گرم پانی سے زیادہ مضر ہے۔ مقابلہ لوہے اور پانی کی مقدار میں نہیں بلکہ لوہے اور پانی میں گرمی کی تاثیر کا ہوگا۔ سید صاحب نے اس عمیق اور لطیف بات کو سمجھانے کے لیے متعدد صفحے لکھے ہیں لیکن بریلوی علماء کا بغض بھرا ذہن سچی بات سمجھنے میں حائل ہوگیا۔ سید صاحب کی پوری بات سمجھنے کے لیے اگر آپ پسند فرمائیں تو اصل کتاب بھیج دوں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کا ذہن کھول دے۔

سید صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ طبائع کے لحاظ سے وسوسے کا اثر ہر طبیعت پر مختلف ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے بزرگ نماز میں لشکر مرتب فرما لیتے تھے۔ ان کی نماز میں، ان کے خشوع میں کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے بزرگوں اور اہل اللہ کی ریس کر کے عوام کو اپنی نماز نہیں خراب کرنی چاہیے۔

سید صاحب نے وسوسے کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ ایک وسوسہ لاعلاج ہے۔ اس کے لیے یا تو اللہ سے دعا کرے یا کسی کامل پیر کی صحبت میں کچھ عرصہ گزارے۔ دوسرا قابل علاج ہے۔ اس کا علاج ذکر فرمایا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

"اور جو کچھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نماز میں سامان لشکر کی تدبیر فرمایا

کرتے تھے۔ سو اس قصے سے مغرور ہو کر اپنی نماز کو تباہ نہ کرنا چاہیے۔"

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر!
ہست مانند در نوشتن شیر و شیر

"پاکباز ہستیوں کے معاملے کو خود پر قیاس مت کریں۔ یہ شیر اور شِیر لکھنے کے مانند ہے، جس سے آپ اشتباہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔"

حضرت خضر علیہ السلام کے لیے کشتی توڑنے اور بے گناہ بچے کو مار ڈالنے میں بڑا ثواب تھا اور دوسروں کے لیے نہایت درجے کا گناہ ہے۔ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ درجہ تھا کہ لشکر کی تیاری آپ کی نماز میں خلل نہیں ڈالتی تھی بلکہ وہ نماز کو کامل کرنے والی ہو جاتی تھی، اس لیے کہ وہ تدبیر اللہ جل شانہ کے الہامات سے آپ کے دل میں ڈالی جاتی تھی اور جو شخص خود کسی امر کی تدبیر کی طرف متوجہ ہو، خواہ وہ امر دینی ہو یا دنیاوی، بالکل اس کے برخلاف ہے۔ اور جس شخص پر یہ مقام کھل جاتا ہے وہ جانتا ہے۔ ہاں بمقتضائے ظلمات بعضها فوق بعض زنا کے وسوسے سے اپنی بیوی سے مجامعت کا خیال بہتر ہے۔ اور شیخ یا اس جیسے اور بزرگوں کی طرف خواہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ شیخ کا خیال تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے دل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل یا گدھے کے خیال میں نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے نہ تعظیم بلکہ حقیر و ذلیل ہوتا ہے۔ اور غیر کی یہ تعظیم اور بزرگی شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ حاصل کلام یہاں وسوسوں کے تفاوت کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے۔ میں نے بقدرِ ضرورت ترجمہ نقل کر دیا ہے۔

سید صاحب یہاں نبیٔ اکرم اور بزرگوں کی عظمت اور بزرگی کا ذکر کرتے ہیں۔ بریلوی مولوی صاحبان نے اسے توہین بنا ڈالا۔ سمجھ الٹ جائے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ.

اس امر پر تمام مسلمان متفق ہیں کہ نماز خشوع اور انابت سے ادا کرنی چاہیے۔ وسوسے اور خیالات نماز میں نقصان پیدا کرتے ہیں۔ یہی مسئلہ سید صاحب نے ذکر فرمایا۔ سید صاحب نے اس کی وضاحت فرمائی کہ ردی اور حقیر چیزوں کا خیال اس لیے زیادہ مضر نہیں کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ معزز اور محبوب چیزیں زیادہ مضر ہیں کہ ان کی عزت اور محبت دل پر غالب ہوتی ہے۔ آپ ان بریلوی علمائے کرام سے فرمائیں کہ ان کے ہاں کیا صورت ہوگی۔

کیا گاؤخر کے تصور سے نماز میں صرف نقص پیدا ہوگا اور بزرگوں کے تصور سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، یا بریلوی حضرات نماز میں خشوع کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ آپ کے ہاں کافر، مشرک یہودی، عیسائی، مجوسی کے تصور میں فرق نہیں، سب یکساں ہیں۔ آپ کے سوال کے آخری حصے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرات مغضوب علیھم اور منعم علیھم، کفار مشرکین اور صالحین سب کے تصور کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے سوا آپ کے ہاں کوئی چارہ ہی نہیں۔ بہر حال سید صاحب نماز میں خشوع ضروری سمجھتے ہیں اور خیالات و وسوسوں میں بھی فرق کرتے ہیں۔ بعض زیادہ مضر اور بعض کم۔ اور اس میں مقابلہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات اور (معاذ اللہ) گاؤخر میں نہیں بلکہ اچھے اور برے اور مضر اور کم مضر وسوسوں میں مقابلہ ہے۔

ایک فقہی نظیر: ذہن کو صاف کرنے کے لیے میں چاہتا ہوں آپ فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ

کی ایک دو تصریحات پر غور فرمائیں:

''اگر قرآن سے دیکھ کر پڑھے تو اس کی نماز (احناف کے نزدیک) فاسد ہوجائے گی (کیونکہ اس میں تعظیم و تعلم ہے)۔ اگر عورت کی شرمگاہ کو شہوت سے دیکھے تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔'' [1]

مولوی احمد رضا صاحب لکھتے ہیں:

''اگر عورت کو طلاق رجعی دی تھی، ہنوز عدت نہ گزری، یہ نماز میں تھا کہ عورت کی فرج داخل پر نظر پڑ گئی اور شہوت پیدا ہوئی اور نماز میں فساد نہ آیا۔'' [2]

مولوی صادق صاحب اور دوسرے بریلوی مولوی صاحبان دریافت فرمائیں کہ شرمگاہ قرآن سے افضل ہے۔ قرآن سے نماز فاسد ہو، شرمگاہ کے ملاحظہ سے نماز پر کوئی اثر نہ پڑے۔ شامی عراقی الفلاح میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے، جو توجیہ آپ کے بزرگ اس کے لیے کریں گے، اسی قسم کا عذر سید احمد شہید کے لیے بھی ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: ''اگر امام ایک ماہ امامت کے بعد کہتا ہے کہ میں مجوسی تھا۔ مقتدی کو نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر امام کہے کہ میں نے بے وضو یا پلید کپڑے میں نماز پڑھائی ہے تو بصورت بے وضو نماز لوٹانی چاہیے۔'' [3]

اگر آپ پر یہ الزام لگایا جائے کہ آپ مجوسی آتش پرست کو بے وضو مسلمان سے بہتر سمجھتے ہیں، کیا آپ اسے پسند کریں گے؟ اگر یہاں فقہاء رحمہم اللہ کی توجیہات صحیح سمجھی جاسکتی ہیں تو سید احمد صاحب کے ارشاد کی بھی توجیہ ہوسکتی ہے۔ آپ اپنے علماء سے دریافت فرمائیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے مسائل میں تحقیق شروع کی تو

[1] الأشباه والنظائر لابن نجيم، ص: 720 [2] فتاوىٰ رضويه: 76/1 [3] الأشباه والنظائر، ص: 720

محلے میں آپ کا مقاطعہ کرایا جائے گا اور مسجد میں آپ کا داخلہ بند ہو جائے گا۔

ہم جس طرح ائمہ اربعہ اور فقہائے مذاہب کو اپنا بزرگ سمجھتے ہیں، ان کے علوم سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح سید احمد شہید اور مولانا عبدالحی صاحب کو باوجود ان کے حنفی ہونے کے اپنا بزرگ اور عالم سمجھتے ہیں۔ جو باتیں ان کی قرآن وحدیث کے مصالح کے مطابق ہوں انھیں قبول کرتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہ آئیں، انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اُن کو بُرا بھلا نہیں کہتے نہ ان کو انبیاء کی طرح واجب الاطاعت جانتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا﴾

میں آخر میں آپ کا پھر شکر گزار ہوں کہ آپ نے تحقیق کرنے کی جرأت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

رسول اللہ ﷺ پر جادو کا ہونا اور حجیت خبر واحد

سوال رسول اللہ ﷺ پر جادو کیے جانے والی حدیث خبر واحد ہے۔ کیا خبر واحد محدثین کی نظر میں قابل استدلال ہے؟

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خاص طور پر رسالت کے لیے چنا، لہٰذا کیا آپ ﷺ پر جادو کا کیا جانا ممکن ہے؟

جواب آپ نے دو نکات کی وضاحت چاہی ہے: ① رسول اللہ ﷺ پر جادو کیے جانے والی حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد محدثین کی نظر میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔

② اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خاص طور پر رسالت کے لیے چنا، اس لیے ان پر

جادو کا کیا جانا محال ہے۔

اولاً: عام طور پر احادیث کو متواتر اور خبر واحد یا آحاد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ متواتر سے مراد وہ احادیث ہیں جنھیں صحابہ (اور سند کے دیگر راویوں) کی ایک کثیر تعداد نے روایت کیا ہے، اتنی تعداد کہ ان کا کسی جھوٹ پر اتفاق کر لینا ناممکن ہو۔

آحاد سے مراد وہ احادیث ہیں جن کے راوی، ایک یا دو یا تین (یا اس سے کچھ زائد) ہوں۔ عام طور پر صرف ایک ہی راوی روایت کر رہا ہو تو اسے غریب، دو کر رہے ہوں تو اسے عزیز اور تین یا زائد کر رہے ہوں تو اسے مشہور کہا جاتا ہے۔

تمام محدثین کے نزدیک خبر واحد حجت ہے، بشرطیکہ اس میں صحیح یا حسن حدیث کی شرائط پائی جاتی ہوں، یعنی حدیث کی سند راوی سے لے کر نبی کریم ﷺ تک متصل ہو، راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہو، اچھے حافظے کا مالک ہو، اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی اپنے بیان میں مخالفت نہ کر رہا ہو اور نہ حدیث میں کوئی اور علت (کمزوری) ہی ہو، جسے محدثین عموماً جان لیتے ہیں۔

تابعین کے زمانے میں ایک مشہور بزرگ حسن بصری رحمہ اللہ گزرے ہیں۔ ان کے حلقۂ درس میں ایک شخص واصل بن عطاء ان سے اختلاف کرنے کے بعد علیحدہ ہو گیا۔ عربی میں علیحدہ ہونے کے لیے لفظ اعتزال استعمال ہوتا ہے، اس لیے واصل بن عطاء اور اس کے ماننے والے معتزلہ کہلائے۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ شوشہ چھوڑا کہ خبر واحد عقائد میں حجت نہیں، البتہ اعمال و افعال میں حجت ہے۔ اپنی اس رائے کی بنا پر انھوں نے صحیح احادیث کو بھی ماننے سے انکار کر دیا، اگر وہ خبر واحد ہوں اور کسی

عقیدے کی بات ثابت کر رہی ہوں۔

ان کے اس اصول کی زد میں اہل سنت کے کئی عقائد آ گئے جنھیں وہ نہیں مانتے، جیسے عذاب قبر، واقعہ معراج، قیامت سے قبل مسیح علیہ السلام کا دوبارہ نزول، دجال کا ظہور وغیرہ وغیرہ۔

محدثین اور خاص طور پر امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور زمانہ تالیف ''الرسالۃ'' میں خبر واحد کی حجیت پر طویل بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اگر حدیث صحیح ہو تو وہ عقیدے میں بھی حجت ہے اور عمل کے لیے بھی حجت ہے، یعنی اصل حجت حدیث کا صحیح ہونا ہے۔ اگر اس کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے تو چاہے اس سے عقیدہ ثابت ہو یا کوئی عمل، دونوں طرح وہ حجت ہوگی۔ اور یہی بات ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے ملتی ہے، ملاحظہ ہو:

① اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آنے والے جبرائیل علیہ السلام تھے جن کے ذریعے سے آپ تک قرآن پہنچا، قرآن عقائد و اعمال سب کا مجموعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فرشتے کی روایت قرآن کو قبول کیا۔

② صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا اور اس پر ایمان لائے۔

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حکمرانوں اور بادشاہوں کے پاس خطوط بھیجے جنھیں عموماً ایک ایک آدمی کے ذریعے سے ارسال کیا گیا۔ ان خطوط میں ان حکمرانوں سے اسلام قبول کرنے، یعنی اپنا عقیدہ تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اگر یہ حکمران بھی معتزلہ جیسی روش اپناتے تو کہہ سکتے تھے کہ ہم ایک آدمی کے ذریعے سے لائے گئے پیغام کو کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اپنی ہٹ دھرمی اور تکبر کی بنا پر ایمان لانا پسند نہیں کیا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ کو صرف ایک شخص ہونے کی بنا پر نہیں جھٹلایا۔

④ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا اور ان سے کہا: تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو، انھیں سب سے پہلے ''لا إلٰہ إلا اللہ'' کی دعوت دینا۔ اگر وہ قبول کر لیں تو پھر نماز کی فرضیت کے بارے میں بتانا اور اگر اسے بھی قبول کر لیں تو پھر زکاۃ کے بارے میں بتانا۔[1] یعنی آپ نے اہل یمن کو عقیدہ تبدیل کرنے اور پھر کچھ احکامات پر عمل کرنے، دونوں امور کی دعوت صرف ایک شخص کے ہاتھ بھیجی۔ اگر ایک شخص کی روایت حجت نہ ہوتی تو رسول اللہ ﷺ بجائے ایک صحابی کے، دس بارہ بھیجا کرتے تاکہ ان کی روایت تواتر تک پہنچ جائے۔

⑤ نبی کریم ﷺ نے تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ مختلف مساجد میں مسلمانوں کو اس حکم سے آگاہ کر دیں۔ مدینہ کی پرانی مساجد میں سے ایک مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے۔ یہ وہ مسجد ہے جس میں لوگ نماز باجماعت پڑھ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کا منادی وہاں پہنچا۔ جونھی اس نے آپ ﷺ کا حکم سنایا، تمام کے تمام لوگ شمال سے جنوب کی طرف قبلہ رخ ہو گئے۔[2] گویا انھوں نے ایک شخص کی خبر کو فوراً تسلیم کیا۔

متواتر صرف قرآن ہے اور احادیث کی ایک قلیل تعداد۔ اسلام کے موٹے موٹے

[1] صحیح البخاري، المغازي، حدیث: 4347، وصحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 19 [2] صحیح البخاري، الصلاۃ، حدیث: 403، وصحیح مسلم، المساجد، حدیث: 526,525. جس مسجد میں اعلان کرنے کا واقعہ پیش آیا تھا وہ مسجد قباء ہے۔ مسجد قبلتین کے نام سے جو مسجد ہے، اس کے بارے میں معروف ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ نماز ظہر پڑھ رہے تھے کہ اسی عالم میں تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تو آپ نے اپنا رخ تبدیل کر لیا، اس لیے اسے مسجد قبلتین کہتے ہیں۔ (الطبقات الکبریٰ لابن سعد 244/1) لیکن اس کی سند نہایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں محمد بن عمر واقدی کذاب اور متروک راوی ہے۔

مظاہر، جیسے اذان، پنج وقتہ نماز اور نماز باجماعت بھی تواتر عملی کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں لیکن دین کا اکثر حصہ احادیث کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے جو کہ آحاد ہیں۔ آحاد احادیث کو اپنی اپنی مرضی یا اپنی اپنی سمجھ کی بنا پر چھوڑ دینا دین کے اکثر حصے کو دریا برد کرنے کے مترادف ہے، اس لیے اگر کوئی بات، چاہے اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا عملی احکام سے، صحیح یا حسن حدیث سے ثابت ہو جاتی ہے تو اسے ماننے بغیر چارہ نہیں۔

شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ یہ سزا قرآن سے ثابت نہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے قول اور فعل دونوں سے ثابت ہے۔[1] آحاد حدیث کو قبول نہ کرنے والے اس سزا کے بھی منکر ہیں، گو کہ اس سزا کا تعلق ایک عملی حکم سے ہے نہ کہ عقیدے سے۔

بعض اوقات تو منکرِ آحاد کو اپنی مصلحت کے لیے خبر واحد قبول کرنی پڑتی ہے، مثال کے طور پر ایک منکرِ خبرِ واحد سے سوال کریں کہ وہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ اس کا باپ واقعی اس کا باپ ہے؟ اس کے پاس دنیا میں صرف ایک شخص ہے جو یہ بتا سکتا ہے کہ اس کا باپ کون ہے؟ اور وہ ہے اس کی ماں۔ اگر اس کی ماں انکار کر دے کہ فلاں شخص تمھارا باپ نہیں بلکہ تمھارا باپ کوئی اور ہے تو اس کے پاس انسانوں میں سے کوئی دوسرا شخص ہو سکتا ہے جو ماں کی بات کو جھٹلا سکے؟

اب آئیے بخاری و مسلم کی بیان کردہ ان احادیث کی طرف جن میں رسول اللہ ﷺ پر جادو کیے جانے کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ کافی تفصیل طلب ہے، اس لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ تفہیم القرآن (از مولانا ابو الاعلی مودودی) کی آخری جلد میں معوذتین کے ضمن میں اس بحث کو ملاحظہ فرمالیں جس میں اس حدیث پر اٹھائے

[1] صحیح البخاري، المحاربین، حدیث: 6820,6819، وصحیح مسلم، الحدود، حدیث: 1691.

گئے تمام اعتراضات کا جواب آ گیا ہے۔

مولانا کی بحث میں مندرجہ ذیل نکات نکھر کر سامنے آ گئے ہیں:

① اس حدیث کو بیان کرنے والی صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی نہیں بلکہ زید بن ارقم اور چند دوسرے صحابہ بھی ہیں۔

② بخاری اور مسلم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنے مجموعہ احادیث میں جگہ دی ہے، جس سے اس حدیث کی صحت کا مرتبہ واضح ہو جاتا ہے۔

③ ضروری نہیں کہ ایک سورت ایک ہی دفعہ نازل ہو بلکہ اسے دوبارہ بھی کسی خاص مقصد کے لیے نازل کیا جا سکتا ہے، جیسے معوذتین، پہلے وہ مکہ میں نازل ہوئیں اور جب آپ پر جادو کا واقعہ ہوا تو سحر کے علاج کے طور پر دوبارہ ان کا نزول ہوا۔

④ سحر کی کئی قسمیں ہیں: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور مصر کے جادوگروں کے درمیان مقابلہ میں سحر کی وہ کیفیت تھی جسے تخییل کہا جاتا ہے، یعنی جادوگروں کی رسیاں حرکت نہیں کر رہی تھیں بلکہ آنکھوں کو ایسا دکھائی دیا جا رہا تھا۔

⑤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو جادو کیا گیا تھا وہ مرض کی قسم کا تھا، یعنی آپ کو گمان ہوتا تھا کہ آپ اپنی بیویوں کے پاس گئے ہیں (جنسی تعلق کے لیے) لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔

انبیاء کو مرض لاحق ہو سکتا ہے، جیسے ان پر زہر کا اثر ہو سکتا ہے۔ خیبر میں ایک یہودی عورت نے آپ کو زہر آلودہ کھانا کھلانے کی کوشش کی تھی، گو آپ نے اللہ کے بتائے جانے پر نوالہ اگل دیا تھا لیکن زہر اتنا تیز تھا کہ آپ نے مرض موت میں بھی اس کا ذکر کیا تھا کہ مجھے اب تک اس زہر کے اثر سے نجات نہیں ملی جو خیبر کی

یہودی عورت نے کھلایا تھا۔[1] ایسا ہی دوسرے عوارض کا مسئلہ ہے، جیسے آپ کا بخار میں مبتلا ہونا،[2] جنگ احد میں دندان مبارک کا ٹوٹنا[3] وغیرہ۔

ظاہری مرض کے علاج کے لیے دوا استعمال کی جاتی ہے۔ مرض نادیدہ ہو تو پھر رقیہ (جھاڑ پھونک کرنا) ہی علاج ہے، بشرطیکہ قرآن سے ہو یا سنت سے۔

⑥ کفار نے آپ ﷺ کے بارے میں مسحور کا لفظ استعمال کیا:

﴿إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا ۝﴾

''تم ایک مسحور شخص ہی کی پیروی کرتے ہو۔''[4]

یہاں ان کی مسحور سے مراد پاگل پن ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ جو دعوائے نبوت کر رہے ہیں یا قرآن سنا رہے ہیں، وہ سب نعوذ باللہ عقل کے زائل ہونے کی بنا پر ہے۔ یہ بات تو کفار نے مکہ مکرمہ ہی میں کہہ ڈالی تھی۔ آپ ﷺ پر جادو کیے جانے کا واقعہ تو بہت بعد میں سن 7 ہجری کے قریب پیش آیا۔ اس کے بعد آپ چار سال اور زندہ رہے۔ اگر اس واقعہ کی بنا پر آپ کو مطعون کیا جاتا تو اس قسم کا الزام ان آخری چار سالوں میں لگایا جاتا۔

صاحب تفہیم القرآن کے مضمون کا خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا، میں دو باتوں کا مزید اضافہ کرتا ہوں:

⑦ ابن قیم رحمہ اللہ بدائع الفوائد میں لکھتے ہیں: ''رہا یہ کہنا کہ انبیاء پر جادو کا ہونا، اللہ تعالیٰ کے انھیں چن لینے اور ان کی حفاظت کرنے کے منافی ہے تو جان لیجیے کہ جس طرح

[1] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4428، وصحيح مسلم، السلام، حديث: 2190.
[2] صحيح البخاري، المرضى، حديث: 5648، وصحيح مسلم، البر والصلة والآداب، حديث: 2571. [3] سنن ابن ماجه، الفتن، حديث: 4027، ومسند أحمد: 206/3. [4] بني إسرآئيل 47:17.

اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں، وہاں کفار کی طرف سے انھیں تکلیف پہنچا کر ان کی آزمائش بھی کرتے ہیں تاکہ وہ انتہائی اعزاز واکرام کے مستحق ٹھہریں اور تاکہ بعد میں آنے والے ان کے خلفاء اور ان کے امتی جب کبھی اللہ کی راہ میں ستائے جائیں تو پھر انبیاء اور رسولوں پر آنے والی مصیبتوں اور تکالیف کو یاد کر کے اپنی ہمت بڑھائیں اور انھی کی طرح ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کفار کا نامۂ اعمال اور زیادہ سیاہ ہو جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جلد سے جلد اپنی سزا کو پالیں اور دنیا ان کے وجود نامسعود سے پاک وصاف ہو جائے۔''[1]

⑧ مصر کے مشہور عالم محمد متولی شعراوی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر خفیف سا جادو کیے جانے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ کفار پر اتمام حجت کیا جا سکے۔ جو جو حربہ وہ آزما سکتے تھے انھیں اللہ نے موقع دیا کہ وہ اسے آزما کر دیکھ لیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ ثابت قدم رہے۔ اگر یہ جادو اثر نہ کرتا یا انھیں جادو کرنے کا موقع ہی نہ دیا جاتا تو وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ محمد ﷺ بشر نہیں ہیں، اسی لیے جادو نے ان پر اثر نہیں کیا۔ اب جبکہ انھوں نے جادو کیا اور آپ ﷺ پر خفیف سا اثر بھی ہوا جو کہ ان کے اصل مشن، یعنی تبلیغ رسالت میں حائل نہیں ہوا تو کفار کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہا۔ انھوں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی، بار بار مدینہ پر چڑھائی کی اور بالآخر جادو کر کے بھی دیکھ لیا لیکن رسول اللہ ﷺ کو ختم کرنے کی سازش میں بری طرح ناکام ہوئے۔ آپ بشری حیثیت سے تھوڑے بہت متاثر ہوئے، جیسے جنگ احد میں دندان مبارک کا شہید ہونا اور اسی طرح جادو کا خفیف اثر ہونا اور ایسے ہی زہر کا معمولی اثر قبول کرنا لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی حفاظت میں رکھا اور کفار کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔

[1] بدائع الفوائد: 452/2.

بیعت کی شرعی حیثیت

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین بابت اس مسئلہ کے کہ پاک و ہند میں پیر و مرشد عوام سے جو بیعت لیتے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ بات کہاں تک درست ہے کہ جس کا کوئی پیرو مرشد نہ ہو اس کا پیرو مرشد شیطان ہوتا ہے جیسا کہ عوام میں مشہور ہے؟ براہ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔ (از قاری محمد ایاز الدین، حیدر آباد، انڈیا)

جواب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

جواباً عرض ہے کہ یہ سوال تفصیلی وضاحت چاہتا ہے جو درج ذیل ہے:

بیعت کا لفظ بیع سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے سودا کرنا، چاہے یہ سودا مال کا ہو یا کسی ذمہ داری کا۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۚ وَمَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○﴾

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی، وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو قتل کرتے ہیں اور (خود) قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات، انجیل اور قرآن میں...... اور کون ہے اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا

کرنے والا!! تو تم لوگ اپنی اس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ تعالیٰ سے کی ہے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔"[1]

اور اصطلاحاً (بیعت) اس معاہدے کو کہتے جو امیر کی اطاعت کے لیے کیا جاتا ہے۔ بیع وشراء میں خریدنے والا بیچنے والے کے ہاتھ میں پیسہ تھماتا ہے اور بیچنے والا مشتری کے ہاتھ میں اس کی خرید کردہ چیز دیتا ہے، اسی طرح بیعت کرنے والا اپنے پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کا اقرار کرتا ہے۔ قرآن وحدیث میں چار طرح سے اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر اہلِ ایمان کی بیعت کا ذکر ہے۔

① عمومی بیعت، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

"جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پھر جو شخص عہد شکنی کرے وہ اپنے نفس ہی کی عہد شکنی کرتا ہے اور جو شخص اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا ہے تو اسے عنقریب اللہ بہت بڑا اجر دے گا۔"[2]

② بیعت رضوان جو چھ ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر لی گئی تھی، فرمایا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ مومنوں سے خوش ہو گیا جب وہ درخت تلے تجھ سے بیعت

[1] التوبة 9:111۔ [2] الفتح 48:10۔

کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کے دلوں میں جو تھا اسے اس نے معلوم کرلیا اور ان پر اطمینان نازل فرمایا اور انھیں قریب کی فتح عنایت فرمائی۔''[1]

③ آپ نے فتح مکہ اور اس کے بعد عورتوں سے خاص طور پر بیعت لی، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''اے نبی! جب مسلمان عورتیں آپ سے ان باتوں پر بیعت کرنے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا کاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی اور کوئی ایسا بہتان نہ باندھیں گی جو خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیں اور کسی نیک کام میں تیری حکم عدولی نہ کریں گی، تو آپ ان سے بیعت کرلیا کریں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا معاف کرنے والا ہے۔''[2]

④ **انفرادی بیعت:** عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی تو میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے کہا: اپنا دایاں ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کرسکوں۔ تو آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا لیکن میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا: آپ ﷺ نے فرمایا: ''عمرو! کیا ہوا؟'' میں نے کہا: میں ایک شرط رکھنا چاہتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کون سی شرط؟'' میں نے کہا: اللہ میری مغفرت فرمائے! تو آپ ﷺ نے

[1] الفتح 18:48. [2] الممتحنۃ 12:60.

ارشاد فرمایا: ''کیا تمھیں معلوم نہیں کہ اسلام لانے سے پچھلے تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور ایسا ہی ہجرت اور حج کرنے سے پہلے جو کچھ کیا ہو، سب معاف ہو جاتا ہے؟''[1]

بیعت سے متعلق چند مزید احادیث (اور احکام) بھی ملاحظہ ہوں:

حاکم وقت کی اطاعت کا عہد: عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان باتوں پر بیعت کی:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ چاہے تنگی کا عالم ہو یا فراخی کا، چاہے پسندیدہ بات ہو یا ناپسندیدہ، چاہے ہمارے اوپر کسی کو ترجیح ہی کیوں نہ دی گئی ہو، اس شرط کے ساتھ کہ ہم صاحب امر کے ساتھ جھگڑا نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم جہاں کہیں ہوں حق بات کہیں گے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔[2]

ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیعت وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے آنے والوں سے مقام عقبہ (منیٰ) میں لی تھی:

''اور یہ کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم یثرب آئیں تو ہم ان کی مدد کریں گے اور جس طرح ہم اپنی جانوں، اپنی ارواح اور اپنی اولاد کا دفاع کرتے ہیں ویسا ہی ان کا بھی دفاع کریں گے اور ہمارے لیے جنت ہوگی۔''[3]

یہ اطاعت مشروط ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک مسلمان کو حاکم وقت کی بات سننا اور اطاعت کرنا لازم ہے چاہے پسندیدہ امر ہو یا

[1] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 121. [2] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1709. [3] البدایة والنهایة: 189/3.

ناپسندیدہ، الّا یہ کہ اسے کسی گناہ کا حکم دیا جائے، ایسی صورت میں سمع و اطاعت نہیں۔"[1]

بیعت کا دائرہ "امامت کبریٰ" تک محدود ہے۔ ایسے امام ہی کی بیعت کی جاسکتی ہے جو واقعی اقتدار رکھتا ہو، حدود نافذ کرسکتا ہو، صلح و جنگ کے معاہدے کرسکتا ہو۔

③ ایک امام کی بیعت کے بعد دوسرے امام کی بیعت جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "جس کسی نے کسی امام کی بیعت کی، اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور اپنا دل اس کے حوالے کردیا تو جب تک استطاعت ہے، اس کی اطاعت کرے، پھر اگر کوئی دوسرا شخص (امامت میں) اس کے ساتھ نزاع کرے تو دوسرے شخص کی گردن ماردو۔"[2]

④ جماعت سے خروج ناجائز ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص (امامِ وقت کی) اطاعت سے نکل گیا اور جماعت کو چھوڑ گیا پھر مرگیا، تو وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے اور جو شخص کسی اندھے جھنڈے کے نیچے قتال کرتا ہے، یا کسی عصبیت کی بنا پر غصے میں آجاتا ہے، کسی عصبیت کی طرف بلاتا ہے یا عصبیت کی مدد کرتا ہے اور اس دوران میں قتل ہوجاتا ہے تو اس کی موت بھی جاہلیت کی موت ہوگی۔ اور جو شخص میری امت پر خروج (بغاوت) کرتا ہے، وہ نیکوکار اور گنہگار سب کو مارتا ہے اور کسی مومن کے ساتھ برائی کرنے سے باز نہیں آتا اور جس سے عہد کیا ہے اس کے عہد کو پورا نہیں کرتا تو وہ مجھ سے نہیں اور میں اس سے نہیں۔"[3]

⑤ نبیٔ اکرم ﷺ کے بعد بھی بیعت کے سلسلے میں صحابہ کرام کا یہی طرزِ عمل تھا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

نافع بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مطیع کے پاس آئے اور یہ وقت

[1] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1839۔ [2] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1844۔ [3] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1848۔

تھا جب یزید بن معاویہ کے زمانے میں حرہ کا واقعہ ہوا۔ ابن مطیع نے کہا: ابوعبدالرحمٰن کے لیے تکیہ لگا دو۔ عبداللہ بن عمر نے کہا: میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا، تمھیں صرف ایک حدیث سنانے آیا ہوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اور وہ یہ ہے:

''جس نے اپنا ہاتھ حلقۂ اطاعت سے ہٹا لیا تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے پاس کوئی دلیل (عذر خواہی) نہ ہوگی اور جو شخص اس حال میں مرے کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔''[1]

ان آیات واحادیث سے یہ باتیں معلوم ہوئیں:

① اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کسی دوسرے خلیفہ یا امام کی بیعت سے مختلف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت گویا اللہ سے بیعت ہے۔ آپ ﷺ نے عقبہ (پہاڑی گھاٹی) میں جب انصار مدینہ سے بیعت لی تھی تو گو اس وقت آپ کے پاس اقتدار نہ تھا لیکن بحیثیت رسول ﷺ آپ نے یہ بیعت لی تھی اور یہ بھی ایک خاص مقصد کے لیے تھی کہ انصار اس وقت آپ کی پوری پوری حفاظت کریں گے جب آپ مدینہ پہنچ جائیں گے۔

② مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ بلا شرکت غیرے اقتدار کے مالک تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ سے مختلف مواقع پر سمع و اطاعت کی بیعت لی اور بعض مواقع پر خاص خاص باتوں پر بیعت لی۔

حدیبیہ کے مقام پر جب یہ افواہ گرم ہوئی کہ مکہ والوں نے آپ ﷺ کے ایلچی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ہے تو آپ ﷺ نے اپنے پندرہ سو رفقاء سے بیعت

[1] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1851

لی اور یہ اس بات پر تھی کہ وہ راہ فرار اختیار نہ کریں گے[1] اور دوسری روایت کے مطابق یہ بیعت موت پر تھی۔[2]

③ صلح حدیبیہ کے بعد جو خواتین ہجرت کر کے مدینہ آئیں یا فتح مکہ کے مواقع پر مسلمان ہوئیں ان سے سورۂ ممتحنہ کی آیت کے مطابق چند مخصوص باتوں پر بیعت لی۔ یہ عورتیں چونکہ نئی نئی مسلمان ہوئیں تھیں، اس لیے ان چیزوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا جن میں وہ ایام جاہلیت میں ملوث رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے نومسلم مردوں سے بھی انھی باتوں پر بیعت لی تھی۔[3]

④ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تو ہر حال میں واجب ہے، بعد کے امراء و خلفاء کے لیے بھی سمع و اطاعت کی بیعت کا حکم دیا گیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اگر وہ گناہ کی طرف بلائیں گے تو ان کی اطاعت نہیں ہوگی۔

⑤ خلیفہ کی بیعت اتنی اہم ہے کہ اگر کوئی دوسرا خلافت کا دعویدار پیدا ہو جائے تو اس کی گردن مارنے کا حکم دیا گیا اور یہ اس لیے کہ اسلامی مملکت میں بدامنی کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ خلیفہ کے پاس مکمل اقتدار ہو، وہ حدود نافذ کرسکتا ہو، جنگ اور صلح کے معاہدے کرسکتا ہو۔

⑥ خلیفہ کے ہوتے ہوئے اس کی اطاعت نہ کرنا اور جماعت سے خروج کرنا قابلِ مؤاخذہ جرم ہیں۔ اور ایسے آدمی کی موت جاہلیت کی موت ہے۔ ایسے ہی اُن لوگوں کی بھی جو کسی مذموم عصبیت (برادری، قومیت، زبان، رنگ یا پارٹی) کی بنا پر قتل و قتال پر آمادہ ہو جائیں۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1856. [2] صحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1860. [3] المستدرك للحاکم: 2/581.

بنوامیہ کے دور کے بعد جب بنوعباس سرآرائے خلافت ہوئے لیکن اندلس جیسے دور دراز علاقے میں بنوامیہ کے امراء نے اپنی حکومت قائم کر لی تو علمائے امت نے فتنہ وفساد کا دروازہ بند کرنے کے لیے اس بات پر اتفاق کیا کہ ایک وقت میں دور دراز علاقوں میں دو علیحدہ علیحدہ خلافتیں ہوسکتی ہیں اور پھر اسی اصول کے تحت بعد کے ادوار میں خراسان اور ہندوستان کی مملکتیں بھی برداشت کی گئیں۔

⑦ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس شخص کی بیعت نہیں کی جس نے خلیفہ وقت کے خلاف خروج کیا ہو۔ اس تمام تفصیل سے یہ تو واضح ہوگیا کہ بیعت کا دائرہ ''امامت کبریٰ'' تک محدود ہے۔ ایسے امام کی بیعت ہی کی جاسکتی ہے جو واقعی اقتدار رکھتا ہو، حدود نافذ کرسکتا ہو، صلح و جنگ کے معاہدے کرسکتا ہو، وہ چاہے جہاد پر بیعت لے یا کسی فعل خیر پر یا کسی برائی سے روکنے پر۔ بیعت لینا اس کا حق ہے، البتہ کسی غیر اسلامی کام پر اگر وہ بیعت لینا چاہے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ صوفیاء کے حلقہ میں بیعت اصلاح وارشاد کے نام سے ایک نئی روایت ڈالی گئی جس کا خیر القرون میں کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ اگر مقصود لوگوں کی اصلاح ہے تو وہ مسجد کے منبر سے، خطیب کے خطبات سے، معلم کی تعلیم سے اور بڑے بوڑھوں کی فہمائش سے بھی حاصل ہوسکتی ہے اور ان سے بڑھ کر نیک لوگوں کی صحبت اس کام کے لیے ایک نسخۂ کیمیا ہے۔ شریعت کوئی ایسا حکم نہیں دیتی جو غیر ضروری اور بے فائدہ ہو۔ شیخ یا مرشد جسے کوئی اختیار حاصل نہ ہو، اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے آخر کون سا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر بالفرض ایک لمحہ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ لوگوں کی اصلاح کے لیے یہ طریقہ کارگر ہوسکتا ہے تب بھی مندرجہ ذیل قباحتوں کی بنا پر اسے قبول نہیں کیا جاسکتا:

① ﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

''وہ یہ کہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔''[1]

دین کا راستہ شریعت کا راستہ ہے اور اسی راستے پر چلنے ہی میں نجات ہے۔

② ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾

''تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''[2]

مذہبی فرقہ بندی تو شروع ہو ہی گئی تھی کہ طریقت کے نام پر بے شمار سلاسل وجود میں آ گئے اور پھر ہر سلسلہ ایک مستقل فرقہ اور جماعت بن گئی۔

نبی ﷺ نے تو ناجی جماعت کی نشانی یہ بتائی تھی: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي. ''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ......'' لیکن ہر صاحب سلسلہ اور ہر وہ جماعت جو بیعت کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اپنے طرز عمل سے یہ کہہ رہی ہوتی ہے: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَسِلْسِلَتِي أَوْ حِزْبِي. یعنی جس پر میں ہوں اور میرا طریقہ یا میری جماعت۔

چنانچہ اس سلسلے یا جماعت کو چھوڑنے کا مطلب ہے کہ گویا وہ شخص اسلام سے خارج ہو گیا ہے۔ یہاں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ذکر کردہ ایک واقعہ پیش کرتا ہوں جو ان کے جریدہ اہل حدیث 17 مارچ 1924ء میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں:

[1] الأنعام 6:153. [2] آل عمران 3:105.

"یہاں پر ایک واقعہ بلا کم و کاست ناظرین کے سامنے رکھتا ہوں، حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی (جو میرے گمان میں مرد صالح ہیں) مولوی اشرف علی تھانوی کے مرید تھے اور بعد بیعت مسئلہ تقلید کی تحقیق کر کے مقلد سے غیر مقلد ہو گئے مگر مولانا مرحوم کے حق میں انھوں نے کسی قسم کی بدگمانی نہیں کی۔ اس پر بھی مولانا کا ایک پوسٹ کارڈ (جو میں نے بچشم خود دیکھا ہے) موصوف کو پہنچا جس کا مضمون یہ تھا کہ غیر مقلد ہو جانے کی وجہ سے میں تم کو اپنے حلقۂ بیعت سے خارج کرتا ہوں۔ اب میرا تمھارا پیری مریدی کا تعلق نہیں رہا۔ (أو کما قال) ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

③ شیخ سے بیعت کرنا عذاب قبر سے چھٹکارا دلاتا ہے۔ پہلے یہ واقعہ پڑھیے اور پھر تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

"شیخ الاسلام چشتی اجمیری قدس سرہ العزیز کی یہ رسم تھی کہ جو کوئی ہمسایہ میں سے اس دنیا سے نقل (انتقال) کرتا، اس کے جنازے کے ساتھ جاتے اور خلق کے لوٹ جانے کے بعد اس کی قبر پر بیٹھتے اور جو درود ایسے وقت میں پڑھتے آئے ہیں پڑھتے، پھر وہاں سے آتے، چنانچہ اجمیر میں آپ کے ہمسایوں میں سے ایک نے انتقال کیا۔ دستور کے مطابق آپ جنازے کے ساتھ گئے۔ جب اسے دفن کر چکے، خلق لوٹ آئی اور خواجہ وہیں ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ اٹھ گئے۔ شیخ الاسلام قطب الدین فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ تھا، میں نے دیکھا کہ دم بدم آپ کا رنگ متغیر ہوا، پھر اسی وقت برقرار ہوگیا۔ جب آپ وہاں سے کھڑے ہوئے تو فرمایا: الحمد للہ بیعت بڑی اچھی چیز ہے۔ شیخ الاسلام قطب الدین اوشی نے آپ سے سوال

کیا تو آپ نے فرمایا: جب لوگ اس کو دفن کر کے چلے گئے تو میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عذاب کے فرشتے آئے اور انھوں نے کہا کہ اس کو عذاب کریں۔ اسی وقت شیخ عثمان ہارونی (آپ کے پیر صاحب) قدس سرہ العزیز حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص میرے مریدوں میں سے ہے۔ جب خواجہ عثمان نے یہ کہا تو فرشتوں کو فرمان ہوا کہ کہو: ''یہ تمھارے برخلاف تھا۔'' خواجہ نے فرمایا: بیشک اگرچہ برخلاف تھا مگر چونکہ اس نے اپنے آپ کو اس فقیر کے پلے باندھا تھا تو میں نہیں چاہتا کہ اس پر عذاب کیا جائے۔ فرمان ہوا: اے فرشتو! شیخ کے مرید سے ہاتھ اٹھاؤ۔ میں نے اس کو بخش دیا۔ پھر شیخ الاسلام کی آنکھ میں آنسو بھر آئے اور فرمانے لگے: اپنے آپ کو کسی کے پلے باندھنا بہت ہی اچھی چیز ہے۔ [1]

سبحان اللہ! نہ شریعت پر عمل کرنے کی ضرورت، نہ کتاب وسنت کا کوئی لحاظ، شیخ کی بیعت جنت کا پروانہ ہوگیا۔

اور پھر جس طرح سے یہاں کتاب وسنت کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ اللہ عالم الغیب ہے لیکن یہاں شیخ عذاب قبر کا سارا انتظام دیکھ رہے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ فرشتہ جبرئیل سے ہم کلام ہوتے تھے، یہاں شیخ عذاب کے فرشتوں سے مجادلہ کررہے ہیں۔ حدیث کے مطابق انبیاء اور صلحاء کو قیامت کے دن شفاعت کا موقع دیا جائے گا، یہاں عین عذاب قبر سے پہلے ہی شفاعت کی جارہی ہے جو فوراً ہی قبولیت کے مراحل طے کرگئی۔

جس صحیح حدیث میں نبی ﷺ کے دو قبروں پر سے گزرتے، دونوں کو عذاب قبر

[1] شریعت وطریقت از مولانا عبدالرحمٰن کیلانی، ص:305.

ہونے، آپ کے ان دونوں قبروں پر ٹہنی لگانے کا واقعہ نقل ہوا ہے اور پھر ٹہنیوں کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں تخفیف کا ذکر ہے، [1] اسے ذرا ذہن میں تازہ کیجیے۔ نبی ﷺ جنھیں الہام الٰہی سے دو اشخاص کے عذاب قبر کے بارے میں بتایا گیا، وہ یقیناً مسلمان تھے، رسول اللہ ﷺ کی بیعت میں داخل تھے لیکن انھیں تو یہ بیعت کام نہ آئی یہاں تک کہ رسول ﷺ نے ان کے لیے دعا کی اور بطور علامت وہ ٹہنیاں بھی لگائیں کہ جن کے خشک ہونے تک دونوں کے عذاب میں تخفیف کی گئی تھی، کیا یہ ایک قباحت ہی کافی نہیں کہ جس سے مزعومہ بیعت کی قلعی کھل جاتی ہے۔

④ طریقت اور بیعت چونکہ لازم وملزوم ہیں، چنانچہ اس تعلق سے بھی نئے نئے شگوفے کھلتے ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں: ''بیعت کے سلسلے میں صوفیہ نے ایک اور شاندار کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اویس قرنی نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا، نہ بیعت کی تو ان کے ارواح کی آپس میں بیعت کرا دی اور اسے نسبت اویسیہ کا نام دیا۔ شیخ کی فلاں شیخ سے ملاقات ہی ثابت نہیں یا پیر کی وفات کے بہت عرصہ بعد مرید کی پیدائش ہوئی ہو تو وہ یہی نسبت اویسیہ قائم کر کے اپنا سلسلہ جاری فرما کر کام چلا لیتے ہیں۔''

⑤ اپنی غلط رسموں کو جائز کرنے کے لیے قرآن وسنت کی مخصوص تاویلات فاسدہ کی جاتی ہیں کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ابن جوزی، محمد بن طاہر کے حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں: ''پھٹے ہوئے کپڑے پہننے کے بارے میں شیخ کا مرید پر شرط لگانا'' پھر انھوں نے اس بات کے ضمن میں بطور دلیل عبادہ بن صامت کی یہ حدیث

[1] صحیح البخاري، الوضوء، حدیث: 216، وصحیح مسلم، الطهارة، حدیث: 292.

پیش کی ہے: ''ہم نے رسول اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم تنگی اور فراخی ہر حال میں سمع و اطاعت کریں گے۔'' دیکھیے کیا خوب نکتہ نکالا ہے۔ کہاں شیخ کا مرید پر مذکورہ شرط رکھنا اور کہاں اسے رسول اللہ ﷺ کی بیعت اسلام سے جوڑنا جو کہ نہ صرف لازم ہے بلکہ خود رسول کی اطاعت بھی واجب ہے۔

⑥ اگر امت مسلمہ ایک بڑے جہاز کی مانند ہے تو یہ مختلف فرقے اور طریقے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی مانند۔ شدید طوفان کی صورت میں جہاز تو بچ جاتا ہے لیکن چھوٹی کشتیاں غرق آب ہو جاتی ہیں۔ تعجب ہے کہ کتاب و سنت کے جہاز کو چھوڑ کر لوگ ان بجروں (مخصوص گول کشتیوں) پر کیوں سوار ہوتے ہیں جبکہ سمندر میں تلاطم ہی تلاطم ہے اور کشتی کسی وقت بھی ڈوب سکتی ہے۔

آخر میں ان چند شبہات کا جائزہ بھی لے لیا جائے جو قائلین بیعت کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں:

① ''تین آدمی بھی سفر کر رہے ہوں تو ایک کو امیر بنانے کا حکم ہے، چہ جائیکہ پوری جماعت ہو اور اس کا امیر نہ ہو۔''

سفر میں امیر بنانا رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے ثابت ہے لیکن وہاں بیعت کا ذکر نہیں ہے اور یہ امارت سفر کے ختم ہونے کے ساتھ ہی تمام ہو جاتی ہے۔ گویا وقتی طور پر نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے ایسے پیر کی اطاعت لازمی قرار دی گئی لیکن اسے امامت کبریٰ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، جہاں دوسرے مدعی امامت کو برداشت نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی گردن مار دی جاتی ہے۔

② ''بیعت اصلاح و ارشاد کو نماز کی امامت کی طرح سمجھا جائے، یعنی امامت صغریٰ کو

امامت کبریٰ سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔''

امارت سفر کی طرح نماز کی امامت بھی نماز کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے، جونہی امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا، مقتدی اور امام کا تعلق ختم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ خلیفہ وقت کی موجودگی میں کیا صرف ایک ہی نماز با جماعت کا اہتمام کیا جاتا تھا یا ہر علاقے بلکہ ہر محلے کی مسجد میں نماز نہیں ہوتی تھی؟ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھتے اور پھر عوالی جا کر اہل محلّہ کو نماز پڑھایا کرتے تھے۔ [1] لیکن امام وقت یا خلیفہ حاضر سے بیعت کرنے کے بعد کیا ہر شہر یا ہر محلّہ میں جزوی بیعت ہوا کرتی تھی، جو پیرو مرشد اپنے لیے روا رکھتا ہو؟ کم از کم خیر القرون میں تو ایسی بیعت کا نام ونشان نہ تھا۔ قرون ثلاثہ (زمانہ رسول، زمانہ صحابہ، زمانہ تابعین اور تبع تابعین) کے بعد جہاں فرقہ بازی کی بدعت پیدا ہوئی وہاں تصوف کے سلسلوں کے نام پر مشائخ کے ہاتھ پر بیعت اصلاح وارشاد کی بدعت بھی وجود پذیر ہوئی۔

③ ''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں طوقِ بیعت نہ تھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔'' (الحدیث) [2]

شریعت کے تمام احکامات استطاعت سے مشروط ہیں۔ ایک شخص حج کی استطاعت رکھتا ہو لیکن بیت اللہ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہوں، چاہے جنگ وجدال کی بنا پر یا کسی دوسرے سبب کی بنا پر تو ایسے شخص پر حج کرنا واجب نہ ہوگا جب تک کہ راستے کھل نہ جائیں، حالانکہ ایسی ہی وعید حج پر نہ جانے والوں کے لیے بھی ہے۔ ایسے ہی زکاۃ ادا نہ کرنے والے کے لیے سخت عذاب کی وعید ہے لیکن جس شخص کے پاس اتنا

[1] صحيح البخاري، الأدب، حديث:6106، وصحيح مسلم، الصلاة، حديث:465. [2] صحيح مسلم، الإمارة، حديث:1851.

مال ہی نہ ہو کہ جس میں زکاۃ واجب ہو تو وہ زکاۃ دینے سے مستثنیٰ ہے۔ وضو میں ہاتھ پیر دھونے لازم ہیں لیکن اگر کسی کا ہاتھ یا پیر کٹا ہوا ہو تو وہ اسے کیسے دھوئے گا؟

لعینہٖ اگر ایسا خلیفہ موجود ہو جو صاحب اقتدار ہو، حدود کو نافذ کر سکتا ہو، صلح و جنگ کے جھنڈے بلند کر سکتا ہو، قرآن و سنت کو نافذ کر سکتا ہو تو جہاں جہاں اس کا اقتدار ہے وہاں وہاں تمام لوگوں پر اس کی بیعت لازم ہے، نہ بیعت کریں گے تو بموجب حدیث مذکور جاہلیت کی موت مریں گے۔ لیکن اگر خلیفہ سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر بیعت کا محل نہ ہونے کی بنا پر یہ حکم بھی ساقط ہو جائے گا اور ایسے ہی وہ لوگ جو ایک خلیفہ کے دائرے اقتدار سے خارج رہتے ہوں ان کے لیے بھی ایسے خلیفہ کی بیعت لازم نہ ہوگی۔

1924ء میں خلافت عثمانیہ کے ختم کیے جانے کے بعد اول تو مسلم ممالک پر استعمار کا غلبہ ہو گیا۔ خود ہندوستان بھی ڈیڑھ سو سال انگریزی استعمار کا ہر اول دستہ بنا رہا تو جب خلیفہ ہی نہ رہا تو بیعت کس کے ہاتھ پر کی جاتی۔ مسلم ممالک آزاد ہونا شروع ہوئے تو اکثر نے جمہوری یا آمرانہ نظام اپنایا۔ بیعت کے اس طریقہ کو خیر آباد کہا جو اہل حل وعقد کی مشاورت سے منعقد ہوتی ہے، اس لیے نظام بیعت بھی معطل ہوتا چلا گیا۔ جہاں جہاں کسی درجے میں بھی ایسا نظام قائم ہو جو کتاب و سنت کو نافذ کرتا ہو، وہاں حاکم وقت کے ہاتھ پر بیعت کرنا لازمی ہے۔ سعودی عرب میں گو شاہی نظام نافذ ہے لیکن بادشاہ کی بیعت کے بعد ہی اس کی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔

④ بیعت اصلاح و ارشاد کا ایک عہد نامہ کی طرح اعتبار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟
یہاں بھی یہی کہا جائے گا کہ سلف صالحین میں اس کا رواج نہ تھا۔

ابو نعیم اصبہانی اپنی کتاب حلیۃ الأولیاء میں اپنی اسناد ذکر کرنے کے بعد مطرف بن عبداللہ بن شخیر (تابعی) کی یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ہم زید بن صوحان کے پاس جایا کرتے تھے جو کہا کرتے تھے: ''اے اللہ کے بندو! اکرام کرو اور (عمل میں) خوبصورتی پیدا کرو! بندے اللہ تک ان دو وسیلوں سے پہنچ سکتے ہیں، خوف و طمع۔''

ایک دن ہم ان کے پاس آئے تو دیکھا کہ (شاگردوں نے) ایک عبارت اس مضمون کی لکھی ہے: ''اللہ ہمارا رب ہے، محمد ﷺ ہمارے نبی ہیں، قرآن ہمارا امام ہے، جو ہمارے ساتھ ہوگا ہم اس کے ساتھ ہیں اور اس کے لیے ہیں۔ جو ہمارے مخالف ہوگا، ہمارا ہاتھ اس کے خلاف ہوگا اور ہم ایسا ویسا کریں گے۔

پھر انھوں نے یہ مکتوب لیا اور ہر شخص سے باری باری یہ کہا: اے فلاں! کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو؟ یہاں تک کہ میری باری آ گئی اور انھوں نے کہا: اے لڑکے! تم بھی اقرار کرتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں! کہنے لگے: اس لڑکے کے بارے میں جلد بازی نہ کرو۔ پھر مجھ سے پوچھا: بچے! تم کیا کہنا چاہتے ہو، میں نے کہا: اللہ نے اپنی کتاب میں مجھ سے ایک عہد لیا ہے اور میں اس عہد کے بعد کسی اور عہد کا پابند نہیں ہوں۔ یہ سننا تھا کہ تمام کے تمام لوگ اس عہد نامے سے رجوع کر گئے، کسی ایک نے بھی اقرار نہ کیا۔ میں نے مطرف سے پوچھا: تمھاری تعداد کیا تھی؟ بولے: تیس کے قریب آدمی ہوں گے۔ [1]

امام ابن تیمیہ نے اس مسئلے کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ ایک فتویٰ کے ضمن میں کہتے ہیں: ''اگر لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور نیکی و تقویٰ پر

[1] حلیۃ الأولیاء: 2/204.

تعاون کرنے پر جمع ہوں تو بھی ہر شخص دوسرے شخص کے ساتھ ہر بات میں نہ ہوگا بلکہ صرف اس حد تک جہاں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہوگی۔ اگر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی ہو رہی ہو تو وہ ساتھ نہ دے گا۔ یہ لوگ سچائی، انصاف، احسان، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مظلومین کی مدد اور پھر ہر اس کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں۔ وہ نہ ظلم کرنے پر، نہ کسی جاہلی عصبیت پر، نہ خواہشات ہی کی پیروی پر تعاون کریں گے، نہ فرقہ بازی اور اختلاف ہی پر اور نہ اپنی کمر کے گرد پٹی باندھ کر کسی شخص کی ہر بات ماننے پر تعاون کریں گے اور نہ کسی ایسے حلف نامے ہی میں شریک ہوں گے جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف ہو۔

ان میں سے کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ اپنے یا کسی دوسرے کے استاد کی خاطر اپنی کمر کے گرد پٹی باندھے جیسے سوال میں پوچھا گیا۔ کسی ایک معین شخص کے لیے پٹی باندھنا یا اس کی طرف نسبت کرنا، جاہلیت کی بدعات میں سے ہے اور ان حلف ناموں کی طرح ہے جو جاہلیت میں کیا کرتے تھے یا قیس و یمن کی فرقہ بازیوں کی طرح ہے۔ اگر اس باندھنے سے مراد بر و تقویٰ پر تعاون ہے تو اللہ اور اس کے رسول نے ویسے ہی اس کا حکم دیا ہے، بغیر کسی ایسے بندھن کے۔ اور اگر اس سے مراد گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون ہے تو وہ ویسے ہی حرام ہے، یعنی اگر اس طرح خیر کا کام کرنا مقصود ہے تو اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات میں اس کام کی پوری رہنمائی ملتی ہے۔ استاد کے ساتھ اس نسبت کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر برائی مقصود ہے تو اللہ اور اس کے رسول اسے حرام قرار دے چکے ہیں۔"

کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی دوسرے شخص سے اپنی ہر بات منوانے پر عہد لے یا اس بات پر کہ جس کا میں دوست ہوں اس سے دوستی رکھو اور جس کا میں دشمن ہوں اس سے دشمنی رکھو بلکہ ایسا کرنے والا چنگیز خان اور اس کے حواریوں جیسا ہے۔ اور جو ہر اس شخص کو اپنا دوست اور حمایتی سمجھتے ہیں جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتا ہو اور ہر اس شخص کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں جو ان کی مخالفت کرتا ہو بلکہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کیا ہوا عہد یاد رکھنا چاہیے کہ اطاعت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی۔ صرف وہی کام کرنا ہے جس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے، ہر اس چیز کو حرام ٹھہرانا ہے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے، وہ اپنے اساتذہ (و مشائخ) کے حقوق کا ضرور خیال رکھیں، اتنا ہی جتنا اللہ اور اس کے رسول نے خیال رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اگر کسی کا استاد مظلوم ہو تو اس کی مدد کرے، اگر ظلم کرے تو اس کی ظلم پر اعانت نہ کرے بلکہ اسے ظلم کرنے سے روکے جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' آپ سے کہا گیا: مظلوم ہو تو ہم اس کی مدد کرتے ہیں لیکن ظالم ہو تو اس کی مدد کیسے ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اسے ظلم کرنے سے روکو یہی اس کی مدد ہے۔''[1]

باقی یہ کہنا کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیرو مرشد شیطان ہے تو یہ بات اس شخص کے لیے تو درست ہے جس نے نبی ﷺ کی اطاعت کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا ہو لیکن وہ شخص جو صرف اپنی نسبت اللہ کے رسول ﷺ اور ان کی حدیث کی طرف کرتا ہو، اسے شیطان کی طرف منسوب کرنا، اپنے ایمان کو ضائع کرنا ہے۔ ما أنا علیه

[1] صحیح البخاري، الإکراه، حدیث: 6952.

وأصحابي (جس طریقے پر میں (محمد مصطفیٰ ﷺ) اور میرے صحابہ قائم ہیں۔) کا تقاضا یہی ہے کہ ہر اس عمل سے اجتناب کیا جائے جس پر مہر نبوت ثبت نہ ہو اور جسے صحابہ کرام نے کیا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ تمام کلمہ گو حضرات کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے عہد کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین!

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

حدودِ حرم

سوال حدود حرم کا حدود اربعہ کیا ہے؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ حرم کے حدود سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعین کیے تھے اور حرم کے چاروں طرف ان مقامات پر نشان لگا دیے تھے کہ جہاں حرم کی حدود ختم ہوتی ہیں، عموماً ان مقامات کی نشاندہی ان پتھروں سے ہوتی تھی کہ جنھیں اس مقصد کے لیے حد حرم پر گاڑ دیا جاتا ہے، انھیں انصاب کہا جاتا ہے۔

ابن حجر ہیتمی مکی رحمہ اللہ نے شرح مناسک الایضاح میں یہ تین اشعار درج کیے ہیں جن میں حدود حرم کا مجمل بیان آ گیا ہے:

وَلِلْحَرَمِ التَّحْدِيدُ مِنْ أَرْضِ طَيْبَةٍ ثَلَاثَةُ أَمْيَالٍ إِذَا رُمْتَ إِتْقَانَهُ

بجانب مدینہ حرم کی حدود تین میل پر ہیں، اگر تم صحت کے ساتھ جاننا چاہتے ہو۔

وَسَبْعَةُ أَمْيَالٍ عِرَاقٌ وَطَائِفٌ وَجُدَّةُ عَشْرٌ ثُمَّ تِسْعٌ جِعِرَّانَةٌ

عراق اور طائف کے راستے پر سات میل کے فاصلے پر اور جدہ کے راستے پر دس

میل کے فاصلے پر اور جعرانہ والے راستے پر نو میل کے فاصلے پر اس کی حدود ہیں۔

وَمِنْ يَمَنٍ سَبْعٌ بِتَقْدِيمِ سِينِهَا   وَقَدْ كَمُلَتْ فَاشْكُرْ لِرَبِّكَ إِحْسَانَهُ

اور یمن کے راستے پر سات میل کے فاصلے پر (سبع جو حرف 'س' سے شروع ہوتا ہے) اور یہ مکمل بیان ہوگیا تو اپنے رب کے احسان کا شکریہ ادا کر۔ [1]

تقی الدین فاسی نے اپنی کتاب شفاء الغرام میں مشہور مصنف ازرقی کی کتاب "اخبار مکہ" سے حرم کے نشانات کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ یہ نشانات چھ جہت میں ہیں:

① مدینہ کی جہت میں مقام تنعیم کے قریب ذات الحنظل نامی پہاڑی سے پہلے کا علاقہ حدود حرم میں داخل ہے۔

② جدہ کے راستے میں مقام حدیبیہ پر۔

③ یمن کے راستے میں مقام اضاءۃ لبن کے قریب جبل غراب پر۔

④ عرفات اور طائف کے راستے میں ذات السلم کے قریب ابن کریز کی گھاٹی پر۔

⑤ نجد اور عراق کے راستے میں بمقام مقطع یا الصفاح، الخلّ کی گھاٹی پر۔

⑥ جعرانہ کے راستے میں المستوفرہ کے مقام پر۔

ان تمام مقامات پر پہلے سے نشانات موجود ہیں اور موجودہ زمانے میں امام حرم مکی شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کی زیر نگرانی ایک کمیٹی نے نہ صرف ان نشانات کی تجدید کی ہے بلکہ بعض جگہوں پر نئے نشانات بھی نصب کر دیے ہیں۔

(ان معلومات کے لیے میں برادر عزیز ڈاکٹر وصی اللہ عباس کا شکر گزار ہوں کہ جن کی کتاب "المسجد الحرام، تاریخه و أحكامه" سے استفادہ کیا۔)

[1] سبل الهدى والرشاد: 1/201

حجر اسود کی اہمیت اور فضیلت کی بابت استفسارات

سوال نیپال سے عبدالعزیز بن عبدالرزاق مدنی سوال کرتے ہیں:

① حضرت آدم علیہ السلام صرف حجر اسود ہی کو کیوں جنت سے لائے تھے؟

② اس کی کیا وجہ ہوئی کہ یہ پتھر لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے کالا ہوگیا؟

③ اسے کعبہ میں کیوں رکھا گیا، کیا صرف اس لیے کہ طواف کے لیے ایک نشانی کا کام دے سکے یا صرف اس لیے کہ اسے چھوا جائے یا بوسہ دیا جائے؟

ہم حجر اسود کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول معلوم ہے:

''تم صرف ایک پتھر ہو، جو نفع دے سکتا ہے نہ نقصان، میں تمھیں اس لیے چومتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمھیں چومتے دیکھا ہے۔''[1]

ایک ہندو معاشرے میں جہاں پتھروں کو پوجا جاتا ہے ہمیں حجر اسود کی حقیقت جاننے کا شدید احساس ہے۔ میں آج کل نیپالی زبان میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں لیکن حجر اسود کے بارے میں الجھن کا شکار ہوں، برائے مہربانی وضاحت کریں۔

جواب حجر اسود کی فضیلت کے بارے میں امام ابوعبداللہ محمد بن اسحاق الفاکہی نے اپنی کتاب اخبار مکہ میں چونتیس احادیث ذکر کی ہیں، کتاب کے محقق ڈاکٹر عبدالمالک بن عبداللہ بن دھیش کی تحقیق کے مطابق ان میں سے صرف آٹھ احادیث صحیح یا حسن کے درجے تک پہنچتی ہیں، ان میں سے چند احادیث ہم یہاں درج کرتے ہیں:

[1] صحيح البخاري، الحج، حديث: 1597، وصحيح مسلم، الحج، حديث: 1270.

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حجرا سود جنت میں سے ہے اور وہ برف سے زیادہ سفید تھا یہاں تک کہ اہل شرک کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔''[1]

② عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ پتھر نازل ہوا تو چاندی سے زیادہ سفید تھا اور اگر اسے جاہلیت کی پلیدگی نہ لگی ہوتی تو ہر جسمانی عیب والا شخص اسے چھوتے ہی شفایاب ہو جاتا۔[2]

③ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: یہ رکن (یعنی حجرا سود) زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے، جس سے کہ وہ اپنے بندوں سے ایسے مصافحہ کرتا ہے جیسے ایک آدمی اپنے بھائی سے۔[3]

④ اسماعیل بن عبدالرحمن السدی (الکبیر) کہتے ہیں: آدم علیہ السلام ہندوستان میں نازل ہوئے اور ان کے ساتھ حجرا سود کو اتارا گیا اور جنت کے پتوں میں سے ایک گچھا بھی۔ انھوں نے ان پتوں کو ہندوستان میں پھیلا دیا جس سے خوشبو کا پودا اگ آیا۔ ہندوستان سے در آمد خوشبو کی اصلیت یہی پودا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے یہ گچھا جنت سے نکالے جاتے وقت عالم افسوس میں اپنے ساتھ لے لیا تھا۔[4]

⑤ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جبرائیل علیہ السلام جنت سے حجرا سود کو لے کر نازل ہوئے اور وہاں رکھا جہاں تم اسے دیکھتے ہو۔ جب تک یہ پتھر تم میں موجود ہے تم

[1] صحیح ابن خزیمة: 4/219، ومسند أحمد: 1/307,329,373، دیکھیے: الصحیحة: 6/230، حدیث: 2618. [2] أخبار مکة للأزرقي: 1/256، وأخبار مکة للفاکهي: 1/17. [3] أخبار مکة للأزرقي: 1/257، وأخبار مکة للفاکهي: 1/18. [4] أخبار مکة للفاکهي: 1/90. اخبار مکہ کے محقق ڈاکٹر عبدالملک بن عبداللہ دہیش نے اس کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔

لوگ بخیریت رہو گے، اس لیے جہاں تک ہو سکے اس سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ ایک وقت آئے گا کہ جہاں سے یہ پتھر آیا ہے وہیں واپس چلا جائے گا۔ [1]

⑥ خیثمہ بن عبدالرحمن جعفی کہتے ہیں: حجر جب جنت سے نازل ہوا تھا تو برف سے زیادہ سفید تھا اگر بنی آدم کے گناہوں نے اسے نہ چھوا ہوتا تو کوئی بھی اندھا، برص والا یا کوڑھی اسے چھوتا تو شفایاب ہو جاتا۔ [2]

ان احادیث اور آثار سے یہ فوائد اخذ کیے جا سکتے ہیں:

کعبہ کی ساری عمارت دنیا کے پتھروں سے بنی ہے۔ صرف ان میں ایک پتھر ایسا ہے جس کی نسبت جنت کی طرف ہے، اس لیے اگر مسلمان اس پتھر کو بوسہ دیتے ہیں تو جنت کی اس نسبت کی بنا پر دیتے ہیں نہ کہ کسی دنیوی پتھر کو۔

جنت کا ہر شخص مشتاق ہے اور اگر اس دنیا میں جنت کی ایک چیز لا کر رکھ دی گئی ہے تو مشتاقان دید کا اسے چھونا اور بوسہ دینا ایک فطرتی امر ہے۔

خانہ کعبہ کو سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ بیہقی کی ایک روایت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے [3] اور صحیحین کی یہ حدیث اس بات پر واضح طریق سے دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! کون سی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسجد حرام۔'' انھوں نے پوچھا: اور پھر؟ آپ نے فرمایا: ''مسجد اقصیٰ۔'' انھوں نے پوچھا: دونوں میں کتنا

[1] أخبار مكة للأزرقي: 40/1، 258، 274، وأخبار مكة للفاكهي: 91/1، یہ اثر صحیح ہے۔
[2] أخبار مكة للفاكهي: 94/1، ڈاکٹر دہیش نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ [3] دلائل النبوة للبيهقي: 424/1، وتاريخ دمشق: 321/2.

وقفہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''چالیس سال۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اور پھر؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر جہاں کہیں تمھیں نماز کا وقت آ جائے تو نماز پڑھ لو، اس لیے کہ ہر جگہ مسجد ہے۔'' [1]

واضح رہے کہ دونوں مساجد کی تعمیر میں چالیس سال کا وقفہ اس طرح ہو سکتا ہے جبکہ حضرت آدم علیہ السلام نے دونوں کی تعمیر کی ہو کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کو بنیادوں سے اٹھایا تھا، یعنی بنیادیں موجود تھیں، باقی عمارت منہدم ہو چکی تھی۔ اور پھر حضرت داود علیہ السلام کے آخر زمانے میں ہیکل کی تعمیر شروع ہوئی، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اس لیے ہیکل سلیمانی کہلائی اور قرآن نے اسے مسجد اقصیٰ سے تعبیر کیا ہے۔

خانہ کعبہ کی عمارت میں جنت کے ایک پتھر کا لگنا اسے ایک ندرت عطا کرتا ہے اور اسی لیے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس پتھر کو اتارا گیا ہوگا۔

جہاں تک حجر اسود کے سیاہ ہو جانے کا سوال ہے تو ذہن اس حدیث کی طرف جاتا ہے جس میں اللہ کے رسول ﷺ نے دل کی مثال دی ہے کہ گناہ کرنے پر دل میں ایک سیاہ دھبا لگ جاتا ہے اور پھر گناہوں کی کثرت سے دل سارے کا سارا سیاہ ہو جاتا ہے۔ [2] گویا حجر اسود پر لوگوں کے گناہوں کا انعکاس ہوا ہے۔ قاعدہ ہے کہ آئینہ ابتدا میں صاف و شفاف ہوتا ہے لیکن مدت کے بعد دھندلا ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس میں کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔

[1] صحیح البخاري، أحادیث الأنبیاء، حدیث: 3366، وصحیح مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، حدیث: 520۔ [2] سنن ابن ماجہ، الزھد، حدیث: 4244، ومسند أحمد: 297/2

خانہ کعبہ کے جس کونے میں حجر اسود کو رکھا گیا ہے وہ طواف کی ابتداء کرنے کی علامت بنا دیا گیا ہے، گویا حجر اسود کی خاص حیثیت کی بنا پر اسے یہ اعزاز دیا گیا جو کہ کعبہ کے کسی دوسرے کونے کو حاصل نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسے ہاتھ لگانا یا چومنا سنت کی بنیاد پر ہے نہ کہ پتھر کی عبادت یا اس سے نفع ونقصان کی توقع رکھنا۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ میں لکھتے ہیں: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حجر اسود جنت سے نازل ہوا، وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے کالا کر دیا۔''[1] اور یہ بھی فرمایا: ''اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس طرح لائیں گے کہ اس کی دو آنکھیں ہوں گی جس سے وہ دیکھے گا اور ایک زبان ہوگی جس سے وہ بات کرے گا اور ہر اس شخص کے لیے گواہی دے گا جس نے حق کے ساتھ اسے چھوا ہوگا۔''[2] اور کہا: ''رکن (حجر اسود) اور مقام (وہ پتھر جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کی تھی) دونوں یاقوت ہیں۔''[3] پھر شاہ ولی اللہ کہتے ہیں: اس بات کا احتمال ہے کہ یہ دونوں پتھر اصل میں جنت سے ہوں لیکن جب انھیں دنیا میں لایا گیا تو حکمت اس بات کی متقضی ہوئی کہ ان میں زمینی اوصاف رکھے جائیں اور اس لیے ان کے نور کو مٹا دیا گیا۔[4]

مولانا عبدالسلام بستوی لکھتے ہیں: ''حجر اسود ایک تاریخی پتھر ہے، جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مبارک اجسام سے مس ہونے کا شرف حاصل

[1] جامع الترمذي، الحج، حديث:877. [2] سنن ابن ماجه، المناسك، حديث:2944، ومسند أحمد:371/1. [3] جامع الترمذي، الحج، حديث:878، ومسند أحمد:213/2. [4] حجة الله البالغة، ص:556.

ہے۔ یہ پتھر کعبہ مقدس کے ایک کونے میں نصب ہے۔ اسی جگہ سے طواف شروع کیا جاتا ہے اور یہاں پر ہی آ کر ایک چکر پورا ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس کو چوما اور ہاتھ لگایا جاتا ہے تاکہ طوافوں کے گننے میں آسانی ہو اور تاریخی عظمت کا احترام بھی ہو سکے۔ عہد ابراہیمی میں عہد و پیمان لینے کے لیے ایک پتھر رکھ دیا جاتا تھا، جس پر لوگ آ آ کر ہاتھ رکھتے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس عہد کے لیے وہ پتھر رکھا گیا ہے اس کو امتوں نے تسلیم کر لیا۔ اسی دستور کے مطابق حضرت خلیل علیہ السلام نے اپنی مقتدی قوموں کے لیے یہ پتھر نصب کیا، جو کوئی اس گھر میں جس کی بنیاد خدائے واحد کی عبادت کے لیے رکھی گئی ہے، داخل ہو، اس پتھر پر ہاتھ رکھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے توحید کا عہد مضبوط کر لیا، وہ موحد ہو کر رہے گا۔ اگر جان بھی دینی پڑے اس سے منحرف نہ ہوگا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: مسئلے کی تحقیق کے لیے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان کعبہ اور حجرِ اسود کی طرف منہ کر کے کیا کہتے ہیں اور کیا پڑھتے ہیں۔ بت پرست اپنی حاجات اور پرارتھنا ان بتوں سے کرتے ہیں اور مسلمان کہتے ہیں: سبحان اللہ والحمد للہ. خدا کے نام کی پاکی بیان کرتے ہیں، پس ان دونوں میں فرق نمایاں ہے۔ اگر مسلمان بھی کعبہ اور حجرِ اسود کی عبادت کرتے تو ساری نماز میں کوئی لفظ تو کعبہ کو مخاطب کر کے کہتے: اے کعبہ! تو ہماری مدد کر، حالانکہ بت پرست بتوں سے پرارتھنا اور عجز و نیاز کرتے ہیں۔"[1]

[1] فتاوی ثنائیہ: 1/798.

آیت ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ اور مرتد کو قتل کرنے کے حکم کے مابین تعارض کا حل

لندن سے ابوعبداللہ بذریعہ ای میل مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات چاہتے ہیں۔ جو افادہ عامہ کی خاطر زیب قرطاس ہیں۔

سوال ایک طرف تو قرآن میں ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (دین میں جبر نہیں)[1] کہا گیا اور دوسری طرف مرتد کے لیے قتل کی سزا تجویز کی گئی ہے، کیا دونوں میں تعارض نہیں؟

جواب جبر نہ کرنے کا تعلق دین میں داخل ہونے سے ہے اور سزا کا تعلق دین سے خارج ہونے سے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جا سکتا لیکن اسلام میں داخل ہونا ایک فوج میں منسلک ہونے کے مترادف ہے۔ جس طرح ایک فوجی کی زندگی قواعد اور ڈسپلن کی پابند ہوتی ہے اُسی طرح ایک مسلمان کی نہ صرف روزمرہ زندگی بلکہ تمام لائف سٹائل کچھ ضوابط اور قوانین سے گھرا ہوتا ہے اور جس طرح فوج میں داخل ہونے والے سپاہی سے ملک سے وفاداری کا عہد لیا جاتا ہے اُسی طرح کلمہ توحید پڑھ کر مسلمان ہونے والا شخص بھی اللہ سے ایک عہد کرتا ہے جس کی پاسداری اس پر لازم ہے۔ اور جیسے ایک فوجی اگر اپنے کمانڈر کی حکم عدولی کرتا ہے تو اُس کا کورٹ مارشل کیا جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلم اگر اس دین کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرتا ہے تو اُس کا بھی محاکمہ کیا جاتا ہے۔ اُسے مناسب وقت دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔ اُس کے لیے بحالتِ اسلام جنت کی بشارت

[1] البقرة 2:256.

دی جا رہی ہے اور بحالتِ کفر جہنم کی، پھر بھی وہ اگر جہنم کی راہ ہی اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر اُسے جہنم واصل کر دیا جاتا ہے۔

اس سزا کا ذکر نہ صرف حدیث میں بلکہ قرآن میں بھی ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۝﴾

''اور اگر وہ عہد کرنے کے بعد اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیں اور تمھارے دین پر طعنہ زنی کریں تو کفر کے ان لیڈروں سے قتال کرو، ان لوگوں کا کوئی عہد نہیں رہا، شاید کہ وہ باز آجائیں۔''[1]

اور ارشادِ نبوی ہے:

«مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ» ''جو اپنے دین کو بدل دے اُسے قتل کر ڈالو۔''[2]

یعنی آیت میں اجتماعی ارتداد کا ذکر ہے کہ جس پر قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں ہر وہ فرد آجاتا ہے جو مرتد ہو جائے۔

دورِ نبوی میں لکھا جانے والا قرآنی نسخہ کہاں ہے؟

سوال ظہیر علی اپنے ای میل میں لکھتے ہیں:

یہ بات تو معلوم ہے کہ قرآن مجید کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم پر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کا وہ مسودہ جو دورِ نبوت میں کپڑے، ہڈیوں اور دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا، کیا وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں محفوظ کر لیا گیا تھا؟ جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نزولِ وحی کے بعد کسی ایک کاتب کو بلا

[1] التوبة 9:12۔ [2] صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 3017.

کر نازل شدہ آیات لکھوا دیا کرتے تھے اور پھر اُن سے سُن بھی لیا کرتے تھے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ تو پھر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کاتبینِ وحی جس چیز پر وحی لکھا کرتے تھے وہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے؟

جواب میں اپنے علم کی حد تک آپ کے سوال کا قطعی جواب تو نہیں دے سکتا لیکن مصری مصنف ابراہیم الأبیاری کی کتاب تاریخ القرآن کے حوالے سے کچھ عرض کرتا ہوں۔

وہ تمام مواد جس پر قرآن کی چند آیات یا مکمل سورت لکھی جاتی تھی، مختلف کاتبین وحی کے پاس تھا اور دورِ صدیقی میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مصحف تیار کرنے میں انھیں استعمال کیا تھا۔ ان میں وہ چار مصحف بھی شامل تھے جو حضرت علی، حضرت أبی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سورتوں کی تعداد یا ترتیب کے بارے میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں سورۂ فاتحہ اور آخری دو سورتیں (معوذتین) درج نہیں تھیں۔

مصحف علی سات حصوں میں تقسیم تھا۔ ہر حصے میں سورتوں کی ترتیب مصحف کی موجودہ ترتیب سے مختلف تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مکمل مصحف (جسے مصحف الامّ کہا گیا) تیار کرنے کے بعد یہ سارا مواد اُن کے اصل مالکوں کو لوٹا دیا تھا۔ وہ اس لیے کہ ابن الندیم نے ''الفہرست'' میں اُن چند لوگوں کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے ان چار مصاحف کو مذکورہ صحابہ کی نسل میں سے چند خاندانوں میں دیکھا ہے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے ایک خاندان مصحف علی کا امین تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں مصحف الامّ کی بنیاد پر مزید سات نسخے تیار کیے گئے تھے جن میں ''سات

حروف" والی حدیث کی بنیاد پر قرآن کریم کو سات قراءتوں کے مطابق پڑھنے میں کج فہمی کی بنا پر پیدا ہونے والے اختلاف کو بخوبی ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ سات نسخے بشمول مدینہ منورہ، سات شہروں میں بھیجے گئے تھے۔ گو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے باقی دوسرے مصاحف کو جلا دیا تھا تا کہ کسی قسم کا اشتباہ پیدا نہ ہوسکے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ پھر بھی کئی صحابہ سے منسوب چند نسخے نسل در نسل منتقل ہوتے رہے تھے، جن میں ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے صحابہ سے منسوب مصاحف شامل ہیں۔ اختلاف مصاحف کے موضوع پر مشتمل بہت سی کتابیں انہی مصاحف کی روشنی میں تحریر کی گئیں، جن میں سے ایک عبداللہ بن ابو داود کی کتاب المصاحف ہے، جو بہت سارے مستشرقین کے لیے قرآن کی آیات میں اختلاف ظاہر کرنے کی غرض سے بنیاد بنی رہی ہے۔ [1]

خیال رہے کہ مصحف عائشہ کے نام سے کسی مصحف کا وجود نہ تھا۔ [2] جو نسخہ زید بن

[1] عبداللہ بن ابو داود کی ثقاہت محل نظر ہے جس کی بنا پر بعض محققین نے کتاب المصاحف کو معتبر قرار نہیں دیا۔ اگر ابن ابو داود کی ثقاہت تسلیم کر بھی لی جائے تب بھی ان کی یہ کتاب ایسی نہیں کہ اس پر آنکھ بند کر کے یقین کیا جا سکے کیونکہ اس میں موضوع اور ضعیف روایات بھی پائی جاتی ہیں۔ مستشرقین نے جن روایات سے آیات قرآنیہ میں صحابہ کے مابین پائے جانے والے اختلاف کو ثابت کرنے کی کوشش کی یہ موضوع اور ضعیف روایات ہی کی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ (ناصر) [2] ڈاکٹر صاحب سے یہاں تسامح ہوا ہے۔ مصحف عائشہ کے نام سے ایک مصحف کا وجود رہا ہے جس کا تذکرہ بعض صحیح روایات میں موجود ہے۔ دیکھیے: (مسند إسحاق بن راهويه: 1042/3، و مصنف عبدالرزاق: 578/1، تفسیر طبري: 175/5، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے اس مصحف کو ان کے غلام ابو یونس رحمہ اللہ نے کتابت کیا تھا۔ دیکھیے: (صحيح مسلم، المساجد، باب الدليل لمن قال: الصلاة الوسطىٰ هي صلاة العصر، حديث: 629) ہاں! اگر ڈاکٹر صاحب کے اس کلام سے مراد یہ ہو کہ دور نبوت میں رسول اللہ ﷺ کی نگرانی میں لکھا جانے والا مصحف عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس نہیں تھا تو یہ بات صحیح ہے۔ (ناصر)

ثابت نے (دور صدیقی میں) تیار کیا تھا وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں رہا۔ اموی خلیفہ مروان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور حکومت میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے اس نسخے کی تحویل کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد ہی مروان رضی اللہ عنہ اس نسخے کو لینے میں کامیاب ہوا۔

محفل میلاد میں شرکت کرنا

سوال برائے مہربانی اس بات کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں کریں کہ کیا میلاد کی محفل میں شرکت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر اس بات کی اجازت ہے تو کس صورت میں ایسی محفل میں شرکت کی اجازت ہے؟ (حبیب الرحمٰن، بریڈفورڈ)

جواب لاریب کہ عید میلاد النبی ﷺ منانا بدعت ہے اور مروجہ عید میلاد النبی کے جلسے، جلوس یا محفل میں شرکت کرنا ایک بدعت کو تقویت دینا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»

''ہمارے اس کام میں جو شخص کوئی نئی چیز ایجاد کرتا ہے جو اس میں نہیں تھی، وہ مردود ہے۔''[1]

(بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا) آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»

''جو شخص کوئی بھی ایسا عمل کرے جو ہمارے اس کام سے موافقت نہ کرتا ہو تو

[1] صحيح البخاري، الصلح، حديث: 2697، وصحيح مسلم، الأقضية، حديث: 1718.

وہ مردود ہے۔" [1]

(بروایت انس رضی اللہ عنہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

«كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ»

"ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔" [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

① نئی چیز سے مراد دین سے متعلق نئی چیز ہے، نہ کہ دنیوی اعتبار سے، اس لیے کار، جہاز وغیرہ کی سواری کو بدعت نہیں کہا جائے گا۔

② نئی چیز کا ایجاد کرنے والا ہو یا اس پر عمل کرنے والا، دونوں کا عمل رد کرنے کے لائق ہے۔

③ بدعت کسی لحاظ سے بھی مستحسن نہیں ہوسکتی بلکہ وہ موجب نار ہی کہلائے گی۔

امام شاطبی نے بدعت کی تعریف یوں بیان کی ہے:

«طَرِيقَةٌ فِي الدِّينِ مُخْتَرَعَةٌ تُضَاهِي الشَّرْعِيَّةَ يُقْصَدُ بِالسُّلُوكِ عَلَيْهَا الْمُبَالَغَةُ فِي التَّعَبُّدِ لِلّٰهِ سُبْحَانَهُ»

"دین میں ایک ایسا طریقہ ایجاد کرنا جو شرعی طریقے سے مشابہت رکھتا ہو اور اس پر چلنے سے مقصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ آرائی کی جاسکے۔" [3]

عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس تعریف پر پرکھا جائے تو یہ تعریف اس پر پورے طریقے

[1] صحيح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، معلقًا أما موصولا (7350) فهو في صحيح الأقضية، حديث: 1718. [2] صحيح ابن خزيمة 143/3. [3] الاعتصام 37/1.

سے صادق آتی ہے۔

اولاً: خیر القرون کو تو چھوڑیئے، اسلام کی پہلی چھ صدیوں میں عید میلاد النبی ﷺ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس بدعت کا موجد 604ھ میں عراق کے شہر اربل کا حکمران ابوسعید کوکری تھا جیسا کہ امام سیوطی نے اپنے رسالے ''حسن المقصد في عمل المولد'' میں لکھا ہے۔

ثانیاً: اسے ایک شرعی تہوار (جیسے عید الفطر یا عید الاضحیٰ) سے مشابہت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

ثالثاً: اسے ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے جو اس بدعت کا قائل نہ ہو اس پر نکیر کی جاتی ہے، اسے وہابی کا نام دے کر بدنام کیا جاتا ہے۔

ابن حجر ہیتمی نے بدعت کی تعریف یوں کی ہے:

هِيَ مَا لَمْ يَقُمْ دَلِيلٌ شَرْعِيٌّ عَلٰى أَنَّهُ وَاجِبٌ أَوْمُسْتَحَبٌّ.

''بدعت وہ چیز ہے کہ جس کے وجوب یا استحباب پر کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔''[1]

اب ظاہر ہے شرعی دلیل کتاب و سنت ہی سے لائی جاسکتی ہے اور یہ دونوں اس بدعت کے ذکر سے خالی ہیں۔

بدعت کی تیسری تعریف یہ ہے کہ ہر وہ عمل جو نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہو، نہ خلفائے راشدین ہی کی سنت سے کیونکہ آپ ﷺ فرما گئے ہیں:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ مِنْ بَعْدِي،

[1] الفتاوى الحديثية، ص:200.

"میری سنت کو اور میرے بعد آنے والے ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو لازم پکڑو۔" [1]

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "ہر وہ عبادت جسے صحابہ نے نہ کیا ہو تو اسے نہ کرو۔" [2]

اور جیسے آپ کے فعل کی متابعت کرنا سنت کہلاتا ہے اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس فعل کو چھوڑ دیا کرتے تھے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چھوڑ دیا تھا، الا یہ کہ چھوڑنے کا سبب معلوم ہوگیا ہو جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص جانور (گوہ) کا کھانا چھوڑ دیا تھا، صحابہ کرام نے جب اس کا سبب پوچھا تو آپ نے بتایا کہ یہ میرے وطن میں نہیں پایا جاتا، اس لیے مجھے اس سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ [3]

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ اگر کسی فعل کے کرنے کا جواز نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا اور اس کے کرنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہیں کیا تو اس کا نہ کرنا (اسے چھوڑ دینا) ہی سنت ہوگا جیسا

[1] جامع الترمذي، العلم، حديث: 2676، وسنن ابن ماجه، المقدمة، حديث: 42، ومشكل الآثار للطحاوي: 3/183 واللفظ له۔ [2] متقدمین اور متاخرین بہت سے علماء نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان سنن ابی داود کے حوالے سے لکھا ہے۔ اختصار کی غرض سے متقدمین میں سے صرف امام ابوشامہ مقدسی رحمہ اللہ (م: 665ھ) کا حوالہ دیتا ہوں، انھوں نے اپنی کتاب الباعث علی انکار البدع والحوادث، ص: 16 پر یہ فرمان لکھا ہے۔ اسی طرح متاخرین نے بھی یہ فرمان نقل کیا ہے لیکن موجودہ مطبوع سنن ابی داود میں یہ فرمان موجود نہیں ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ ماضی میں سنن ابی داود کے کسی نسخے میں یہ قول ضرور موجود رہا ہے لیکن وہ مسلمانوں کی شکست وریخت کی نذر ہوگیا ہے اور متقدمین نے اسی نسخے سے یہ قول لیا ہے اور متاخرین نے متقدمین کی نقل میں سنن ابی داود کی طرف اس قول کو منسوب کر دیا ہے۔ (ناصر) [3] صحيح البخاري، الذبائح، حديث: 5537، وصحيح مسلم، الصيد والذبائح، حديث: 1945.

کہ کسی کی ولادت کا دن منانا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں عیسائی حضرت عیسیٰ کا یوم پیدائش منایا کرتے تھے۔ گویا یہ بات اس زمانے میں معروف تھی اور اگر نبی اکرم ﷺ اپنا یا اپنے آباؤ اجداد (حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسماعیل علیہ السلام) کا دن منانا چاہتے تو اس کا جواز موجود تھا اور ایسی کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے آپ ﷺ یہ تہوار منانے سے رک گئے ہوں لیکن اس کے باوجود بھی آپ نے کسی کا یوم ولادت نہیں منایا تو ایسا نہ کرنا ہی سنت ہے۔ اب ایک دو مثالیں اس قاعدہ کے مطابق بھی ملاحظہ فرمائیں:

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کعبہ کی عمارت مکمل طریقہ سے تعمیر شدہ نہیں تھی بلکہ دور جاہلیت میں عربوں نے سیلاب کے بعد جب کعبہ کی عمارت بنائی تو ان کی حلال کمائی کا پیسہ ساری عمارت کی تکمیل کے لیے ناکافی رہا، چنانچہ انھوں نے وہ حصہ چھوڑ دیا جو حطیم کہلاتا ہے اور جہاں تقریباً ڈیڑھ میٹر بلند نیم دائرہ شکل کی دیوار موجود ہے، یعنی نبی کریم ﷺ کے لیے کعبہ کی عمارت کو مکمل کرنے کا جواز incentive موجود تھا لیکن ایک رکاوٹ کی وجہ سے آپ ایسا نہ کرسکے۔ اس رکاوٹ کا بیان آپ ﷺ نے ان الفاظ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے کیا: ''عائشہ! اگر تمھاری قوم (قریش) نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر کھڑا کردیتا اور اس کے دو دروازے بناتا، ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا نکلنے کے لیے۔'' [1]

گویا آپ نے اپنے ارادے کو اس لیے جامۂ عمل نہیں پہنایا کہ اگر وہ ایسا کر بیٹھتے تو قریش کے نئے نئے مسلمان ایک ہنگامہ بپا کردیتے کہ محمد ﷺ نے تو ہر چیز بدل

[1] صحيح البخاري، العلم، حديث: 126، وصحيح مسلم، الحج، حديث: 1333.

ڈالی ہے یہاں تک کہ کعبہ کو بھی بدل ڈالا ہے، چنانچہ کعبہ کی عمارت اسی طرح چلی آئی جس طرح رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھی۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے کعبہ کی تعمیر مکمل کروا دی اور اس کے دو دروازے بھی بنوا دیے، کسی صحابی نے اس عمل کو بدعت قرار نہیں دیا [1] کیونکہ یہ بدعت کی تعریف میں نہیں آتا تھا۔

اب ہوا یہ کہ جب بنو امیہ کی حجاز کی بازیابی کے لیے ابن زبیر سے جنگ ہوئی تو حجاج نے فتح حاصل کرنے کے بعد ابن زبیر کی مخالفت میں کعبہ کو ازسرنو پہلی حالت پر لوٹا دیا۔ [2] ابن زبیر کی تعمیر 64 ھ میں ہوئی اور دس سال بعد حجاج کی تعمیر عمل میں آئی۔

عباسی خلیفہ محمد مہدی بن منصور نے بھی اپنے زمانہ خلافت میں کعبہ کی تکمیل کرنا چاہی لیکن امام مالک نے اسے مصلحتاً اس کام سے روک دیا۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ کعبہ بادشاہوں یا خلفاء کے درمیان ایک کھیل بن کر رہ جائے گا۔ ایک شاہ اسے تعمیر کرے گا اور دوسرا شاہ صرف مخالفت کی بنا پر اسے گرا دے گا، چنانچہ ابن منصور نے امام مالک کی بات مان لی اور اس وقت سے کعبہ اس حالت میں ہے جس حالت میں رسول اللہ ﷺ نے اسے چھوڑا تھا۔

دوسری مثال نماز تراویح کا باجماعت ادا کرنا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں لوگوں کو رمضان کی راتوں میں علیحدہ علیحدہ نماز پڑھتے دیکھا تو انھوں نے حضرت ابی بن کعب کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو جماعت کے ساتھ گیارہ رکعت

[1] صحیح البخاري، العلم، حدیث: 126، وصحیح مسلم، الحج، حدیث: 1333۔ [2] صحیح مسلم، الحج، حدیث: 1333۔

پڑھا دیں۔[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا آپ ﷺ کے زمانہ میں تراویح پڑھنے کا جواز پیدا نہیں ہوا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ تراویح رات کی نماز (قیام اللیل) کا نام ہے، رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ہی رات کی نماز گھر میں ادا کیا کرتے تھے۔ ماہ رمضان میں تین دن آپ نے لوگوں کے ساتھ جماعت کی شکل میں بھی ادا کی لیکن چوتھے دن لوگوں کے اصرار کے باوجود آپ ﷺ اپنے حجرے سے اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کے لیے نہیں آئے۔ جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔''[2]

اس مثال سے بھی معلوم ہوا کہ تراویح باجماعت کا جواز موجود تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے ایک رکاوٹ کی بنا پر اسے تسلسل کے ساتھ ادا نہیں کیا، وہ اس لیے کہ وحی کا نزول جاری تھا اور عین ممکن تھا کہ یہ نماز فرض قرار دے دی جاتی۔

نبیٔ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد یہ رکاوٹ باقی نہ رہی، یعنی اب وحی آنے کا اور تراویح باجماعت فرض ہونے کا اندیشہ باقی نہ رہا، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سنت کو دوبارہ جاری کر دیا۔

بعض دفعہ مصالح مرسلہ اور بدعت گڈ مڈ ہو جاتے ہیں شریعت نے پہلے کا اعتبار کیا ہے لیکن دوسرے کا نہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مصالح مرسلہ کے بارے

[1] صحیح البخاري،حدیث: 2010، وموطأ إمام مالك، الصلاة في رمضان، حدیث: 251،250.

[2] صحیح البخاري، الاعتصام بالكتاب، حدیث: 7290، وصحیح مسلم، صلاة المسافرین، حدیث: 761، ومسند أحمد: 232/6.

میں وضاحت کردی جائے، مصلحت مرسلہ کی تعریف یہ ہے:

أَنْ يُنَاطَ الْأَمْرُ بِاعْتِبَارِ مُنَاسِبٍ لَمْ يَدُلَّ الشَّارِعُ عَلَى اعْتِبَارِهِ وَلَا إِلْغَاءِهِ إِلَّا أَنَّهُ مُلَائِمٌ لِتَصَرُّفَاتِ الشَّارِعِ.

''کسی ایک کام کے لیے ایسی بات کا لحاظ رکھا جائے جس کا شارع (شریعت دینے والے) نے نہ اعتبار ہی کیا ہے اور نہ اسے غلط ہی قرار دیا ہے مگر یہ بات شارع کے تصرفات سے مناسبت رکھتی ہے۔''[1]

اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے میں قرآن کو ایک مجلد میں جمع نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا۔[2] یہاں پر حفظِ قرآن کا لحاظ رکھا گیا کیونکہ آپ ﷺ نے خود اپنی زندگی میں حفظ قرآن پر زور دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کیا کہ اگر ایک آدمی کے قتل میں پوری ایک جماعت بھی شریک ہو تو ساری جماعت کا قتل کیا جائے گا۔[3] یہاں پر حفاظتِ جان کا لحاظ رکھا گیا، جس کا قرآن میں صراحتاً ذکر ہے۔

خلفائے راشدین نے کاریگروں کو ضامن ٹھہرایا، اگر وہ لوگوں کی دی ہوئی چیزوں کو بناتے وقت ضائع کردیں، یعنی درزی کو سینے کے لیے کپڑا دیا گیا تو اس نے اتنی کانٹ چھانٹ کی کہ کپڑا ہی ضائع ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں عمومی

[1] موسوعة فقه العبادات از علي بن نايف الشحود، باب صلاة التراويح. [2] صحيح البخاري، فضائل القرآن، حديث: 4986. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 347/9، وموطأ إمام مالك، الديات، حديث: 670.

بھلائی کو ایک آدمی کی بھلائی پر ترجیح دی۔●

اس طرح اگر بیت المال میں پیسہ نہ رہے تو حکومت دولت مند حضرات پر سرحدوں کی حفاظت کے لیے ٹیکس عائد کر سکتی ہے۔ یہاں ملک کی حفاظت کا پہلو پیش پیش ہے۔

مصلحت اور بدعت میں فرق یہ ہے کہ مصلحت کسی ضروری امر کی حفاظت کے لیے یا دین میں کسی شدید مشکل کے ازالے کے لیے ہوتی ہے اور اس کا تعلق عموماً وسائل سے ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کار معقولات (جسے عقل پرکھ سکتی ہے) تک محدود ہے۔ برخلاف بدعت کے کہ نہ وہ کسی ضروری امر کی حفاظت ہی کے لیے ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مشکل کا ازالہ ہی کرتی ہے۔ اس کا تعلق بھی مقاصد سے ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کار عبادات تک محدود ہوتا ہے کہ جس کا راز صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

عید میلاد النبی ﷺ کو اس معیار پر پرکھ لیں، تب بھی وہ بدعت ہی کے دائرے میں داخل ہوگی نہ کہ مصلحت کے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتا چلوں جس کے بارے میں مجھ سے زبانی طور پر تو پوچھا گیا ہے، گو متذکرہ سوال میں اس کا تذکرہ نہیں اور وہ یہ کہ اس سال 15 مئی (14 ربیع الاول 1424ھ) کو کنزرویٹو پارٹی کے زیر سایہ ایک میلاد فنکشن میں راقم الحروف نے کیوں شرکت کی؟ واضح رہے کہ یہ غلط فہمی ''دی مسلم'' ہفتہ وار اخبار کی ایک خبر کی اشاعت سے پیدا ہوئی۔

اس تقریب کا پس منظر یہ ہے کہ مجھے کنزرویٹو پارٹی کے ہیڈ آفس (لندن) سے 22 اپریل کا تحریر کردہ ایک دعوت نامہ موصول ہوا، جس کا پہلا فقرہ یہ تھا: ''میلاد النبی کے موقع پر نبی محمد (ﷺ) کی انسانیت کے لیے کی گئی کوششوں کو خراج تحسین پیش

● مصنف عبدالرزاق: 8/217 یہ روایت باطل ہے۔ اور شدید ضعیف بلکہ موضوع ہے کیونکہ اس کی سند میں یحییٰ بن علاء نامی راوی کذاب ہے، نیز محمد باقر کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (ناصر)

کرنے کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا جا رہا ہے، جس میں آپ کی شرکت ہمارے لیے باعث مسرت ہوگی۔'' جگہ اور مقام کے تعین کے بعد لکھا ہے: ''کنزرویٹو پارٹی کے سرکردہ قائدین سے ملاقات کا یہ ایک بہترین موقع ہوگا۔'' (ترجمہ از انگریزی)

مجھے اس سے قبل لیبر پارٹی کی جانب سے منعقدہ عید ملن پارٹیوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے جو پارلیمنٹ کے ایک گوشے میں ہوتی رہی ہیں۔ ان پارٹیوں کا سارا پروگرام چند مختصر تقاریر تک محدود رہا ہے، جس میں چند مسلمانوں کے نمائندے اور کچھ لیبر پارٹی کے سرکردہ قائدین بشمول وزیر اعظم شامل رہے ہیں۔ کھانا صرف چائے اور اس کے لوازمات سے آگے نہیں بڑھا ہے۔

مذکورہ دعوت نامہ ملنے کے بعد میرا ذہنی تاثر یہی تھا کہ لیبر پارٹی کی طرح کنزرویٹو پارٹی بھی سیاسی سطح پر مسلمانوں کو قریب کرنا چاہتی ہے، اس لیے اس نے میلاد النبی کی مناسبت سے یہ ایک سیاسی تقریب کر ڈالی ہے، جس کا نہ عید میلاد النبی ہی سے کوئی تعلق ہے (خط میں ''عید'' کا ذکر نہیں ہے) اور نہ کسی بدعت کا احیاء مقصود ہی ہے کہ ابھی تک کنزرویٹو پارٹی مشرف بہ اسلام نہیں ہوئی۔ اس تقریب میں جو کہ پارٹی کے ہیڈ کوارٹر میں ہوئی، اس تاثر کو مزید تقویت ملی۔

عام انگریزی تقریبات کی طرح اکثر لوگ سارا وقت کھڑے رہے۔ دیوار کے ساتھ چند کرسیاں نظر آئیں، جن پر علماء کا قبضہ رہا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد چند مختصر تقاریر ہوئیں بلکہ ایک موقع پر منتظم نے اعلان بھی کیا کہ پارلیمنٹ میں کسی ایک خاص موضوع پر رائے شماری ہو رہی ہے، اس لیے ہم ممبران حضرات چند لمحوں کے لیے اس تقریب سے غیر حاضر رہیں گے اور رائے شماری کے فوراً بعد واپس آ جائیں گے۔

تقریر کرنے والوں میں ایم سی بی کے سیکرٹری اقبال سکرانی اور کنزرویٹو پارٹی کے لیڈر ڈنکن سمتھ شامل تھے۔ حاضرین کی تواضع حسب معمول چائے اور اس کے لوازمات سے کی گئی اور تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

بر سبیل تفنن عرض ہے کہ میں جونہی ہال میں داخل ہوا تو یو ایم او کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر عزیز پاشا سے ملاقات ہوئی۔ ان کے پہلو میں جناب شاہد رضا بھی کھڑے تھے، چونکہ ڈاکٹر صاحب ہر سال عید میلاد النبی کے نام سے ایک تقریب منعقد کرتے ہیں اور مجھے بھی دعوت دیتے ہیں اور میں کبھی اس دعوت میں شریک نہیں ہوا، اس لیے ان کا مجھے دیکھتے ہی نعرہ مارنا کہ تم یہاں کیسے؟ بالکل قدرتی تھا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے انھیں جواب دیا کہ یہ وہ میلاد تو نہیں ہے جس میں مروجہ میلاد کے لوازمات (قراءت بردہ شریف، کھڑے ہو کر سلام پڑھنا، شیرینی کی تقسیم، قوالی، رسول اللہ ﷺ کی حاضری کا عقیدہ رکھنا وغیرہ وغیرہ) پائے جاتے ہوں بلکہ یہ تو وہابی جلسہ سیرت سے زیادہ مشابہ ہے۔

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ نہ صرف میں بلکہ متعدد دیوبندی علماء بھی اس محفل میں شریک ہوئے۔ خیال رہے کہ بربنائے حدیث (إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)[●] اور فقہی قاعدہ کلیہ (الْأُمُورُ بِمَقَاصِدِهَا) ہر کام کے جواز یا عدم جواز میں اس کام کا مقصود نظر سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ پانی کی بوتل پر شراب کا لیبل لگانے سے وہ شراب میں تبدیل نہیں ہو جاتی اور نہ شراب کی بوتل پر پانی کا لیبل ہی اسے طاہر و مطہر بنا دیتا ہے۔

کنزرویٹو پارٹی کا اس تقریب کے انعقاد سے مقصد ان کے خط سے ظاہر ہے جس

● صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث: 1، و صحيح مسلم، الإمارة، حديث: 1907.

کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے اور راقم الحروف کی شرکت پر آمادگی کا پس منظر بھی بیان ہو چکا ہے، اس لیے اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہنی چاہیے۔

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی تقریبات سے عمائدین اسلام کو اس لیے اجتناب کرنا چاہیے تاکہ پریس انھیں ان کی کردار کشی کے لیے استعمال نہ کر سکے تو اس کی گنجائش موجود ہے۔

میری محبان سنت سے گزارش ہے کہ ایسی تقریبات میں شرکت کے مصالح اور مفاسد کا اندازہ کر لیا جائے اور اگر مصالح کا پہلو غالب ہو تو پھر شرکت کی جائے ورنہ احتراز کیا جائے۔ واللہ أعلم.

میت کے لیے قرآن خوانی کا حکم

سوال کسی کے انتقال کے بعد میت کے اقرباء واحباب قرآن خوانی شروع کر دیتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس تلاوت سے میت کو ثواب پہنچتا ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر تلاوت قرآن میں مصروف نہ ہوں تو لوگ مختلف سیاسی اور دنیاوی بے کار گپ شپ میں مصروف ہو جاتے ہیں، کیا اس سے بہتر نہیں کہ تلاوت قرآن اور ذکر واذکار میں مصروف ہوں؟ اگر میت کو ان چیزوں کا ثواب نہیں پہنچتا تو کیا پڑھنے والے بھی اس کے اجر وثواب سے محروم ہوں گے؟ اگر قرآن خوانی اور ذکر واذکار نہ کیے جائیں تو کیا پڑھا جائے اور کیسے وقت کو کار آمد بنایا جائے جبکہ یہاں میت کے حصول اور تدفین تک بسا اوقات کئی دن ہو جاتے ہیں؟

جواب اس مسئلہ میں اصولی بات کا تذکرہ تو قرآن میں آ گیا ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾

"اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے خود کوشش کی۔"

اس آیت کا مطلب واضح ہے کہ انسان اپنے اعمال کا چونکہ خود مالک ہے، اس لیے قیامت کے دن وہ اس کے کام آئیں گے لیکن اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ وہ کسی دوسرے کے عمل سے فائدہ بھی حاصل کر سکے، بالکل ایسے جیسے ایک شخص دوسرے کے مال سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا مرنے کے بعد بھی وہ دوسروں کے عمل سے فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ اور آیا ایک شخص اپنے عمل کو کسی گزر جانے والے شخص کے لیے ہدیہ کر سکتا ہے؟

جواباً عرض ہے کہ عبادات میں سے مالی عبادات میں ایسا کرنا جائز ہے، جیسے میت کی طرف سے صدقہ کرنا کئی نصوص سے ثابت ہے۔ بدنی عبادات میں صرف انھی اعمال تک محدود رہنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، چونکہ عبادت کے مسئلے میں قیاس جائز نہیں، اس لیے وہ چیز جس کا کرنا نبیٔ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں اس کا جواز نہیں دیا جا سکتا۔

اب آیئے ان نصوص کی طرف جن سے مالی یا بدنی عبادات کا ایک میت کی طرف سے کرنا ثابت ہے:

① رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ

النجم 39:53.

صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ»

''جب ابن آدم مر جاتا ہے تو سوائے تین چیزوں کے اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں: صدقہ جاریہ یا ایسا علم جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے یا نیک اولاد جو میت کے لیے دعا کرے۔''

اس حدیث میں بیان کردہ تینوں چیزیں دراصل میت کا اپنا ہی عمل ہے جو اس کی موت کے بعد بھی جاری ہے۔ صدقہ جاریہ جیسے کنواں کھدوانا، سرائے بنانا، ہسپتال قائم کرنا وغیرہ جسے اس نے اپنی زندگی میں قائم کیا تھا اور جب تک وہ باقی ہے اس کا ثواب میت کو ملتا رہے گا۔

وہ علم جو کتابوں کی شکل میں محفوظ ہو چکا ہے (اور اب تو کیسٹ اور سی ڈی کی شکل میں بھی محفوظ ہو جاتا ہے) وہ بھی میت کا اپنا تحریر کردہ ہے۔

اولاد انسان کی اپنی کمائی ہے ﴿مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ﴾ ''ابولہب کے کام نہ اس کا مال آیا اور نہ اس کا کسب ہی، (یعنی اولاد)۔''

اس لیے اولاد کی دعا خصوصی طور پر میت کو نفع دے گی۔

② عام لوگوں کی دعا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''اور جو لوگ ان کے بعد آئے، (مہاجرین و انصار کے بعد) وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہماری مغفرت کر اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان کی حالت میں ہم سے پہلے گزر چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ، بے شک تو انتہائی مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔''

صحیح مسلم، الوصیۃ، حدیث: 1631۔ اللہب 111:2۔ الحشر 59:10۔

نماز جنازہ میں میت کے لیے دعا کی جاتی ہے اور اہل ایمان کی دعا میت کے لیے سفارش بن جاتی ہے۔

③ **میت کی طرف سے صدقہ کرنا:** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میری والدہ اچانک فوت ہوگئی اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر اسے بولنے کی مہلت ملتی تو وہ صدقہ کرتی، اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کردوں تو کیا اسے ثواب ملے گا؟ آپ نے کہا: ہاں! [1]

④ **میت کی طرف سے اس کے ولی کا روزہ رکھنا:** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ»

> ''جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے کچھ روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے۔'' [2]

ولی سے مراد ہر وہ شخص ہے جو میت کا وارث ہے۔

⑤ **حج بدل کرنا:** سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ خثعم قبیلے کی ایک عورت نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اللہ کے رسول! میرے باپ پر حج فرض ہو چکا ہے لیکن وہ اتنا بوڑھا ہے کہ سواری پر جم کر بیٹھ نہیں سکتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں!'' [3] یہ واقعہ حجۃ الوداع کے موقع پر پیش آیا۔

ابن عباس کی ایک دوسری روایت کے مطابق جہینہ قبیلے کی ایک عورت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ نذر پوری کرنے

[1] صحیح البخاري، الجنائز، حدیث: 1388، وصحیح مسلم، الزکاۃ، حدیث: 1004. [2] صحیح البخاري، الصوم، حدیث: 1952، وصحیح مسلم، الصیام، حدیث: 1147. [3] صحیح البخاري، الحج، حدیث: 1513، وصحیح مسلم، الحج، حدیث: 1334.

سے پہلے ہی وفات پا گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! اس کی طرف سے حج کرو۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمھاری ماں پر قرض ہوتا، کیا تم اسے ادا نہ کرتیں؟ تو اللہ کا قرض ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔''[1]

پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر انسان حج کرنے سے خود عاجز ہو تو اس کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے اور دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ فوت شدہ شخص کی طرف سے بھی حج کیا جا سکتا ہے لیکن آیا یہ حج صرف اولاد ہی کر سکتی ہے؟ کیونکہ دونوں حدیثوں میں اولاد ہی کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ گو ان دونوں حدیثوں میں اولاد کا ذکر ہے لیکن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک تیسری روایت سے مطلق جواز کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا: لبیك عن شبرمة! (یعنی میں شبرمہ کی طرف سے تلبیہ کہہ رہا ہوں) پوچھا: ''یہ شبرمہ کون ہے؟'' کہنے لگا: میرا بھائی یا میرا ایک رشتے دار ہے۔ کہا: ''کیا تم نے اپنا حج کر لیا ہے؟'' اس نے جواب دیا: نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ''پہلے اپنا حج کرو اور پھر شبرمہ کی طرف سے۔''[2]

امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث موقوف ہے، یعنی یہ واقعہ خود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا تھا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں لیکن نفس استدلال میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صحابی کا قول بھی حجت ہے اگر اس کی مخالفت میں کوئی دوسرا قول نہ ہو۔

دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ نبی ﷺ نے میت کی طرف سے حج کرنے کو قرض ادا

[1] صحيح البخاري، جزاء الصيد، حديث: 1852. [2] سنن أبي داود، المناسك، حديث: 1811، ابن ماجه، المناسك، حديث: 2903.

کرنے سے تشبیہ دی اور قرض چاہے اولاد ادا کردے یا کوئی دوسرا شخص دونوں صورتوں میں ادا ہو جاتا ہے۔

اور تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر میت کی طرف سے اس کا وارث روزہ رکھ سکتا ہے جو کہ خالص بدنی عبادت ہے تو حج کیوں نہیں کر سکتا کہ جس میں بدن کے ساتھ ساتھ مال بھی خرچ ہوتا ہے۔

بعض علماء میت کی طرف سے قربانی کرنے کے بھی قائل ہیں لیکن ہم اس مسئلے کو پچھلے سوال کے ذیل میں واضح کر چکے ہیں۔

یہاں تک تو سوال کے پہلے جز کا جواب ہوگیا کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے ایک میت اپنی موت کے بعد بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ دعا کے ضمن میں واضح رہے کہ مشرکین کے لیے (چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) دعاء واستغفار کرنا منع ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''نبی کے لیے اور ایمان والوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے، چاہے وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں، مغفرت کی دعا کریں، بعد اس کے کہ انھیں معلوم ہوگیا کہ وہ جہنمی ہیں۔''[1]

مندرجہ بالا امور کے علاوہ دوسری عبادات جیسے میت کی طرف سے نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

جہاں تک ایصال ثواب کا تعلق ہے کہ قرآن پڑھ کر اس کا ثواب میت کو بخش دیا جائے تو سنت کے دفاتر ایسے واقعات سے بالکل خالی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں لوگ ایک شخص کی وفات کے بعد تیسرے دن یا کسی بھی دن جمع ہوتے

[1] التوبة 9:113

ہوں، اجتماعی طریقے پر قرآن پڑھتے ہوں اور پھر اس کا ثواب میت کو بخشتے ہوں۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: خیر القرون میں جو امر مسلمانوں کے درمیان معروف تھا کہ وہ نماز، روزے اور تلاوت کی فرض اور نفل تمام عبادات کیا کرتے تھے جو مشروع ہیں اور اللہ کے حکم کے مطابق مومن مردوں اور عورتوں کے لیے دعا کیا کرتے تھے، زندوں کے لیے بھی اور مردوں کے لیے بھی۔

سلف کی یہ عادت نہ تھی کہ اگر وہ نفلی نماز، روزہ، حج ادا کرتے یا قرآن پڑھتے تو اس کا ثواب کسی میت کو ہدیہ کرتے، چاہے وہ ان کے رشتے داروں میں سے ہو یا عام مسلمانوں میں سے۔●

اب آخر میں شیخ ابن باز اور شیخ عبداللہ بن قعود کے دستخطوں سے جاری شدہ فتویٰ بھی ملاحظہ ہو جو سعودی عرب کے دارالافتاء سے صادر ہوا ہے۔

فتویٰ نمبر 2232: ''ہماری معلومات کے مطابق نبی ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے قرآن پڑھ کر اس کا ثواب اپنے فوت شدہ قریبی رشتے داروں یا دوسرے مسلمانوں کو بخشا ہو۔ اگر اس طرح ثواب پہنچتا تو آپ ضرور ایسا کرتے بلکہ امت کو بھی بتاتے تاکہ وہ مردوں کو نفع پہنچا سکتے کیونکہ نبی ﷺ مسلمانوں پر بہت ہی شفیق تھے۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین اور تمام صحابہ بھی آپ کے اسی طریقے پر گامزن رہے، ہمارے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں کہ ان میں سے کسی نے قرآن کا ثواب کسی اور کو بخشا ہو۔ تمام خیر نبی اکرم ﷺ کے راستے اور آپ کے صحابہ کے راستے پر چلنے میں ہے اور تمام شر بدعات اور نئی چیزوں کے پیچھے لگنے میں ہے۔ رسول

● فتاویٰ ابن تیمیہ: 323,322/24۔

اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»

"نئے نئے امور سے بچو، اس لیے کہ ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"[1]

اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»

"جس نے ہمارے اس امر (دین) میں کوئی ایسی نئی چیز ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ ٹھکرا دی جائے گی۔"[2]

چنانچہ میت کے لیے قرآن کا پڑھنا ناجائز ہے، اسے اس قراءت کا ثواب نہیں پہنچے گا بلکہ یہ کام بدعت کہلائے گا۔

جہاں تک دوسری عبادات کا تعلق ہے تو جس کا ثواب پہنچنے کی دلیل صحیح موجود ہو تو اسے قبول کیا جائے گا، جیسے میت کی طرف سے صدقہ کرنا، اس کے لیے دعا کرنا، اس کی طرف سے حج کرنا۔

اور جس بات پر دلیل نہ ہو تو وہ ناجائز ہے یہاں تک کہ اس پر دلیل مل جائے، اس لیے علماء کی صحیح رائے کے مطابق میت کے لیے قرآن پڑھنا ناجائز ہے اور ایسی قراءت کا ثواب میت کو نہیں پہنچتا بلکہ ایسا کرنا بدعت ہے۔[3]

[1] سنن أبي داود، السنة، حديث: 4607، [2] صحيح البخاري، الصلح، حديث: 2697، وصحيح مسلم، الأقضية، حديث: 1718. [3] فتاوىٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية: 43/9

باقی رہا میت کے گھر تعزیت کے لیے جانا تو ایسا کرنا جائز ہے لیکن اس مقصد کے لیے میت کے گھر میں اجتماع کرنا یا کئی کئی دن وہیں قیام کرنا خود اہل میت کے لیے پریشانی اور دردِ سر کا باعث ہو سکتا ہے۔ سنت تو یہ ہے کہ میت کے گھر والوں کے لیے کھانا بنایا جائے نہ یہ کہ انھیں مہمانوں کے لیے کھانا بنانے پر مجبور کیا جائے۔ تعزیت کی غرض سے جانا ہو تو تسلی کے الفاظ کہے جائیں، میت کی خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے، وقت گزاری کے لیے اگر کوئی شخص خود قرآن پڑھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ایصالِ ثواب کی نیت سے اجتماع منعقد کرنا بدعت ہے جیسا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

والد کے ایصالِ ثواب کے لیے زندہ بزرگ کو کھانا کھلانا

سوال لندن سے ج، ا دریافت کرتے ہیں کہ میرے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ کیا اس نیت سے کہ میرے والد صاحب کو ثواب پہنچتا رہے کسی زندہ بزرگ کو کھانا کھلا سکتا ہوں؟ شریعت کی روشنی میں جواب ارسال فرمائیں۔

جواب مکرمی جناب ج، ا صاحب! آپ کا جواب درج ذیل ہے:

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص اپنے والدین کی وفات کے بعد ان کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”ان کے لیے دعا، استغفار، ان کے دوستوں کا اکرام، ان کے وعدوں کو پورا کرنا اور ان کے رشتے داروں سے تعلق قائم رکھنا۔“ [1]

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو

[1] سنن أبي داود، الأدب، حديث: 5142، وسنن ابن ماجه، الأدب، حديث: 3664.

اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں، سوائے تین چیزوں کے، نیک اولاد جو ان کے لیے دعا کرتی ہے، صدقہ جاریہ اور نفع بخش علم۔"

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوا کہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ دعا کرنا سب سے افضل عمل ہے۔ آپ اپنے کسی اچھے عمل کے بعد دعا کریں گے تو دعا میں اور زیادہ تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ آپ یقیناً کسی غریب شخص کو کھانا کھلائیں کہ یہ ایک نیک عمل ہے لیکن اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! میں ان غرباء کو کھانا تیری خوشنودی کے لیے کھلا رہا ہوں، یا اللہ! اس نیک عمل کے صلے میں میرے والد سے درگزر فرما، ان کی خطائیں معاف کر، انھیں جنت الفردوس میں داخل کر اور ان کے درجات بلند فرما۔ ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

غیر مسلموں کے ایام (کرسمس وغیرہ) منانے کا حکم

سوال لندن سے جناب ا، ج صاحب لکھتے ہیں کہ کیا مسلمانوں کو بھی کرسمس کا تہوار منانے یا عیسائیوں کی ان خوشیوں میں شرکت کرنے کی اجازت ہے؟

جواب آپ کے استفسار کے جواب میں عرض ہے کہ کرسمس کا تہوار بقول عیسائی محققین ایک بت پرستوں کا تہوار ہے۔ ان کے نزدیک یہ بات بھی متحقق نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام 25 دسمبر کو پیدا ہوئے تھے۔ خود سورۂ مریم میں جہاں حضرت مریم علیہا السلام کے ہاں بچے کی ولادت کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں کہا گیا ہے:

﴿وَهُزِّيٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا﴾

"کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، تمھارے اوپر تازہ تازہ کھجوریں گر پڑیں گی۔"

● صحیح مسلم، الوصیۃ، حدیث: 1631. ● مریم 19:25.

اور یہ بات سب کے علم میں ہے کہ فلسطین میں کھجوروں کے پکنے کا موسم گرمی میں ہوتا ہے نہ کہ دسمبر کی سخت سردی میں۔ تو یہ بات معلوم ہوئی کہ 25 دسمبر عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا دن نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اسلام میں یوم ولادت منانے کا کوئی تصور نہیں ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا یوم ولادت نہیں منایا، نہ اپنی بچیوں ہی کا اور نہ اپنے بزرگوں ہی کا۔ صحابہ کرام جو کہ خیر القرون تھے، ان سے بھی کسی کا یوم ولادت منانا ثابت نہیں ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت اور وہ بھی عیسائیوں کی تقلید میں تو اس لیے بھی منع ہوگا کہ اس طرح عیسائیوں کے عقیدے کو تسلیم کیا جارہا ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی ولادت کا جشن بھی مناتے ہیں۔ شیخ محمد بن عثیمین رحمہ اللہ اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں: پچھلی قوموں کے تہوار یا تو بدعت پر مبنی ہوں گے یا ہماری شریعت میں منسوخ قرار دیے جاچکے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں ان کا منانا ممنوع قرار پائے گا۔

آخری بات یہ کہ اگر عیسائی حضرات کرسمس کے موقع پر آپ کو تہنیت کا کارڈ بھیجتے ہیں تو آپ اپنی عید تک صبر کریں اور اگلی عید کے موقع پر عید کی مناسبت سے کارڈ ارسال کردیں، یعنی ان کی تہنیت کا جواب دے دیا گیا۔

باہر سے آنے والے کے استقبال کے لیے کھڑا ہونا

سوال باہر سے آنے والوں کا استقبال کرنے کی غرض سے مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا کھڑے ہوجانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہو اور باقی حضرات اس کے احترام میں کھڑے رہیں تو ایسا کرنا جائز نہیں، اسی لیے نبی ﷺ نے نماز کے ضمن میں بتایا کہ اگر امام کھڑا ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی اس کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھو۔[1]

اور آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: «لَا تَقُومُوا لِي كَمَا يَقُومُ الْأَعَاجِمُ لِمُلُوكِهِمْ» ''تم میرے لیے ایسے مت کھڑے ہو جیسے عجمی لوگ اپنے بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔''[2] البتہ کسی آنے والے شخص کے استقبال کے لیے کھڑے ہونا اور پھر چند قدم چل کر اس کا استقبال کرنا جائز ہے۔

نبی ﷺ نے غزوہ بنو قریظہ کے موقع پر سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ کو یہود کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے بلایا۔ وہ خود زخمی تھے، جب انھیں لایا جا رہا تھا تو اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا: «قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ» ''اپنے سردار کے (استقبال کے) لیے کھڑے ہو جاؤ۔''[3]

گویا قَامَ لَهُ ''کسی کے لیے کھڑا ہونا'' اور قَامَ إِلَيْهِ ''کسی کی طرف جاتے ہوئے کھڑا ہونا'' میں فرق کیا گیا ہے، پہلی کیفیت ناجائز ہے اور دوسری جائز۔

---

[1] صحيح البخاري، الأذان، حديث: 689، وصحيح مسلم، الصلاة، حديث: 417,416.

[2] فتوے میں مذکور الفاظ مجھے نہیں مل سکے، تاہم ابوداود، (حدیث: 5230) اور مسند احمد (253/5) میں اس سے ملتے جلتے الفاظ مجھے ملے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں: «لَا تَقُومُوا كَمَا تَقُومُ الْأَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا» یہ الفاظ بھی ضعیف ہیں (دیکھیے: الضعيفة: 521/1، حديث: 346) لیکن اس کا مفہوم صحیح ہے۔ اس کی تائید حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ صحابہ کرام کو سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ سے محبت تھی لیکن وہ آپ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ (جامع الترمذي، الأدب، حديث: 2754)

[3] صحيح البخاري، الجهاد، حديث: 3043، وصحيح مسلم، الجهاد والسير، حديث: 1768.

طہارت
کے مسائل

جرابوں پر مسح کے قائل امام کا اعتراض ہونے پر پاؤں دھونا اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

سوال جرابوں پر مسح کے قائل امام صاحب اگر بعض مقتدی حضرات کے اعتراض اور ان کی خواہش کی تکمیل میں موزوں پر مسح ترک کر کے پیر دھونے لگ جائیں تو کیا سنت رسول ﷺ کی رو سے یہ عمل درست قرار پائے گا؟ نیز کیا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کپڑے کے موزوں پر مسح کے قائل تھے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔ (سائل: حاجی محمد رفیق، ڈڈلی یوکے)

جواب جہاں تک خُفّ (چمڑے کے موزے) کا تعلق ہے تو اس کے جواز پر اجماع ہے، یعنی سوائے اہل تشیع کے سب اس کے قائل ہیں اور اس کی بنیاد ایک تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں خفین (دونوں موزوں) پر مسح کیا تھا۔[1]

اور دوسری حدیث جریر بن عبداللہ بَجَلی سے مروی ہے کہ انھوں نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور پھر خفین پر مسح کیا اور کہا: جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے تو مجھے مسح کرنے سے کون سی چیز روک سکتی ہے؟ لوگوں نے کہا: یہ

[1] صحيح البخاري، الوضوء، حديث:203-205، وصحيح مسلم، الطهارة، حديث:274.

تو سورہ مائدہ کی آیت سے قبل کا واقعہ ہے (کہ جس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے) تو جریر نے کہا: میں تو مسلمان ہی سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد ہوا تھا۔[1]

ان دونوں صحابہ کے علاوہ یہ مسئلہ اتنے زیادہ صحابہ سے مروی ہے کہ حسن بصری کہتے ہیں: مجھے ستر صحابہ نے خفین پر مسح کرنے کی روایت بیان کی ہے۔[2] زرقانی مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں: بعض علماء نے اس کے تمام راویوں کو شمار کیا تو وہ اسّی سے تجاوز کر گئے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔[3]

اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ خف پر مسح کرنا تواتر سے ثابت ہے اور جہاں تک جرابوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔[4]

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے لیکن امام ابوداود نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اس حدیث کو بیان نہیں کرتے تھے کیونکہ مغیرہ کی معروف روایت صرف خفین پر مسح کرنے کے بارے میں ہے۔ اس کی تائید میں دوسری حدیث ابوموسیٰ اشعری کی ہے جس میں جرابوں اور جوتوں پر مسح کرنے کا بیان ہے[5] اور یہ حدیث بھی بیہقی کی تحقیق کے مطابق ضعیف ہے۔[6]

امام ابن قیم رحمہ اللہ ابن منذر رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ صحابہ میں سے نو حضرات سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے، جن میں سیدنا علی، عمار، ابومسعود انصاری، انس، ابن

[1] صحيح البخاري، الصلاة، حديث: 387، وصحيح مسلم، الطهارة، حديث: 272، وسنن أبي داود، الطهارة، حديث: 154 واللفظ له. [2] الاستذكار: 217/1، والتمهيد لابن عبدالبر: 137/11، وفتح الباري: 306/1. [3] شرح الزرقاني على موطا: 113/1، وفتح الباري: 306/1.
[4] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 159، وجامع الترمذي، الطهارة، حديث: 99. [5] سنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، حديث: 560. [6] السنن الكبرى: 284/1.

عمر، براء بن عازب، بلال، عبداللہ بن ابی اوفی اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ امام ابوداود نے ابوامامہ، عمرو بن حریث، عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے ناموں کا اضافہ کیا ہے، یہ کل تیرہ صحابی ہوئے اور اس مسئلے میں جواز کی بنیاد ان صحابہ کے طرز عمل پر ہے نہ کہ مغیرہ بن شعبہ کی اس روایت پر جسے ابوقیس ان سے بیان کر رہے ہیں اور جس میں جرابوں پر مسح کرنے کا ذکر ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام احمد جرابوں پر مسح کرنے کو جائز سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ ابوقیس کی روایت کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے انصاف کی بات کی ہے، ان کا اعتماد بھی ایک تو صحابہ کے طرز عمل پر ہے اور دوسرے صریح قیاس پر اور وہ یہ کہ خف اور جراب میں ایسا کوئی فرق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے دونوں کے حکم علیحدہ علیحدہ ہوں۔

پھر لکھتے ہیں: جرابوں پر مسح کرنے کے بارے میں اکثر اہل علم کا اتفاق ہے۔ صحابہ کے نام تو ہم نے ذکر کر دیے۔ ائمہ میں سے اس کے قائلین میں احمد، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن میسب اور ابویوسف بھی ہیں اور صحابہ میں سے جن کے نام ہم نے درج کیے ہیں، ان کی مخالفت کرنے والا کوئی نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ابویوسف اور محمد کی رائے ہے کہ اگر جرابیں اتنی موٹی ہوں کہ پیر کی کھال نظر نہ آئے تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ موٹی جرابوں پر مسح کے قائل نہ تھے لیکن اپنی وفات سے سات یا تین دن قبل انھوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا اور اپنے مرض موت میں موٹی جرابوں پر مسح کرتے رہے، جو لوگ عیادت کے لیے آتے ان سے کہتے: میں جس بات سے روکتا

تھا اب اسی پر عمل کر رہا ہوں۔ خیال رہے کہ نہ صرف جرابوں بلکہ اس کپڑے پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے جو پیروں پر لفافے کی طرح لپیٹ لیا جائے۔[1]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحیح بات یہی ہے کہ پیر کے لفافوں پر مسح کرنا جائز ہے بلکہ خف اور جراب سے بھی زیادہ ان پر مسح کرنا اولیٰ ہے کیونکہ یہ لفائف ضرورت کی بنا پر پہنے جاتے ہیں سردی، ننگے پیر چلنے یا زخم کی تکلیف سے بچنے کے لیے۔ اس کے ناجائز ہونے پر اجماع نقل کرنا لاعلمی کی نشانی ہے۔ اجماع تو چھوڑیے، دس ایسے مشہور علماء کے نام بھی پیش نہیں کیے جا سکتے کہ جو اس کے ناجائز ہونے کے قائل ہوں۔

وہ کہتے ہیں کہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ پر غور کرے اور قیاس کا بھی برمحل اعتبار کرے تو وہ جان لے گا کہ اس بات میں رخصت کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور اسی سے شریعت کے حسن کا اندازہ ہوتا ہے۔

ضمناً تذکرہ ہو جائے کہ اگر خف یا جراب میں تھوڑے بہت چھید ہوں تب بھی ان پر مسح کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان کا پہننا ممکن ہو۔

امام ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کے خف عام لوگوں کی طرح چھید سے خالی نہیں ہوتے تھے، اگر ان پر مسح کرنا ناجائز ہوتا تو ضرور منقول ہوتا۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ شریعت میں اگر کسی بات کی رخصت دی جاتی ہے تو وہ مشقت سے بچانے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ مزید مشقت میں مبتلا کرنے کے لیے۔

برطانیہ کے طویل سرد موسم کو دیکھیے کہ اس میں جرابوں پر مسح کرنے سے آدمی کتنی

[1] جامع الترمذي، الطهارة، تحت رقم الحديث: 99، والمبسوط للسرخسي 1/289، وبدائع الصنائع 1/37، وتبيين الحقائق 1/52

مشقت سے بچ جاتا ہے۔ خاص طور پر اس بات کا بھی خیال کیجیے کہ آفس، کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے حضرات جب جرابیں اتار کر اپنا پاؤں واش بیسن میں رکھتے ہیں تو غیر مسلم حضرات کو یہ بات کتنی ناگوار گزرتی ہے کہ جہاں وہ اپنے ہاتھ اور چہرہ دھوتے ہیں وہاں ہم لوگ اپنا پیر دھو رہے ہوتے ہیں تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اللہ کی دی گئی رخصت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ آپ گھر سے وضو کر کے آئیں، خف یا جراب پہن کر نکلیں اور پھر سارا دن ان پر مسح کرتے رہیں۔ خود کو بھی آسانی رہے گی اور کسی کو اعتراض کرنے یا ناگواری کے اظہار کی نوبت بھی نہ آئے گی۔

حالت حیض میں قرآن کریم کی تلاوت کرنا

سوال اگر عورت حالت حیض میں ہو تو کیا قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر پڑھ سکتی ہے؟

جواب جی ہاں! بغیر ہاتھ لگائے پڑھ سکتی ہے۔ ہاتھ اس لیے نہ لگائے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ»

[1] ''قرآن کو کوئی ہاتھ نہ لگائے مگر حالت طہارت میں۔''

جس حدیث سے حالت حیض میں قرآن نہ پڑھنے پر استدلال کیا جاتا ہے وہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ سے مروی ہے:

«لَا تَقْرَأُ الْحَائِضُ وَلَا الْجُنُبُ شَيْئًا مِّنَ الْقُرْآنِ»

[2] ''حائضہ اور جنبی (جنابت والا) قرآن سے کچھ نہ پڑھیں۔''

[1] سنن الدارقطني: 1/495، وإرواء الغليل: 1/158. [2] جامع الترمذي، الطهارة، حديث: 131، وإرواء الغليل: 1/206، حديث: 192.

یہ روایت ضعیف ہے، اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ہیں۔ اگر یہ حجازی لوگوں سے روایت کریں تو ان کی روایت کا اعتبار نہیں۔[1]

جنبی شخص کو البتہ قراءت کی اجازت نہیں، جس کا مدار ایک دوسری حدیث پر ہے:

«لَا يَحْجُزُهُ عَنِ الْقُرْآنِ شَيْءٌ إِلَّا الْجَنَابَةُ»

''سوائے جنابت کے اور کوئی چیز آپ کو قرآن پڑھنے سے نہیں روکتی تھی۔''[2]

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: «فَأَمَّا الْجُنُبُ فَلَا، وَلَا آيَةً»

''جہاں تک جنبی کا تعلق ہے تو وہ قرآن بالکل نہ پڑھے، ایک آیت بھی نہیں۔''[3]

حائضہ اور جنبی میں فرق اس لیے بھی روا رکھا گیا کہ جنابت سے تو فوراً غسل کرنے کے بعد پاک ہوا جاسکتا ہے لیکن حائضہ بہر صورت کئی دن تک حالتِ ناپاکی میں رہے گی، اس لیے قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی تاکہ حفظ میں بھی خلل نہ آئے اور تلاوتِ قرآن سے بھی محروم نہ ہو۔

حالتِ حیض میں ٹیپ پر آیتِ سجدہ سننے یا پڑھنے پر سجدے کا حکم

سوال عورت اگر حالت حیض میں ہو اور کوئی سجدہ تلاوت والی آیت پڑھے یا ٹیپ سے سنے تو کیا اس پر سجدہ تلاوت فرض ہے؟ (محترمہ رخسانہ احمد، لندن)

جواب سجدہ تلاوت فرض نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے، اس لیے اسے چھوڑنا نامناسب

[1] تهذيب التهذيب: 1/281-283. [2] سنن أبي داود، الطهارة، حديث: 229، وسنن ابن ماجه، الطهارة وسننها، حديث: 594 واللفظ له. [3] مسند أحمد: 1/110، ومسند أبي يعلى: 1/300، وإرواء الغليل: 2/243، 244، وتمام المنة، ص: 117. یاد رہے کہ یہ دونوں روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔

ہے لیکن چونکہ واجب نہیں، اس لیے سجدہ نہ کرنے پر انسان گنہگار نہیں ہوتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سورۂ نحل کی آیتِ سجدہ منبر پر دوران خطبہ میں پڑھی تو نیچے اترے اور سجدہ کیا۔ دوسری مرتبہ جمعہ کے دن وہی آیت پڑھی لیکن سجدہ نہیں کیا اور پھر کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ سجدہ ہم پر فرض نہیں کیا لیکن اگر ہم چاہیں تو کر لیں۔[1] یہ بات آپ نے متعدد صحابہ کی موجودگی میں کہی۔

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۂ نجم پڑھی (جس کے آخر میں آیت سجدہ ہے) لیکن انھوں نے سجدہ نہیں کیا۔[2] اگر ایسا کرنا واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اس کا حکم دیتے۔

چونکہ یہ سنت مؤکدہ ہے، اس لیے سجدہ تلاوت بہر حال کر لینا چاہیے چاہے ایسا وقت ہو جس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

سننے والے پر تو سجدہ اسی وقت مشروع ہوتا ہے جب قاری خود سجدہ کرے۔ اگر عورت حالت ناپاکی میں ہے تو تب سجدہ نہ کرے اور اگر ٹیپ وغیرہ سے سنے تب بھی سجدہ ضروری نہیں کیونکہ ٹیپ تو ایک آلہ ہے، نہ قاری آپ کے سامنے ہے اور نہ ہی وہ سجدہ کرتا ہوا نظر ہی آتا ہے۔

[1] صحیح البخاري، سجود القرآن، حدیث: 1077. [2] صحیح البخاري، سجود القرآن، حدیث: 1073،1072، وصحیح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، حدیث: 577.

نماز
کے مسائل

مرد وزن کی نماز میں فرق

سوال محترمہ عطیہ اسلم نے مولانا محمد عبدالمعبود کی کتاب کے چند اوراق ارسال کیے ہیں جس میں وہ مرد اور عورت کی نماز میں ستائیس (27) فرق کا ذکر کر رہے ہیں۔ انھوں نے استفسار کیا ہے کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

جواب جواباً عرض ہے کہ فقہاء کی کتابیں دیکھی جائیں تو آپ کو حنفی اور شافعی طریقہ نماز میں بھی فرق نظر آئے گا لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے جو بھی سنت کے مطابق ہوگا وہی ہر مسلمان کے لیے قابل حجت ہوگا۔ اسی طرح مرد اور عورت کی نماز میں جو فرق بیان کیا گیا ہے، اس کے بارے میں بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ کہاں تک سنت کے مطابق ہے، چونکہ اس ضمن میں ہمارے پاس بطور دلیل یا تو احادیث رسول ﷺ ہیں یا اقوال صحابہ اور تابعین، اس لیے چند ابتدائی اصول ملحوظ رہیں:

- اس مسئلہ میں اصل تو رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''نماز ایسے پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔''[1]

ظاہر ہے اس حکم میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں ہے لیکن اگر نبی اکرم ﷺ نماز

[1] صحيح البخاري، الأذان، حديث:631.

کے کسی خاص جز کے بارے میں ارشاد فرما دیں کہ عورتیں اسے دوسرے طریق سے کریں تو ہم اس کے پابند ہوں گے۔ جیسے نماز کی حالت میں عورت کا باپردہ ہونا یا حالتِ حیض میں نماز کا نہ پڑھنا۔

● اقوال صحابہ کہاں تک حجت ہیں؟ اس کے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیل ملاحظہ ہو:

① وہ اقوال جنھیں خود رسول اللہ ﷺ نے درست قرار دیا۔

② رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد کسی صحابی نے کوئی فتویٰ دیا جس کی تائید حدیث سے مل گئی۔

③ صحابی کسی فعل کے بارے میں یہ کہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسے کیا کرتے تھے۔

④ ایسے اقوال جن میں کسی ایسے شرعی حکم کا تذکرہ ہو جسے معلوم کرنے میں عقل کا دخل نہیں ہے۔

⑤ ایسے اقوال جن پر تمام صحابہ کا اتفاق پایا جائے، انھیں اجماع کا درجہ حاصل ہوگا۔

⑥ ایسے اقوال جو قرآن کی تفسیر یا اسبابِ نزول سے متعلق ہیں۔

مندرجہ بالا تمام اقوال حجت ہیں۔

⑦ ایسا قول جو کسی صحابی کی ذاتی رائے اور اجتہاد پر مبنی ہو۔

فقہاء میں ایسے قول کو قبول کرنے یا نہ کرنے میں اختلاف ہے اور اگر کسی مسئلے میں خود صحابہ میں اختلاف ہو تو جو قول قرآن و سنت سے زیادہ قریب ہو اسے قبول کر لیا جائے گا۔

وہ قول جس سے صحابی نے خود رجوع کر لیا ہو یا یہ قول رسول اللہ ﷺ کی وفات کے

بعد صحابی سے صادر ہوا ہو اور قرآن و سنت کے خلاف ہو تو وہ قابل حجت نہیں۔

- جہاں تک تابعین کی آراء اور فتوؤں کا تعلق ہے تو وہ اقوال صحابہ کی طرح حجت نہیں ہیں لیکن اگر کسی مسئلے میں کوئی قول نہ مل رہا ہو تو تابعین کے اقوال سے اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد ان ستائیس فروق کی طرف آئیے جن کا شروع میں حوالہ دیا گیا ہے اور پھر دیکھیں کہ مندرجہ بالا معیار کے مطابق وہ کہاں تک قابل قبول ہیں۔

① ''عورت تکبیر تحریمہ کے لیے کندھوں تک ہاتھ اٹھائے۔''

رسول اللہ ﷺ سے اکثر تو کندھوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے،[1] لیکن بعض احادیث میں کانوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر بھی ہے۔[2] صحابیات میں سے ام درداء الکبری (خیرہ بنت ابی حدرد الاسلمیہ رضی اللہ عنہا) کے تذکرہ میں ملتا ہے کہ وہ کندھوں تک ہاتھ اٹھایا کرتی تھیں۔[3] تابعیات میں سے حفصہ بنت سیرین کا بھی یہی عمل تھا۔[4]

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس بارے میں کہ ہاتھ کتنے اٹھائے جائیں، احادیث میں ایسی کوئی بات وارد نہیں ہوئی جس سے رفع الیدین کے مسئلے میں مرد اور عورت میں فرق کا پتہ چلے۔[5]

تابعین میں سے عطاء اور حماد نے عورتوں کے لیے اپنی چھاتیوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر کیا ہے۔[6]

[1] صحيح البخاري، صفة الصلاة، حديث: 735، وصحيح مسلم، الصلاة، حديث: 390
[2] صحيح مسلم، الصلاة، حديث: 391. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 239/1، وجزء رفع اليدين للبخاري، ص: 23. [4] مصنف ابن أبي شيبة: 239/1. [5] نيل الأوطار: 197/2. [6] مصنف ابن أبي شيبة: 239/1.

اب یہاں ملاحظہ فرمائیے کہ خود حنفی مذہب میں بھی عطاء اور حماد کے قول کو نہیں لیا گیا کیونکہ حدیث میں آثار صحابہ میں کندھوں تک ہاتھ اٹھانا مروی ہے۔

② ''عورت اپنے ہاتھ آستینوں یا دوپٹے سے باہر نہ نکالے۔''

اس فرق کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

③ ''دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ پر رکھے۔''

چونکہ نماز کی عمومی احادیث میں دائیں ہاتھ کا بائیں ہاتھ پر رکھنا وارد ہے،[1] اس لیے اس کیفیت کو عورتوں سے خاص کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔

④ ''ہاتھ سینے پر باندھے۔''

جو حدیث ہاتھوں کے سینے پر باندھنے سے متعلق ہے وہی صحیح حدیث ہے، جس کے راوی وائل بن حجر رضی اللہ عنہ ہیں اور جسے ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔[2] اس کے مقابلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت جس میں ہاتھ ناف سے نیچے باندھنے کا تذکرہ ہے۔[3] وہ ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق کی وجہ سے انتہائی ضعیف حدیث ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو عورتوں کے لیے تسلیم کر لیا تو مردوں کے لیے اسے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہے جبکہ حدیث میں تو مرد اور عورت کی تخصیص نہیں ہے۔

10-5 یہ چھ امور رکوع سے متعلق ہیں، یعنی: ''عورت رکوع میں تھوڑا جھکے، ہاتھوں پر سہارا نہ لے، رکوع میں ہاتھ کی انگلیاں سمیٹ کر رکھے، پھیلانا منع ہے، رکوع میں صرف

[1] سنن أبي داود، الصلاة، حديث:727، وسنن النسائي، الافتتاح، حديث:890. [2] صحيح ابن خزيمة:243/1. [3] سنن أبي داود، الصلاة، حديث:756

گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، گھٹنے پکڑنا منع ہے، رکوع میں گھٹنوں کو تھوڑا سا جھکائے، رکوع میں سمٹی رہے۔''

ان تمام جزئیات پر سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ محدث عبدالرزاق نے تابعی عطاء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب عورت رکوع کرے تو سمٹی رہے (أَنْ تَجْتَمِعَ) اپنے ہاتھ پیٹ تک اٹھائے رکھے اور جتنا ہو سکے سمٹے۔ [1]

11، 12 اور نمبر 26 یہ تینوں امور سجدے سے متعلق ہیں: ''سجدہ سمٹ کر کرے، بازوؤں کو پہلو سے جدا نہ کرے، (عربی میں اسے تجافی کہا جاتا ہے) سجدوں میں دونوں ہاتھ زمین پر بچھا دے، سجدے کی حالت میں پاؤں کی انگلیاں کھڑی نہ رکھے۔''

سجدے کے بارے میں چند آثار وارد ہیں جن کی تفصیل یوں ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ [2] اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ عورت سجدے میں سمٹی رہے اور اپنی رانوں کو ملا کر رکھے۔ [3]

تابعین میں سے ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ اپنی رانوں کو ملا کر رکھے اور اپنا پیٹ ان کے ساتھ ملا لے اور مرد کی طرح اونچا سجدہ نہ کرے۔ [4]

تابعین میں سے مجاہد کہتے ہیں کہ یہ بات مرد کے لیے مکروہ ہے کہ وہ عورت کے مانند اپنے پیٹ کو رانوں سے ملا کر رکھے۔ [5]

تابعین میں سے حسن بصری کہتے ہیں کہ عورت سجدہ میں سمٹی رہے۔ [6]

یہ سارے آثار مصنف ابن ابی شیبہ سے لیے گئے ہیں، اس سے ملتے جلتے قول

[1] مصنف عبدالرزاق: 137/3. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 269/1، ومصنف عبدالرزاق: 138/3. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1، ومصنف عبدالرزاق: 138/3. [4] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1. [5] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1. [6] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1.

قتادہ [1] اور عطاء [2] سے منقول ہیں جن کو مصنف عبدالرزاق میں دیکھا جا سکتا ہے۔ امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں پہلے دو آثار ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس باب میں دو ضعیف احادیث وارد ہیں جن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد وہ عطاء بن العجلان کی سند سے حضرت ابوسعید خدری کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں جو تین فقروں پر مشتمل ہے:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ا) مردوں کی پہلی صفیں بہترین ہیں اور عورتوں کی آخری صفیں بہترین ہیں۔

ب) آپ مردوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ سجدے کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو پہلو سے پھیلا کر رکھیں (عربی میں لفظ تجافی مراد ہے) اور عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ اپنے سجدوں میں نیچی رہیں۔ اور مردوں کو حکم دیتے تھے کہ تشہد میں بایاں پاؤں سرین پر پھیلائیں اور دائیاں کھڑا رکھیں اور عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ وہ چار زانو (أَنْ يَتَرَبَّعْنَ) ہو کر بیٹھیں۔

ج) اور پھر کہا: اے عورتو! نماز میں اپنی نظریں اوپر نہ اٹھاؤ تاکہ مردوں کے عورات (پوشیدہ اعضاء) پر نظر نہ پڑے۔ [3]

امام بیہقی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کا پہلا اور آخری فقرہ تو مشہور ہے لیکن بیچ والا فقرہ منکر ہے، (یعنی ایسی حدیث جس کا راوی ضعیف ہو اور پھر کسی ثقہ راوی کی روایت کے خلاف بیان کرے یا وہ حدیث جس کے راوی میں فاش اغلاط یا انتہائی غفلت یا فسق پایا جائے۔) [4]

[1] مصنف عبدالرزاق: 137/3 [2] مصنف عبدالرزاق: 137/3، [3] سنن البیہقی: 222/2،

[4] سنن البیہقی: 222/2

اس کے بعد امام بیہقی ابو مطیع الحکم بن عبداللہ بلخی کی اسناد سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب عورت نماز میں بیٹھے تو اپنی ایک ران کو دوسری ران پر رکھے اور جب سجدہ کرے تو اپنے پیٹ کو دونوں رانوں سے چپکا لے کہ اس سے زیادہ ستر (پردہ) ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کی طرف دیکھ کر فرماتے ہیں: اے فرشتو! میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اس کی مغفرت کر دی۔''

پھر اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ابو مطیع اپنی حدیثوں میں انتہائی کمزور واقع ہوئے ہیں، ان کی بیان کی ہوئی روایت پر دوسرا کوئی شاہد بھی نہیں ملتا۔ یحییٰ بن معین نے انھیں ضعیف قرار دیا ہے، اس طرح عطاء بن عجلان بھی ضعیف ہے۔''[1]

پھر لکھتے ہیں: ''اس بارے میں ایک منقطع حدیث بھی وارد ہے، (یعنی اس کی سند میں ایک یا زائد راوی غائب ہیں) اور وہ ہے سالم بن غیلان کی روایت بروایت یزید بن ابی حبیب کہ رسول اللہ ﷺ دو عورتوں کے پاس سے گزرے جو نماز پڑھ رہی تھیں۔ آپ نے کہا: ''جب تم سجدہ کرو تو زمین کے ساتھ اپنے جسم کو چمٹا لیا کرو کیونکہ اس باب میں عورت مرد کے مانند نہیں۔''[2]

اس روایت کے بارے میں شیخ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

بیہقی کے کلام سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف انقطاع پایا جاتا ہے لیکن اس کا ایک راوی سالم متروک ہے جیسا کہ صاحب میزان نے

[1] سنن البیهقي: 223/2. [2] سنن البیهقي: 223/2.

سنن دارقطنی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اول تو رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث اس باب میں منقول نہیں ہے، دوسرے یہ کہ صحابہ وتابعین کے آثار بھی ضعیف ہیں، اس لیے مرد وعورت کے رکوع اور سجدہ میں تفریق کرنا بلا دلیل ہے۔

14,13 ''عورت تشہد میں دونوں پاؤں داہنی طرف نکال کر سرین پر بیٹھے اور ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر رکھے۔''

حدیث کی اصطلاح میں دو رکعت کے بعد بیٹھنے کی ہیئت کو افتراش کہا جاتا ہے، یعنی دایاں پاؤں کھڑا رکھنا اور بایاں پاؤں موڑ کر اس پر بیٹھنا۔ چار رکعت والی نماز کے آخری تشہد میں احناف کے نزدیک تو افتراش کی حالت میں بیٹھا جاتا ہے لیکن شافعیہ کے نزدیک تورک کرنا چاہیے، (یعنی بائیں ٹانگ بچھی رہے اور دائیں ٹانگ کے نیچے سے بایاں پیر نکالا جائے اور آدمی اپنے کولھے پر بیٹھے۔) تورک کرنے کے بارے میں دو صحیح احادیث حضرت ابو حمید الساعدی[2] اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما[3] سے مروی ہیں، اس لیے تورک سنت ہے۔

جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو مندرجہ ذیل آثار ملاحظہ ہوں:

[1] یہ کلام شیخ البانی رحمہ اللہ کا نہیں ہے بلکہ ابن الترکمانی کا ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے ابن الترکمانی کا ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ سالم نامی راوی متروک نہیں ہے بلکہ ''لیس بہ بأس'' ہے اور حدیث میں صرف ایک علت ارسال ہی ہے اور پھر انھوں نے بھی اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دیکھیے: (الضعيفة: 164,163/6، حديث: 2652) [2] صحيح البخاري، صفة الصلاة، حديث: 828، وسنن أبي داود، الصلاة، حديث: 730. [3] صحيح مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، حديث: 579.

① ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو نماز میں چار زانوں ہو کر بیٹھنے کی ہدایت کرتے تھے۔ [1] لیکن شیخ البانی رحمہ اللہ کے بقول یہ روایت عبداللہ بن عمر العمری کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [2]

② تابعی مکحول صحابیہ ام درداء کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی نماز میں مردوں کی مانند بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہہ عورت تھیں۔ [3]

③ تابعی ابراہیم نخعی کہتے ہیں: عورت نماز میں مرد کے مانند بیٹھے۔ [4]

④ تابعین میں سے قتادہ، حماد اور عامر شعبی کہتے ہیں: ایسے بیٹھے جیسے آسان لگتا ہو۔ [5]

⑤ عطاء کہتے ہیں: ''مرد جیسے دو رکعت والی نماز میں بیٹھتا ہے عورت ویسے بیٹھے یا اپنی بائیں ٹانگ اپنے کولھے کے نیچے سے نکال کر بیٹھے۔ یہ بھی کہا: جیسے چاہے بیٹھے مگر سمٹ کر بیٹھے۔'' [6]

⑥ صفیہ بنت ابی عبیدہ دو رکعت یا چار رکعت والی نماز میں چار زانو ہو کر بیٹھتی تھیں۔ [7]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ چار زانو ہو کر بیٹھنے والی روایت ضعیف ہے۔

ایک صحابیہ اور ایک تابعی کا قول اصل کے مطابق ہے (یعنی مرد اور عورت کے بیٹھنے میں فرق نہیں ہے) اور چند تابعین اس بات کے قائل ہیں کہ جیسا آسان ہو ویسے بیٹھے۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل میں تو مرد اور عورت کے بیٹھنے میں فرق

[1] مسائل إمام أحمد، ص:71. [2] صفة صلاة النبي ﷺ، ص: 189. [3] صحيح البخاري، صفة الصلاة، معلقا في ترجمة الباب وذكر موصولا في التاريخ الصغير، ص: 223، ومصنف ابن أبي شيبة: 270/1. اس روایت کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ (صفة صلاة النبي ﷺ، ص: 189) [4] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1. [5] یہ تینوں اقوال مصنف ابن أبي شيبة: 271،270/1 میں ہیں۔ [6] مصنف ابن أبي شيبة: 271/1. یہ دونوں باتیں درحقیقت ایک ہی قول میں مذکور ہیں۔
[7] مصنف ابن أبي شيبة: 270/1، ومصنف عبد الرزاق: 138/3.

روا نہیں رکھا گیا (یعنی دو رکعت کے بعد حالتِ افتراش اور چار رکعت کے بعد حالت تورّک) لیکن اگر کوئی عورت آسانی کی خاطر دوسری طرح بیٹھے تو اس پر نکیر نہیں کرنی چاہیے۔ باقی رہا دائیں ہاتھ کی انگلیاں ملا کر رکھنا تو بروایت مصنف عبدالرزاق، نبی ﷺ اپنی بائیں ہتھیلی بائیں گھٹنے پر رکھتے تھے اور اپنی دائیں ہتھیلی کی تمام انگلیاں مٹھی کی شکل میں موڑ کر رکھتے تھے اور اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا کرتے تھے۔ [1]

اس حدیث سے دائیں اور بائیں ہاتھ کی ہیئت کا فرق معلوم ہوتا ہے، یعنی دائیں ہاتھ کو مٹھی بنا کر اور بائیں ہاتھ کی انگلیاں کھول کر رکھتے تھے، انگلیوں کو جوڑ کر رکھے یا کھلا رکھے، اس کی تصریح نہیں ہے، نہ مردوں کے لیے نہ عورتوں کے لیے، اس لیے اس ہیئت کو عورتوں کے ساتھ مخصوص کرنا بلا دلیل ہے۔

(15) ''نماز میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو مردوں کی طرح سبحان اللہ نہ کہے بلکہ تالی بجائے، یعنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے۔''

ایسا کرنا سہل بن سعد الساعدی سے مروی حدیث سے ثابت ہے [2] گو اس کا تعلق ہیئت صلاۃ سے نہیں ہے بلکہ یہ ان چیزوں میں داخل ہے جو امام کی غلطی کو ٹوکنے کے لیے بطور حادثہ نماز کے دوران میں کی جاتی ہیں۔

[1] بائیں ہتھیلی کو بائیں گھٹنے پر رکھنے کے الفاظ مجھے مصنف عبدالرزاق میں نہیں ملے، ہاں البائیں ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھنے کے الفاظ مرفوعاً مصنف عبدالرزاق (195/2) میں موجود ہیں۔ یہ الفاظ مسند احمد (318/4) میں بھی موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے تشہد میں گھٹنوں پر یا رانوں پر ہاتھ رکھنے کے بارے میں احادیث میں مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں جس کی تفصیل کتب احادیث میں ہے، لہٰذا جس مسنون طریقے سے بھی آدمی تشہد میں ہاتھ رکھ لے ٹھیک ہے۔ [2] صحيح البخاري، الجماعة والإمامة، حديث 684، وصحيح مسلم، الصلاة، حديث 421

(16) ''مردوں کی امامت نہ کرے۔''

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اگر مردوں میں کوئی قاری نہ ہو، جبکہ عورتوں میں قاریہ ہو تو کیا کرے؟

اس بارے میں کوئی حدیث یا اثرِ صحابی موجود نہیں لیکن تابعین میں سے قتادہ کہتے ہیں: ''اگر مرد قاری نہ ہو اور عورتیں اس کے ساتھ ہوں تو وہ آگے بڑھ کر امامت کرائے، عورت اس کے پیچھے قراءت کرے، جب وہ تکبیر کہے تو عورتیں اس کی تکبیر کے ساتھ رکوع اور سجدہ کریں۔''[1]

20-17 ''عورتوں کی جماعت مکروہ ہے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے، عورتوں کی جماعت ہو تو وسط میں کھڑی ہو، مردوں کی جماعت میں عورتیں پیچھے کھڑی ہوں۔''

پہلا اور دوسرا جز بلا دلیل ہے جبکہ تیسرا اور چوتھا صحیح ہے۔

احادیث و آثار ملاحظہ ہوں:

① **بروایت ریطہ**: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور صف میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتی تھیں۔[2]

② ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بابت بھی ایسا ہی منقول ہے۔[3]

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ورقہ کے لیے ایک مؤذن مقرر کر دیا تھا جو ان کے لیے اذان دیتا تھا اور انھیں حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کو فرض نماز پڑھائیں۔[4]

[1] مصنف عبدالرزاق: 141/3. [2] الطبقات الکبرٰی لابن سعد: 483/8، ومصنف عبدالرزاق: 141/3، ومصنف ابن أبي شيبة: 89/2، وسنن الدارقطني: 404/1، وسنن البيهقي: 131/3.
[3] مصنف ابن أبي شيبة: 88/2. [4] سنن أبي داود، الصلاة، باب إمامة النساء، حديث: 592، ومسند أحمد: 405/6.

امام کاسانی لکھتے ہیں:

''فی الجملہ عورت کا نماز کی امامت کرنا درست ہے۔ اگر عورتوں کی امامت کرائے تو جائز ہے لیکن ان کے درمیان کھڑی ہو، چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے عورتوں کو عصر کی نماز پڑھائی [1] اور ان کے درمیان کھڑی ہوئیں اور ام سلمہ نے بھی عورتوں کی امامت کرائی اور ان کے درمیان کھڑی ہوئیں۔ اور یہ اس لیے کہ ان کے لیے ستر مطلوب ہے اور اس طرح کرنا ان کے لیے زیادہ ساتر ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی جماعت مکروہ ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک ان کی جماعت مردوں کی جماعت کی طرح مستحب ہے اور اس بارے میں احادیث بھی مروی ہیں لیکن یہ سب اسلام کے ابتدائی زمانے میں تھا۔ عورتوں میں بھی جوان عورتوں کو جماعت کے لیے جانا جائز نہیں، وہ اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جوان عورتوں کو نکلنے سے روکتے تھے [2] اور اس لیے بھی کہ ان کا جماعت کے لیے نکلنا باعث فتنہ ہے اور فتنہ خود حرام ہے اور جو چیز حرام کا باعث ہو وہ بھی حرام ہے لیکن بوڑھی عورتوں کا جماعت کے لیے نکلنا جائز ہے۔'' [3]

اس ساری عبارت سے حنفیہ اور شافعیہ کا اختلاف ظاہر ہوا۔ ایک کے نزدیک عورتوں کی جماعت مکروہ ہے اور دوسرے کے نزدیک مستحب لیکن درج شدہ احادیث

[1] حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نماز عصر پڑھانے کا تذکرہ مجھے نہیں ملا۔ ہاں مطلقاً ان کا امامت کروانا ثابت ہے جیسا کہ چند روایات قبل اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ اسی طرح مذکورہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی آنے والی روایت کی بھی ابھی تخریج گزری ہے۔ [2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خواتین کو مسجد جانے سے روکنے کے متعلق مجھے کوئی روایت نہیں ملی بلکہ آپ کا یہ روکنا ثابت نہیں ہے جیسا کہ عنقریب روایت آ رہی ہے۔ [3] بدائع الصنائع (157/1)

کی رو سے عورتوں کی نماز کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ ابتدائے اسلام میں جائز تھا، پھر منسوخ ہوگیا۔ خود عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس حدیث کے راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھروں سے نہ روکو، وہ مسجد جائیں لیکن بغیر خوشبو کے۔'' ان کے ایک بیٹے بلال نے کہا: ہم تو انھیں ضرور منع کریں گے۔ تو انھوں نے اسے خوب برا بھلا کہا اور پھر کہا: میں تمھیں نبی ﷺ کی بات بیان کرتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم انھیں منع کریں گے۔ [1]

ایک آدمی نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں حاضر ہوا کرتی تھیں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! اور اسی لیے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''عورتوں کی بہترین صف آخری صف ہے اور بدترین صف پہلی صف ہے۔ مردوں کی بہترین صف اگلی صف ہے اور بدترین صف آخری صف ہے۔'' [2]

جہاں تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل کا تعلق ہے تو امام زہری بیان کرتے ہیں کہ عاتکہ بنت زید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں اور نماز مسجد میں پڑھا کرتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم! تم جانتی ہو کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے۔ انھوں نے کہا: میں اس وقت رکوں گی جب تم مجھے منع کرو گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں منع نہیں کرتا۔ راوی کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جس دن شہید کیا گیا وہ مسجد میں تھیں۔ [3]

[1] صحیح البخاري، صفة الصلاة، حدیث: 865، مختصراً وصحیح مسلم، الصلاة، حدیث: 442. [2] مصنف عبدالرزاق: 148/3. [3] مصنف عبدالرزاق: 148/3، یہ سند منقطع ہے کیونکہ زہری کا عاتکہ یا عمر رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا باوجود کراہت کے نہ روکنا ثابت ہے۔ اس کے متعلق ایک روایت صحیح بخاری (کتاب الجمعة، حدیث: 900) میں ہے لیکن اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کا نام نہیں ہے۔

البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج عورتوں کی حالت دیکھتے تو انھیں باہر نکلنے سے منع کر دیتے۔" [1]

اس قول سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خواہش کا اظہار ہو رہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عورتیں بن سنور کر آئیں تو یقیناً ان کا نہ صرف مسجدوں میں آنا بلکہ بازاروں میں جانا بھی صحیح نہیں ہوگا، البتہ اگر ڈھیلے ڈھالے لباس میں، باحجاب ہو کر، بغیر خوشبو لگائے آئیں تو انھیں روکنا بھی صحیح نہیں ہے۔

لیکن کیا یہ عجب تماشا ہے کہ ایک طرف تو عورتوں کو بربنائے فتنہ مطلق مسجد میں آنے سے روکا جائے لیکن وہی عورت دوکان کے اندر، بلا حجاب سیلز مین کی حیثیت سے کھڑی نظر آئے تو پیشانی پر شکن تک نہ آئے!!

(21) "جمعہ عورت پر فرض نہیں لیکن پڑھ لے تو صحیح ہوگا۔"

یہ بات صحیح ہے کہ عورتوں پر جمعہ فرض نہیں ہے لیکن اگر پڑھ لے تو بقول عبداللہ بن مسعود، [2] حسن بصری، ابراہیم نخعی اور قتادہ وغیرہم جائز ہوگا۔ [3]

(22) "عید کی نماز واجب نہیں۔"

بہتر تھا کہ یہ بھی بتا دیا جاتا کہ عیدین میں ان کا آنا مستحب ہے۔

بخاری و مسلم دونوں ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کرتے ہیں: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم عیدین میں لڑکیوں اور حائضہ عورتوں کو بھی لائیں تاکہ وہ خیر کے اس کام میں حاضر رہیں اور مسلمانوں کی دعا میں شریک رہیں لیکن حائضہ عورتیں

[1] مسند أحمد: 232/6، ومصنف ابن أبي شيبة: 383/2، ومصنف عبدالرزاق: 149/3، ومسند إسحاق بن راهويه: 427/2. [2] مسند ابن الجعد، ص: 37، ومصنف عبدالرزاق: 191/3، ومصنف ابن أبي شيبة: 109/2، وسنن البيهقي: 186/3. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 110/2

مصلے سے دور رہیں۔"[1]

اس روایت کو امام ابو حنیفہ سے منسوب مسند امام اعظم (بترتیب صدر الدین موسیٰ بن زکریا حصکفی) میں بھی جگہ ملی ہے۔[2]

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو عید میں لایا کرتے تھے۔[3]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت ہے کہ میں عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے موقع پر رسول کے ساتھ نکلا۔ آپ نے نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس آئے، انھیں وعظ و نصیحت کی اور انھیں صدقہ دینے کا حکم دیا۔"[4]

(23) "عورت ایام تشریق میں تکبیر بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتی۔"

اس جز کا تعلق نماز سے نہیں ہے۔ ایام تشریق (11۔ 12۔ 13 ذوالحجہ) میں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اور نمازوں کے بعد تکبیرات پڑھی جاتی ہیں۔ عورتیں جیسے عمرہ و حج کے احرام کے دوران تلبیہ دھیمی آواز سے پڑھتی ہیں ویسے ہی انھیں تکبیرات بھی اتنی آواز سے کہنی چاہئیں کہ ایک عورت کہے تو دوسری اسے سن سکے۔

(24) "عورت کو نماز فجر اجالے میں پڑھنا مستحب نہیں۔"

فجر کی نماز کا اول وقت میں پڑھنا مرد و عورت دونوں کے لیے یکساں ہے۔ افضل ہے کہ نماز اول وقت میں پڑھی جائے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم مومن عورتیں

[1] صحيح البخاري، الحيض، حديث: 324، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، حديث: 890.
[2] مسند أبي حنيفة: 365/1. [3] سنن ابن ماجه، إقامة الصلاة، حديث: 1309، ومصنف ابن أبي شيبة: 182/2. [4] صحيح البخاري، العلم، حديث: 98، وصحيح مسلم، صلاة العيدين، حديث: 884.

نبی ﷺ کے ساتھ صبح کی نماز میں اپنی اوڑھنیوں میں لپٹی ہوئیں، حاضر ہوا کرتی تھیں۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد اسی حالت میں اپنے گھر لوٹتی تھیں کہ اندھیرے کی وجہ سے انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ [1] گویا مسجد میں فجر منہ اندھیرے پڑھی جاتی تھی جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہوتے تھے۔

(25) ''عورت کو جہری نماز میں بلند آواز سے قراءت جائز نہیں، بعض کے نزدیک اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔''

یہ بات بھی بلا دلیل لکھی گئی ہے۔ عورت یا تو انفرادی نماز پڑھے گی یا مردوں کی جماعت کے ساتھ اور یا پھر عورتوں کی جماعت کے ساتھ۔

مردوں کی جماعت میں تو مرد امام ہی قاری ہوگا اور اگر عورتوں کی نماز علیحدہ سے ہو رہی ہو تو جہری نماز میں بہر صورت عورتوں کی امام عورت قراءت کرے گی اور یہ قراءت صرف عورتوں کے لیے ہوگی، اس لیے اس میں اونچی اور نیچی قراءت کی تفریق بے معنی ہے اور اگر انفرادی نماز پڑھ رہی ہے تو مردوں کی انفرادی نماز کی طرح اسے اختیار ہے، چاہے جہری قراءت کرے یا سری۔

(26) پہلے بیان ہو چکا ہے۔

(27) ''عورت اذان نہ دے اور نہ مسجد میں اعتکاف ہی کرے۔''

اس ضمن میں دونوں طرح کے آثار ملتے ہیں۔

صحابہ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ [2] اور تابعین میں سے عطاء، حسن بصری، سلیمان،

[1] صحيح البخاري، مواقيت الصلاة، حديث: 578، وصحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، حديث: 645.
[2] مصنف ابن أبي شيبة: 223/1

زہری، مجاہد اور ضحاک کہتے ہیں کہ عورتوں کے لیے اذان اور اقامت دونوں مشروع نہیں ہیں۔ [1]

دوسری طرف صحابہ میں سے جابر، [2] ابن عمر [3] اور عائشہ رضی اللہ عنہم [4] عورتوں کے لیے اذان اور اقامت کے قائل ہیں، تابعین میں سے طاؤس، کیسان، حفصہ بنت سیرین اور سالم بھی ان کے ہمنوا ہیں، [5] اس لیے اس امر میں وسعت ہے۔

جہاں تک اعتکاف کا تعلق ہے تو اعتکاف اصلاً مسجد ہی میں کیا جاتا ہے ﴿وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ﴾ [6]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی بعض بیویوں نے اعتکاف کیا، وہ استحاضہ کی حالت میں تھیں اور بعض اوقات اپنے نیچے بڑا سا برتن رکھتی تھیں۔ [7]

امام شوکانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ مستحاضہ عورت مسجد میں ٹھہر سکتی ہے، اس کا اعتکاف اور نماز دونوں درست

[1] مصنف ابن أبي شيبة: 223,222/1، ومصنف عبدالرزاق (127/3) اس میں جہاں تک سلیمان کے قول کا تعلق ہے تو اس کے بیان میں ڈاکٹر صاحب سے خطا ہوئی ہے۔ یہ سلیمان کا قول نہیں ہے بلکہ سلیمان حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ہم ان سے پوچھتے تھے کہ کیا عورتوں پر بھی اذان واقامت ہے تو وہ فرماتے: نہیں! اور اگر وہ اذان واقامت کہہ لیں تو یہ ذکر ہوگا۔ (مصنف ابن أبي شيبة: 223/1) [2] مصنف ابن أبي شيبة: 223/1. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 223/1. [4] مصنف ابن أبي شيبة: 223/1، ومصنف عبدالرزاق: 126/3. [5] ان تابعین کے اقوال میں سے حفصہ بنت سیرین اور سالم رحمہ اللہ کے اقوال مصنف ابن أبي شيبة: 223/1 میں ہیں۔ اور طاؤس اور کیسان رحمہ اللہ کے اقوال مجھے نہیں مل سکے۔ [6] البقرة 2:187. [7] صحيح البخاري، الحيض، حديث: 309.

ہیں اور اگر مسجد کے ملوث ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی عورت کا اپنی ناپاکی کے ساتھ مسجد میں رہنا جائز ہے اور یہی حکم ہے اس شخص کا جس کی ناپاکی دائم ہو یا جس کے زخم سے خون بہہ رہا ہو۔[1]

الحمدللہ اس موضوع کی تمام جزئیات کا احاطہ ہوگیا اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ مذکورہ 27 باتوں میں سے کون سی بر بنائے دلیل جائز ہیں اور کون سی بلا دلیل ہیں۔ واللہ الموفق۔

نماز میں قرآن سے دیکھ کر پڑھنا

سوال کیا نماز کی حالت میں قرآن سے دیکھ کر پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب نماز کی حالت میں قرآن سے دیکھ کر پڑھنے کے بارے میں تفصیل ملاحظہ ہو:

امام احمد سے پوچھا گیا کہ قیام رمضان کے دوران مصحف میں دیکھ کر پڑھنے میں حرج تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا! نہیں۔ ان سے پوچھا گیا اور فرض میں؟ تو انھوں نے کہا: نہیں۔ اس بارے میں میں نے کوئی چیز نہیں سنی۔ امام احمد سے دوسری روایت ہے کہ قیام میں بھی اسی صورت میں پڑھے جبکہ اس کے بغیر چارہ نہ ہو، (یعنی مجبوراً پڑھے) قیام رمضان میں دیکھ کر پڑھنے کے قائلین میں سے زہری، عطاء، صالح بن یحیٰی انصاری، حسن بصری اور ابن سیرین شامل ہیں، جو کہ سب کے سب تابعین میں سے ہیں لیکن دوسرے تابعین، جن میں سعید بن مسیب، مجاہد، ابراہیم، سلیمان بن حنظلہ اور ربیع شامل ہیں، اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔[2]

حسن بصری کا ایک قول یہ بھی ہے، جو بھی قرآن یاد ہو اسے پڑھتے رہو لیکن مصحف

[1] نيل الأوطار: 5/28. [2] مصنف ابن أبي شيبة: 2/337-339، ومصنف عبدالرزاق: 4204، وكتاب المصاحف لابن أبي داود، ص: 449-462.

سے نہ پڑھو[1] کیونکہ اس طرح خشوع پر اثر ہوتا ہے اور سجدہ کی جگہ کو دیکھنے میں خلل واقع ہوتا ہے، جہاں تک فرض نماز میں پڑھنے کا تعلق ہے تو امام احمد کا قول دیا جا چکا ہے۔

بہر صورت فرض نماز میں پڑھنا علی الاطلاق مکروہ ہے کیونکہ عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایسے آدمی کی نماز باطل ہو جاتی ہے کیونکہ یہ عمل طویل ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ ہمیں امیر المومنین نے مصحف سے دیکھ کر نماز پڑھنے سے منع کیا تھا اور یہ کہ صرف بالغ ہی نماز پڑھائے۔[2]

قیام رمضان میں مصحف سے پڑھنے پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکوان مصحف سے دیکھ کر انھیں قیام رمضان میں امامت کرایا کرتے تھے۔[3]

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حافظ صاحب ہمیشہ قرآن سے دیکھ کر پڑھاتے ہیں اور لوگوں کو یہ تأثر دیتے ہیں کہ ان کا حفظ اتنا عمدہ ہے کہ وہ ایک غلطی بھی نہیں کرتے تو یہ دو لحاظ سے ناجائز ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ صریحاً ریاکاری ہے اور ریا شرک اصغر میں داخل ہے۔ دوسرے یہ کہ نمازیوں کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''جو ہمیں دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں۔''[4] دھوکا اس لحاظ سے کہ نمازیوں کو جان بوجھ کر یہ تأثر دیا جا رہا ہے کہ حافظ کا حفظ اتنا اچھا ہے کہ وہ ایک غلطی بھی نہیں کرتا حالانکہ وہ حفظ سے نہیں پڑھ رہا ہے۔ یہ اس آیت کے زمرے میں بھی آ جاتا ہے:

﴿وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا﴾

''اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ایسے کاموں پر کی جائے جو انھوں

[1] كتاب المصاحف، ص: 450. [2] كتاب المصاحف، ص: 449. [3] صحيح البخاري، الجماعة والإمامة، معلقا، ووصله ابن أبي شيبة في المصنف: 338/2. [4] صحيح مسلم، الإيمان، حديث: 101.

نے نہیں کیے۔"[1]

اپنی مادری زبان میں دوران نماز دعا کرنا

سوال کیا نماز میں ہم اپنی زبان میں دعا کر سکتے ہیں؟

جواب نماز کے اندر تین مواقع پر دعا کرنا مستحب ہے: دوران سجدہ، دو سجدوں کے درمیان بیٹھتے وقت اور تشہد کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے لیکن یہ دعائیں ماثورات میں سے ہونی چاہئیں، یعنی وہ دعائیں جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور ظاہر ہے وہ سب عربی میں ہیں۔ بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ اپنی زبان میں بھی دعا کی جا سکتی ہے لیکن مجھے اس کی دلیل نہیں ملی۔ واللہ اعلم۔

جمعہ کے وقت عیسائی ملازم کو خرید و فروخت کے اسٹال پر کھڑا کرنا

سوال اسکپٹن سے ایک قاری لکھتے ہیں کہ مارکیٹ میں ہم اسٹال لگاتے ہیں۔ جمعہ کے دن ہم اسٹال بند تو نہیں کرتے مگر نماز کے وقت ایک انگریز لڑکے کو نگرانی کے لیے چھوڑ کر نماز کے لیے چلے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ لڑکا ویسے بھی اسٹال پر سارا دن کام کرتا ہے مگر بعض ساتھیوں کا کہنا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی طرح حیلہ سازی ہے بلکہ جمعہ کی نماز کے وقت ہمیں اپنا اسٹال مکمل بند رکھنا چاہیے۔ براہ کرم اس کے جواز یا عدم جواز سے آگاہ فرمائیے؟

جواب نماز کے لیے اصلاً ایک مسلمان مکلف ہے، جمعہ کی نماز کے خصوصی احکامات میں سے یہ ہے کہ مسجد میں حاضری دی جائے اور کاروبار چھوڑ دیا جائے جیسا کہ اللہ

[1] آل عمران 188/3

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○﴾

''اے ایمان والو! جب تمھیں جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''[1]

اگر ایک مسلمان اپنی تجارت چھوڑ کر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد پہنچ جاتا ہے تو یہ دونوں باتیں پوری ہوگئیں، ایسی صورت میں کسی غیر مکلف شخص کو دوکان پر چھوڑ دینے سے مذکورہ حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

بعد از اذان وسیلے کے متعلق دعا سے مراد

سوال اذان کے بعد والی دعا میں رسول اکرم ﷺ کے لیے وسیلہ اور فضیلت کی دعا مانگی جاتی ہے، اولاً وسیلہ سے یہاں کیا مراد ہے؟ (قاری عبدالسمیع، بر منگھم)

جواب وسیلہ کی تعریف خود نبی ﷺ نے فرما دی ہے کہ وہ جنت کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے جو سب سے اونچی اور سب سے بڑی ہے۔

اور فضیلت یا تو وسیلہ ہی کے لیے بطور وضاحت آیا ہے یا اس سے مراد ہے وہ اونچا درجہ جو تمام مخلوقات میں سے صرف آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوگا۔

اور اس دعا میں ایک تیسری چیز کا بھی تذکرہ ہے اور وہ ہے آپ ﷺ کے لیے مقام محمود مانگنا اور اس سے مراد وہ مقام ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

[1] الجمعة 62:9.

اور یہ مقام ہے مقام شفاعت اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے ان تمام لوگوں کے لیے شفاعت کریں گے جو شرک کے مرتکب نہیں ہوئے ہوں گے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مؤذن کو سنو تو وہی الفاظ کہو جو وہ کہہ رہا ہے، پھر میرے اوپر درود بھیجو، وہ اس لیے کہ جو مجھ پر ایک دفعہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے، پھر میرے لیے وسیلہ مانگو کیونکہ وہ جنت میں ایک ایسا مقام ہے جو اللہ کے بندوں میں سے کسی ایک کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ میں ہی وہ بندہ ہوں گا تو جو شخص میرے لیے وسیلہ طلب کرے گا، اس کے لیے میری شفاعت ثابت ہو جائے گی۔[1]

اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ اصل مقصود امت کی بہتری ہے کہ اللہ کے رسول کے لیے مذکورہ دعا کرنے پر خود امتی کا بھلا ہوگا کہ وہ اللہ کے رسول کی شفاعت کا مستحق ٹھہرے گا۔

اللہ کے رسول تو ہماری دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں لیکن ہم ہر اس چیز کے محتاج ہیں کہ جس سے ہمارے گناہ معاف ہوں۔ ہمارا جنت میں جانا آسان ہو اور یوں اللہ کے رسول نے ہمیں ان تمام باتوں کے حصول کے لیے راستہ بتا دیا کہ ہم اذان کے بعد مذکورہ طریقے پر دعا کریں تاکہ اللہ کے رسول کی شفاعت کے مستحق ٹھہریں۔

قریبی مسجد میں اگر بے وقت (وقت سے پہلے یا بعد میں) جماعت ہوتی ہو تو آدمی کیا کرے؟

سوال میرے گھر سے قریبی مسجد میں نماز عشاء مغرب سے ایک گھنٹہ بعد ادا کر لی

[1] صحیح مسلم، الصلاۃ، حدیث 384

جاتی ہے۔ اسی طرح نماز عصر سورج کے زردی مائل ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ کیا ان نمازوں کا ایسی مسجد میں ادا کرنا شرعاً درست ہوگا جبکہ عشاء کا وقت شروع ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی ہو؟

جواب عصر کی نماز کا وقت ایک مثل[1] پر ہو جاتا ہے، یعنی زوال کے بعد جب کسی بھی چیز کا سایہ اس کے برابر ہو جائے، اس وقت ظہر کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور عصر کا شروع ہو جاتا ہے۔ عصر کا اول وقت میں پڑھنا افضل ہے اور اتنی تاخیر کرنا کہ سورج زردی[2] مائل ہو جائے مکروہ ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ایسی نماز کو منافق کی نماز قرار دیا ہے۔

احناف کے نزدیک عصر کا وقت دو مثل پر ہوتا ہے، اس لیے وہ عموماً تاخیر سے پڑھتے ہیں لیکن پھر بھی منافقت کے وصف سے بچنے کے لیے زیادہ تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر آپ کسی مسجد میں اول وقت باجماعت نماز پڑھ سکتے ہوں یا اہل خانہ کے ساتھ مل کر اول وقت نماز پڑھ لیں تو بہتر ہوگا لیکن اگر بڑی جماعت کا ثواب لینے کے لیے محلے کی مسجد میں نماز پڑھ لیں جہاں مثل ثانی کے مطابق نماز ہوتی ہو تو ان شاء اللہ

[1] سایہ ایک مثل ہونے سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ اس کے سایہ اصلی کو نکالنے کے بعد اس چیز کے برابر ہو جائے۔ سایہ اصلی ہر چیز کے اس سایے کو کہتے ہیں جو آفتاب کے بلند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے زوال کے وقت باقی رہ جاتا ہے، یعنی عین زوال کے وقت جو کسی چیز کا سایہ ہوتا ہے وہ اس کا سایہ اصلی کہلاتا ہے۔ سایہ اصلی سردیوں میں لمبا اور گرمیوں میں چھوٹا ہوتا ہے۔ جب کسی چیز کا سایہ اس کے سایہ اصلی کے علاوہ اس کے برابر ہو جائے تو اسے ایک مثل سایہ کہتے ہیں، مثلاً: ایک چھڑی 3 فٹ لمبی ہے، اس کا سایہ اصلی 2 انچ ہے تو جب اس چیز کا سایہ 3 فٹ دو انچ ہوگا تو ایک مثل وقت ہو جائے گا اور یہ عصر کا وقت ہے۔ اس کی وضاحت سنن نسائی کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ دیکھیے: (سنن النسائي، المواقيت، باب آخر وقت المغرب، حديث: 525) (ناصر)

[2] صحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، حديث: 622.

ثواب سے محروم نہ رہیں گے کہ اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔

جہاں تک عشاء کی نماز کے وقت کا تعلق ہے تو وہ شفق کے غائب ہوجانے کے بعد ہوتا ہے۔ شفق سے مراد افق پر سرخی کا ہونا ہے۔ یو۔ کے میں مشاہدہ کے مطابق شفق سوا گھنٹے سے لے کر ڈیڑھ گھنٹے تک غائب ہوجاتی ہے۔ مئی، جون، جولائی میں اس سے زیادہ وقت بھی لگتا ہے، اس لیے نماز عشاء مغرب سے کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بعد ادا کی جائے، اس سے قبل نہیں۔ چونکہ نماز وقت سے قبل جائز نہیں، اس لیے مذکورہ مدت کا لحاظ کر کے نماز پڑھیں۔

مسجد کا ہمسایہ اذان نہ سنے تو اس کے لیے باجماعت نماز کا حکم

سوال وہ شخص جو مسجد کے پڑوس میں رہتا ہے مگر اذان نہیں سن پاتا۔ کیا اس پر مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ضروری ہے؟

جواب نبی ﷺ سے عبداللہ بن ام مکتوم نے اپنے نابینا ہونے کی بنا پر گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت چاہی تھی۔ نبی ﷺ نے ان کے عذر کو دیکھتے ہوئے اجازت دے دی تھی لیکن پھر پوچھا کہ کیا اذان کی آواز سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں، آنحضور ﷺ نے کہا تو پھر اجازت نہیں۔[1]

یہ تو اس صورت میں ہے کہ اذان مسجد کے چبوترے یا مینار سے دی جاتی ہو اور ایک خاص حد تک اذان کی آواز کانوں میں پڑتی ہو۔

برطانیہ میں عموماً لاؤڈ اسپیکر سے اذان دینے کی اجازت نہیں ہے۔ کہیں کہیں اجازت دی گئی ہے لیکن وہ بھی دن کی نمازوں کی۔ اکثر مساجد میں اذان کی آواز مسجد

[1] صحیح مسلم، المساجد ومواضع الصلاۃ، حدیث: 653، وسنن أبي داود، الصلاۃ، حدیث: 552.

کی چار دیواری تک محدود رہتی ہے، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ مسلمان (مراد بالغ مرد افراد ہیں) جو مسجد کے قریب رہتا ہو اور اگر اذان مسجد کے باہر دی جائے تو بآسانی سن سکتا ہو، مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کا پابند ہے۔ جو لوگ دور رہتے ہیں، گو ان پر واجب نہیں ہے لیکن جماعت کی نماز کا ثواب حاصل کرنے کے لیے انھیں گاڑی پر بھی آنا پڑے تو انھیں آنا چاہیے۔ جب ہم اپنی دوسری ضروریات، دکانداری، خرید و فروخت کے لیے گاڑی استعمال کرسکتے ہیں تو نماز کی حاضری کے لیے اسے استعمال کیوں نہ کریں؟

باجماعت نماز کی فضیلت بلکہ وجوب پر مندرجہ ذیل اور دو احادیث ذکر کی جاتی ہیں:

① نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ نوجوانوں سے کہوں کہ ایندھن اکٹھا کریں، پھر میں نماز کھڑی کرنے کا حکم دے کر ان لوگوں کے گھر جلادوں جو نماز کے لیے نہیں آتے۔''[1]

لیکن آپ نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ گھروں میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جن پر جماعت سے نماز پڑھنا واجب نہیں ہے، جیسے خواتین، بچے، عمر رسیدہ، ضعیف یا بیمار مرد۔

② آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا صَلَاةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ إِلَّا فِي الْمَسْجِدِ» ''مسجد کے پڑوسی کی نماز نہیں ہوتی سوائے مسجد کے۔''[2]

اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ﴾ ''نماز قائم کرو''[3] سے بھی جماعت سے نماز ادا کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ صَلُّوا نماز پڑھو بلکہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا اور نماز کے قیام میں اذان کا اہتمام کرنا، مساجد قائم کرنا، باجماعت نماز پڑھنا سب داخل ہیں۔

[1] صحیح البخاري، الأذان، حدیث: 644، وصحیح مسلم، المساجد، حدیث: 651۔ [2] سنن البیهقي: 57/3، والمستدرك للحاکم: 246/1، والضعیفة: 332/1، حدیث: 183۔ [3] البقرة 43:2۔

ہکلے امام کی اقتدا میں نماز پڑھنا

سوال ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا کیا شرعاً جائز ہے، جس کی زبان میں لکنت ہو اور جو تجوید کے عام قواعد سے ناواقف ہو؟

جواب اصل میں تو امام ایسے شخص کو بنایا جائے جو متقی اور پرہیز گار ہو اور قرآن کا سب سے زیادہ پڑھنے والا ہو۔ نبی ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

«يَؤُمُّهُمْ أَقْرَءُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ» [1]

''امامت وہ کرائے جو کتاب اللہ کو زیادہ پڑھنے والا ہو۔''

ظاہر ہے کہ جس کا حفظ زیادہ ہوگا وہ قرآن کو زیادہ پڑھے گا۔

مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث میں زیادہ عمر والے کا تذکرہ ہے [2] اور یہ اس وقت ہے کہ اگر امامت کے اہل افراد میں سارے ہی ایک جیسا حفظ رکھتے ہوں۔ قراءت بھی صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے والے ہوں تو ان میں سب سے بزرگ شخص کا انتخاب کیا جائے گا۔

''قاری قرآن'' اسی کو کہا جاتا ہے جو قرآن کو صحیح تلفظ اور قواعد تجوید کے مطابق پڑھتا ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ڈرائیوروں کی اصطلاح اس شخص کے لیے مخصوص ہے جو باقاعدہ ڈرائیونگ کا لائسنس رکھتا ہو۔ آپ اپنی کار چلانے کے لیے بہترین ڈرائیور کا انتخاب کرتے ہیں، ایک سیکھنے والے شخص کو ڈرائیور کے طور پر نہیں رکھتے ہیں۔ نماز تو

[1] صحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، حديث: 673، والمعجم الكبير للطبراني 218/17 واللفظ له. [2] صحيح البخاري، الجهاد، حديث: 2848، وصحيح مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، حديث: 674.

ایک بہت ہی اعلیٰ و ارفع عبادت ہے، اس کے لیے مساجد کمیٹی کو حافظ اور قاری کا انتخاب کرنا چاہیے۔ کسی مسجد میں اگر ایسا امام مقرر کیا جا چکا ہو جس کی زبان میں لکنت ہو یا وہ تجوید کے قواعد کی پابندی نہ کرتا ہو تو احسن طریقے سے اسے بدلنے کی کوشش کی جائے، بدرجہ مجبوری اس کے پیچھے نماز ہو جائے گی۔ وہ ایسے ہی جیسے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«صَلُّوا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ» ''ہر نیک و بد کے پیچھے نماز پڑھ لو۔'' [1]

اس حکم کا منشا یہ نہیں کہ ایک بد اخلاق، بد سیرت شخص کو امام بنایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مصلے پر ایسا شخص مسلط ہو گیا ہے تو فتنہ و فساد سے بچنے کے لیے اس کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہیے، جیسے صحابہ اور کئی تابعین حجاج بن یوسف جیسے ظالم و سفاک شخص کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ اگر وہ اس کو تبدیل کرنے پر قادر ہوتے تو یقیناً ایسا کر ڈالتے لیکن بہر صورت اسے دل سے برا جانتے رہے جو کہ منکر کے بدلنے کا تیسرا درجہ ہے۔ میری مراد حدیث رسول ﷺ ہے: ''تم میں سے جو شخص منکر کو دیکھے تو اسے ہاتھ سے بدل دے، نہ کر سکے تو زبان سے فہمائش کرے، اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' [2]

عورت کا نفل نماز (تراویح اور نماز تسبیح وغیرہ) کی امامت کروانا

سوال کیا عورت نفل نماز کی امامت کر سکتی ہے؟ مثلاً: صلاۃ التسبیح یا رمضان کی راتوں

[1] السنن الکبرٰی للبیهقي: 19/4، یہ حدیث ضعیف ہے۔ دیکھیے: ضعیف أبي داود الألباني: 208/1-210، حدیث: 94۔ لیکن مذکورہ بالا مقصود ایک دوسری حدیث سے پورا ہو جاتا ہے، جس میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ائمہ تمھیں نماز پڑھاتے ہیں۔ اگر وہ صحیح پڑھائیں تو تمھاری نماز ہو جائے گی اور اگر وہ غلطی کریں تو تمھاری نماز ہو جائے گی اور (ان کی خطا) ان کے خلاف ہو گی۔'' (صحیح البخاري، الأذان، حدیث: 694)

[2] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 49

میں نماز تراویح کی امامت؟

جواب مساجد میں باجماعت نماز مردوں پر واجب ہے۔ عورتیں مسجد میں آ کر جماعت میں شریک ہو سکتی ہیں، گو گھروں میں ان کی نماز بہتر ہے اور اگر گھر میں عورتیں باجماعت نماز پڑھنا چاہیں، چاہے وہ فرض نماز ہو یا تراویح (جو کہ سنت مؤکدہ ہے) تو ایسا کر سکتی ہیں لیکن عورتوں کی امام صف کے درمیان میں کھڑی ہوگی۔

صلاۃ التسبیح کی مشروعیت ہی میں اختلاف ہے۔ سنن ابی داود میں ابن عباس سے یہ حدیث مروی ہے، جس میں صلاۃ التسبیح کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ ● اس حدیث پر یہاں تفصیلاً گفتگو مقصود نہیں۔ خلاصہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ حدیث ایک راوی موسیٰ بن عبدالعزیز کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہ حدیث مختلف طرق سے انہی ایک راوی سے منقول ہے، اس لیے اسے منکر بھی کہا گیا ہے۔ حدیث کا متن بھی شاذ ہے، یعنی اس نماز کی ہیئت ترکیبی باقی تمام نمازوں سے جدا ہے۔ گو کئی علماء اس حدیث کو حسن کا درجہ بھی دیتے ہیں اور اس بنا پر اس کے قائل بھی ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ حدیث سند اور متن دونوں کے اعتبار سے قابل اعتماد نہیں۔

محدثین میں سے ابن جوزی نے تو اس حدیث کو موضوع تک لکھ دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ روایت سراسر جھوٹ ہے۔ امام احمد اور ان کے اصحاب اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔ کسی بھی امام نے اسے مستحب نہیں سمجھا۔ امام ابو حنیفہ، مالک اور شافعی نے تو اس کے بارے میں سنا تک نہیں۔

● سنن أبي داود، التطوع، حديث:1297.

ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنا

سوال ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب نماز کے بعد کے اذکار میں آیۃ الکرسی، سورۂ اخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا پڑھنا مشروع ہے۔ ابو امامہ خزرجی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اسے سوائے موت کے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔''[1]

ویل چیئر پر مسجد آنا

سوال بعض معذور حضرات ویل چیئر (پہیہ دار کرسی) پر مسجد میں نماز کے لیے آتے ہیں، اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب مساجد کو پاک صاف رکھنا ایک بنیادی حکم ہے اور مذکورہ اقسام کی کرسی کا مسجد میں لانا اصلاً جائز ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے کہ آج کل مساجد میں قالین بچھائے جاتے ہیں اور مذکورہ کرسی کے پہیے چاہے پاک ہی کیوں نہ ہوں، اپنے ساتھ کچھ گرد و غبار، مٹی اور رطوبت ضرور لاتے ہیں، اس لیے مسجد کے ذمہ دار حضرات اس بات کا اہتمام کریں کہ ایک طرف تو معذور افراد کی دلجوئی کی جائے اور دوسری طرف ان کی سواری کی صفائی کا پورا بندوبست کیا جائے تاکہ مسجد کا قالین صاف رہے۔ مسجد کے ذمہ دار حضرات نگہبان کی حیثیت رکھتے ہیں اور نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق

[1] السنن الکبریٰ للنسائي: 30/6

انھیں مسجد میں حاضر ہونے والوں کی پوری پوری نگہداشت کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»

”تم میں سے ہر شخص نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“[1]

---

[1] صحیح البخاری، الجمعة، حدیث: 893، وصحیح مسلم، الإمارة، حدیث: 1829

جنازے
کے مسائل

رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ

سوال مسعود احمد دریافت کرتے ہیں کہ عموماً یہ سنا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔ اگر پڑھا بھی گیا ہے تو انفرادی طور پر! اس سلسلے میں مکمل رہنمائی فرمائیں۔

جواب ابن کثیر رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق کی سند سے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ انتقال فرما گئے تو سب سے پہلے مردوں کو (آپ کے حجرہ میں) داخل کیا گیا، جنھوں نے بغیر کسی امام کے متفرق طور پر آپ ﷺ پر نماز پڑھی، پھر جب مرد فارغ ہو گئے تو عورتوں کو داخل کیا گیا اور انھوں نے نماز پڑھی، پھر بچوں کو داخل کیا گیا، جنھوں نے نماز پڑھی، پھر غلام داخل کیے گئے اور انھوں نے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھی، رسول اللہ ﷺ پر نماز پڑھتے وقت کسی نے امامت نہیں کرائی۔[1]

ابن کثیر نے بیہقی کی ایک روایت بھی درج کی ہے جس کے راوی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ جس میں رسول اللہ ﷺ کی وفات سے قبل آپ کی وصیت کا ذکر ہے اور اس وصیت میں نماز جنازہ کے بارے میں آپ کو یہ وصیت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جب تم لوگ مجھے غسل دے چکو، خوشبو (حنوط) مل چکو اور کفن پہنا چکو تو پھر مجھے میری قبر کے پاس رکھ دینا اور ایک گھڑی کے لیے باہر چلے جانا، وہ اس لیے کہ مجھ پر

[1] سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث: 1628، والسنن الكبرى للبيهقي: 30/4، والبداية والنهاية 285/5.

سب سے پہلے میرے دو دوست اور میرے ہم نشین جبرائیل اور میکائیل نماز پڑھیں گے، پھر اسرافیل، پھر فرشتۂ موت اور ان کے ساتھ فرشتوں کا انبوہ ہوگا۔ مجھ پر پہلے میرے اہل بیت میں سے مرد نماز پڑھیں، پھر ان کی عورتیں، پھر تم لوگ فوج در فوج اکیلے اکیلے داخل ہونا۔ مجھے ان عورتوں سے تکلیف نہ پہنچانا جو واویلا کریں یا بین کریں یا چیخ و پکار کریں۔ میرے صحابہ میں سے جو غائب ہوا سے میری طرف سے سلام پہنچانا۔ [1]

لیکن پھر لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی سلام بن مسلم جنھیں ابن سلیم یا ابن سلیمان بھی کہا جاتا ہے، علی بن مدینی، احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، بخاری، ابو حاتم، ابوزرعہ، ابراہیم جوزجانی، نسائی اور کئی دوسرے محدثین کے نزدیک ضعیف راوی ہے، بلکہ بعض ائمہ نے تو انھیں جھوٹا بھی قرار دیا ہے اور کئی نے ان کی روایت قبول نہیں کی۔

پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ محدث ابوبکر بزار نے اس روایت کو سلام بن مسلم کے بجائے دوسرے راویوں سے بھی روایت کیا ہے۔ [2]

بہر حال اس روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ لوگ علیحدہ سے نماز پڑھیں اور ایک اضافی بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ فرشتوں نے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھی۔ [3]

قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے طبری سے یہ نقل کیا ہے کہ چونکہ حجرہ مبارکہ تنگ تھا، اس لیے دس دس شخص اندر جاتے، جب وہ فارغ ہو کر باہر آتے تب اور دس اندر جاتے۔ یہ سلسلہ لگاتار شب و روز جاری رہا، اس لیے تدفین مبارک شب چہار شنبہ کو، یعنی رحلت سے تقریباً 32 گھنٹے بعد عمل میں آئی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. [4]

[1] مستدرک حاکم: 62/3، ودلائل النبوة للبیهقي: 345/8. [2] مسند البزار: 320/1. [3] البداية والنهاية: 293,292/5. [4] رحمة للعالمین: 253/1.

آپ ﷺ پر انفرادی نماز جنازہ کی حکمت یہ ہوسکتی ہے کہ جس طرح ہر شخص کو رسول اکرم ﷺ پر انفرادی طور پر درود و سلام پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح وہاں موجود اشخاص کو بھی انفرادی طور پر آپ کی نماز جنازہ پڑھنے کا موقع فراہم ہو۔[1] (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ)

زوجین کا وفات کے بعد ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا اور غسل دینا

سوال میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو کیا زوجین کا رشتہ باقی نہیں رہتا؟ کیا متوفی یا متوفیہ کا چہرہ دیکھنا یا مرنے کے بعد ایک دوسرے کو غسل دینا جائز نہیں ہے؟ عموماً ہمارے معاشرے میں انتقال سے طلاق، علیحدگی اور اجنبیت کے واقع ہونے کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اگر دنیا میں ان کے درمیان تفریق ہوجاتی ہے جبکہ وہ دونوں نیک تھے تو پھر قیامت میں وہ دونوں ایک ساتھ رہیں گے یا نہیں؟ قرآن حکیم میں کئی جگہ یہ ہے کہ وہ جوڑے جوڑے جنت میں ہوں گے، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب اگر زوجین ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہوں تو چہرہ دیکھنا بالاولی جائز ہے۔ مرد اپنی بیوی کو اور بیوی اپنے شوہر کو غسل دے سکتی ہے۔ اس بارے میں مولانا عزیز

[1] اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے امام ترمذی نے شمائل محمدیہ میں ذکر کیا ہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اکرم ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی تو انھوں نے فرمایا کہ ہاں۔ لوگوں نے پوچھا کس طرح؟ انھوں نے فرمایا: کچھ لوگ داخل ہوں وہ تکبیر کہیں، درود پڑھیں اور پھر دعا کر کے باہر آجائیں۔ اس کے بعد پھر دوسرا گروہ اندر جائے یہاں تک کہ تمام لوگ ایسا کریں۔ (مختصر الشمائل المحمدیة بتحقیق الألباني، ص: 200) میں اسی شکل میں نماز پڑھنے کا ذکر ہے۔

زبیدی کا مرتب کردہ فتویٰ ملاحظہ ہو:

خاوند بیوی کا ایک دوسرے کو غسل دینا: اس مسئلہ پر تو اجماع ہے کہ جو شوہر مرجائے تو عورت اسے غسل دے سکتی ہے۔

نَقَلَ ابْنُ الْمُنْذِرِ وَغَيْرُهُ الْإِجْمَاعَ عَلَى جَوَازِ غُسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا [1]

قَالَ الشَّاهْ وَلِي اللهِ: وَاتَّفَقُوا عَلَى جَوَازِ غُسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا. [2]

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب فوت ہوئے تو آپ کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیس نے صحابہ کی موجودگی میں غسل دیا، پھر باہر نکلیں۔[3] اور اس کی وصیت خود حضرت ابوبکر نے کی تھی۔[4]

حضرت جابر بن زید نے اپنی بیوی کو وصیت کی تھی کہ وہ انھیں غسل دے۔[5]

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو ان کی اہلیہ نے غسل دیا تھا۔

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابوسلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مرد فوت ہو جائے تو اس کی اہلیہ اسے غسل دے۔[6]

حضرت عطاء فرماتے ہیں: بیوی اپنے خاوند کو غسل دے۔[7]

ہاں اس امر میں اختلاف ہے کہ مرد اپنی بیوی کو غسل دے یا نہ؟ احناف اسے جائز نہیں سمجھتے مگر یہ بات محل نظر ہے کیونکہ یہ بات صحیح حدیث کے خلاف ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''اگر تمھارا مجھ سے پہلے انتقال ہوگیا تو

[1] التعليق الممجد، ص: 129. [2] مسوّیٰ شرح موطا: 190/1. [3] مصنف ابن أبي شيبة: 249/3.
[4] مصنف ابن أبي شيبة: 249/3. یہ روایت حسن ہے۔ [5] مصنف ابن أبي شيبة: 250/3.
[6] مصنف ابن أبي شيبة: 250/3 [7] مصنف ابن أبي شيبة: 250/3.

میں تمہیں غسل بھی دوں گا اور کفن بھی پہناؤں گا۔'' (1)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر وہ بات مجھے پہلے معلوم ہو جاتی جو بعد میں معلوم ہوئی تو آپ ﷺ کو ان کی بیویاں ہی غسل دیتیں۔ (2)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہرا کو غسل دیا تھا۔ (3)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: مرد اپنی بیوی کو غسل دینے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ (4)

عبدالرحمٰن بن الاسود (تابعی) فرماتے ہیں اپنی بیویوں کو میں خود غسل دیا کرتا ہوں، ان کی ماؤں اور بہنوں کو روک دیا کرتا ہوں۔ (5)

حسن بصری فرماتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں۔ (6)

یہ فتویٰ ''فتاویٰ علمائے حدیث'' جلد پنجم سے لیا گیا ہے اور اس میں اصول حدیث کی چند بحثیں حذف کر دی گئی ہیں۔

یہاں ایک نکتہ اور ملاحظہ ہو۔ کیا موت سے میاں بیوی کا تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے؟

جہاں تک دنیوی زندگی کا تعلق ہے تو یہ تعلق سورج کے غروب ہونے کے بعد جیسے شفق کچھ دیر تک رہتی ہے اس طرح باقی رہتا ہے، اسی لیے مرد عورت کا وارث ہوتا ہے اور عورت مرد کی وارث ہوتی ہے۔ عورت عدت وفات گزارتی ہے، جس کی مدت

(1) سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث: 1465، ومسند أحمد: 228/6. (2) سنن ابن ماجه، الجنائز، حديث: 1464، ومسند أحمد: 267/6. (3) سنن الدارقطني: 79/2، والمستدرك للحاكم 164,163/3، یہ قصہ متعدد اسناد سے منقول ہے۔ ان میں سے ایک سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔ التلخيص الحبير: 327/2۔ (4) مصنف ابن أبي شيبة: 250/3. (5) محلّى ابن حزم: 179/5. (6) مصنف ابن أبي شيبة: 250/3.

چار ماہ دس دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک شخص کے ساتھ جنت کے اسی درجے میں جس میں وہ خود ہے، اس کے بال بچوں اور والدین کو بھی جمع کردے گا۔ ارشاد فرمایا:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَاَزْوٰجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ﴾

''ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جہاں یہ خود جائیں گے اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولادوں میں سے بھی جو نیکوکار ہوں گے، ان کے پاس فرشتے ہر ہر دروازے سے آئیں گے۔''[1]

سورۂ زخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ﴾

''تم اور تمھاری بیویاں ہشاش بشاش (راضی خوشی) جنت میں چلے جاؤ۔''[2]

اس سے بعض مفسرین نے جنت کی حوریں مراد لی ہیں لیکن اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ (جنت میں داخل ہوجاؤ) اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے مراد دنیا کی بیویاں ہی ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موت کی وجہ سے میاں بیوی کا تعلق عارضی طور پر منقطع ہوجاتا ہے کیونکہ جنت میں دوبارہ ملاپ ہونا ہے۔ تو کیا اس عارضی انقطاع کا یہ معنی لیا جائے کہ موت کے بعد ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا بھی منع قرار دے دیا جائے؟

عیسائی کے جنازے میں شرکت کرنا

سوال کسی عیسائی کے جنازے میں شرکت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

[1] الرعد 13:23۔ [2] الزخرف 43:70۔

جواب اس ضمن میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتویٰ کا حوالہ دینا مناسب رہے گا، ان سے پوچھا گیا کہ آیا ایک مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ ایک عیسائی مریض کی عیادت کرے اور اس کے مرجانے پر اس کے جنازے کے ساتھ جائے؟ اور یہ کہ مسلمانوں میں سے اگر کوئی ایسا کام کرے تو کیا اس پر گناہ لازم ہوگا؟

شیخ الاسلام نے جواب دیا: الحمد للہ رب العالمین ..... جنازہ کے ساتھ تو نہ جائے، البتہ عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس طرح اس کی تالیف قلب ہوگی کہ شاید وہ اسلام قبول کر لے لیکن اگر وہ مرجاتا ہے تو وہ جہنمی ہے، اس لیے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی۔ واللہ اعلم [1]

عیادت کے بارے میں دو احادیث ملاحظہ ہوں:

نبی ﷺ نے ایک یہودی لڑکے کی عیادت کی اور اسے کہا: ''اسلام قبول کرلو۔'' [2]

اور نبی ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کو مرض موت کی حالت میں کہا: ''چچا! لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہو۔'' [3]

زیارت قبر کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: نبی ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی، خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا، پھر کہا: ''میں نے اپنے رب سے اجازت مانگی کہ اپنی ماں کے لیے دعائے مغفرت کروں تو مجھے اجازت نہیں دی گئی، پھر اجازت مانگی کہ ان کی قبر کی زیارت کروں تو مجھے اس کی اجازت دی گئی۔ تو پھر قبروں کی

[1] روائع المسائل والفتاوی، ص: 18. [2] صحیح البخاري، الجنائز، حدیث: 1356. [3] صحیح البخاري، الجنائز، حدیث: 1360، وصحیح مسلم، الإیمان، حدیث: 24.

زیارت کرو کہ یہ موت کی یاد دلاتی ہیں۔"[1]

مشرک کے لیے دعائے مغفرت کرنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "نبی کے لیے اور ایمان والوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے استغفار کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، بعد اس کے کہ ان پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنا صرف ایک وعدہ کی بنا پر تھا جو انھوں نے اپنے والد سے کیا تھا، پھر جب ان کے لیے یہ واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انھوں نے اس سے براءت کا اظہار کیا، بے شک ابراہیم علیہ السلام رجوع کرنے والے اور بردبار شخص ہیں۔"[2]

عبداللہ بن ابی ابن سلول رئیس المنافقین کے مرنے پر تو خاص طور پر یہ فرمان نازل ہوا: "ان میں سے کسی پر بھی نماز نہ پڑھو اور نہ ان کی قبر ہی پر کھڑے ہو، انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور ایسی حالت میں مرے ہیں کہ وہ فاسق تھے۔"[3]

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ

① غیر مسلم کی عیادت جائز ہے۔

② غیر مسلم کے لیے دعائے مغفرت کرنا بالکل ناجائز ہے۔

③ غیر مسلم کے جنازہ میں بھی شریک ہونا جائز نہیں، اِلّا یہ کہ اس کے دفن کا انتظام کرنے والا کوئی نہ ہو، ایسی صورت میں غیر مسلم رشتے دار کی میت کا ضرورت کی بنا پر دفن کا انتظام کیا جا سکتا ہے لیکن اگر چرچ میں یا کسی دوسری عبادت گاہ میں اس کی آخری رسوم ادا کی جائیں تو اس میں شریک نہ ہوا جائے۔

[1] صحیح مسلم، الجنائز، حدیث: 976. [2] التوبة 9:113، 114. [3] التوبة 9:84.

ابوطالب کی وفات پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: «اِذْهَبْ فَوَارِهِ» ''جاؤ اور اسے (قبر میں) ڈھانپ دو۔''[1]

خواتین کا قبرستان جانا

سوال برمنگھم کے ایک قاری نے دریافت کیا ہے کہ کیا عورت قبرستان کی زیارت کرسکتی ہے، اگر کرسکتی ہے تو اس کے آداب کیا ہیں؟

جواب عورتوں کے لیے قبرستان جانے کے سلسلے میں پہلے تو یہ دو احادیث ملاحظہ ہوں:

ام عطیہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ہمیں جنازہ کے پیچھے پیچھے جانے سے منع کیا گیا لیکن اس پر اصرار نہیں کیا گیا۔ اصل الفاظ ہیں: «وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا»[2]

گو اس روایت میں اس بات کی تصریح نہیں کی گئی کہ کس نے منع کیا تھا لیکن اصول حدیث کے ایک قاعدے کے مطابق ایک صحابی یا صحابیہ نے اگر ایسے الفاظ استعمال کیے ہوں تو اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذات ہے کہ یقیناً انھوں نے منع کیا ہوگا لیکن اس حدیث کے آخری الفاظ سے معلوم ہوا کہ یہ منع کرنا تحریم کے لیے نہیں تھا بلکہ کراہت کے درجے میں تھا اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ عورتیں ایسے موقع پر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہیں، نوحہ کرتی ہیں، گریبان پھاڑتی ہیں، اس لیے جنازہ کے ساتھ ان کا نہ جانا ہی بہتر ہے۔

لیکن آیا جنازہ کے علاوہ کبھی کبھار اپنے کسی عزیز کی قبر پر جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں دوسری حدیث ملاحظہ ہو:

[1] سنن النسائي، الطهارة، حديث: 190. [2] صحيح البخاري، الجنائز، حديث: 1278، وصحيح مسلم، الجنائز، حديث: 938.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت فرمائی۔ [1]

اس حدیث کے بارے میں بعض اہل علم کا یہ کہنا ہے کہ یہ حکم شروع شروع میں تھا اور اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمادیا: ”سنو! میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب کہتا ہوں کہ قبروں کی زیارت کیا کرو کہ اس طرح آخرت کی یاد آتی ہے۔“ [2]

اس اجازت میں مرد اور عورت دونوں داخل ہوگئے لیکن بعض علماء کا کہنا ہے کہ عورتوں کے لیے قبرستان جانا ہر صورت میں مکروہ ہے، ان اسباب کی بنا پر جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے عمل اور ان کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ زیارت صرف میت کے لیے دعا اور آخرت کی یاد کے لیے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ آپ کا عمل یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کی قبر پر گئیں [3] اور بروایت مسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ حضرت جبرئیل نے ان سے کہا ہے کہ تمھارا رب تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم اہل بقیع کے پاس جاؤ اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کے رسول! میں کیا کہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو:

«اَلسَّلَامُ عَلٰی أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ»

[1] سنن أبي داود، الجنائز، حديث: 3236، وجامع الترمذي، الصلاة، حديث: 320. [2] مسند أحمد: 145/1، وجامع الترمذي، حديث: 1054. [3] المستدرك للحاكم: 376/1، والسنن الكبرى للبيهقي: 78/4.

''مومنوں اور مسلمانوں سے آباد ان گھروں پر سلام ہو، اللہ ہم میں سے آگے جانے والوں پر اور پیچھے رہ جانے والوں پر اپنی رحمت بھیجے اور اللہ نے چاہا تو ہم تم سے ملنے والے ہیں۔''[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ خواتین کثرت سے قبرستان نہ جائیں۔ کسی عزیز کی قبر پر اگر جانا ہو تو دعا کے لیے جائیں اور بے پردگی، نوحہ خوانی اور رونے دھونے سے باز رہیں۔ واللہ أعلم.

بوقت ضرورت قبرستان ختم کرنے کی شرط پر قبرستان کی جگہ لینا اور اگر بعد میں ایسا قبرستان ختم کر دیا جائے تو قبروں کا کیا ہو گا؟

سوال ڈنمارک کے ایک علاقے میں سٹی کونسل نے مسلمانوں کو بطور قبرستان ایک قطعہ زمین کی پیشکش کی ہے لیکن ساتھ یہ شرط بھی رکھی ہے کہ اگر راستہ یا سڑک بنانے کی ضرورت پڑی تو قبرستان میں سے اس غرض کے لیے جگہ لے لی جائے گی۔ کیا ہم ایسی شرط قبول کر سکتے ہیں؟ تو پھر کیا وہاں پر مدفون افراد کی لاشوں کو کسی دوسرے قبرستان میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟

جواب ضرورت کی بنا پر ایک مسلمان کی لاش یا اس کی باقیات کو کسی دوسرے قبرستان میں منتقل کیا جا سکتا ہے کیونکہ حاجت عامہ کو ضرورت شمار کیا گیا ہے۔ پبلک کے فائدے کے لیے یا مسلمانوں کے عمومی فائدے کے لیے اگر راستے کی یا کسی دوسرے مفید کام کی ضرورت پڑ جائے تو پھر ایسا کرنا جائز ہو جاتا ہے، اس لیے ڈنمارک کے

[1] صحیح مسلم، الجنائز، حدیث: 974.

مسلمان اس شرط کو قبول کر سکتے ہیں، اس لیے کہ شرائط اصلاً جائز ہیں، الا یہ کہ ایسی شرط ہو جس سے حلال حرام ہو جائے یا حرام حلال میں تبدیل ہو جائے۔ ایک مسلمان کی باقیات کو دوسرے قبرستان میں منتقل کرتے وقت پوری احتیاط برتی جائے اور لاش کا پورا احترام کیا جائے۔ واللہ أعلم.

روزے
کے مسائل

رؤیتِ ہلال میں عرب کو معیار بنانے کا حکم

سوال مرکز ابن قیم کا دوسرا سوال رؤیتِ ہلال سے متعلق ہے۔ لکھتے ہیں: بعض ہند کے مسلمان رمضان اور عیدین کے موقع پر عرب ممالک کی رؤیت ہلال کا اعتبار کرتے ہوئے روزہ شروع کرتے ہیں اور عید مناتے ہیں۔ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کے ان مبارک موقعوں پر یہ حضرات اختلاف و انتشار کا مظاہرہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ایک ہی گھر میں دو دن الگ الگ عید منائی جاتی ہے۔

کیا ان لوگوں کا عرب دنیا کی رؤیت پر اعتماد کرنا شرعاً درست ہے؟ کیا ایک شہر میں دو یا تین دن عیدیں منائی جاسکتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

جواب چونکہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اس لیے میں چند اصولی باتیں درج کرتا ہوں:

① حدیث نبوی کے مطابق نئے چاند کا تعلق رؤیت بصری سے ہے، نظر نہ آنے کی صورت میں شعبان کے مہینہ کے تیس دن پورے کیے جائیں اور پھر رمضان شروع کیا جائے۔ [1]

② شریعت نے اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے۔ خاص طور پر اگر دو ممالک اتنی دوری

[1] صحيح البخاري، الصوم، حديث:1907-1909، وصحيح مسلم، الصيام، حديث:1081,1080.

پر ہوں کہ دونوں کے اوقات میں رات کے کسی حصہ کا بھی اشتراک نہ ہو۔

③ اگر مشرق میں چاند واقعی نظر آ جائے تو تمام مغربی ممالک میں ایسے چاند کا دیکھا جانا یقینی ہو جاتا ہے کیونکہ مغربی ممالک میں مغرب کا وقت بعد میں ہوگا اور اس لحاظ سے چاند کی عمر گھنٹوں کے اعتبار سے بڑھتی جائے گی اور اس کی رؤیت کا امکان بھی زیادہ ہوتا چلا جائے گا لیکن اگر اس کا عکس ہو، یعنی کسی مغربی ملک میں چاند کی رؤیت ہوئی ہو تو مشرقی ممالک میں یہ چاند اگلے دن کے غروب کے بعد ہی نظر آئے گا، یعنی ایک دن کا فرق واقع ہو جائے گا۔

چونکہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک ہندوستان سے مغرب میں ہیں، اس لیے سعودی عرب کی رؤیت اہل ہندوستان کے لیے قابل حجت نہیں ہوگی، البتہ یورپ اور امریکہ کے لیے یقیناً قابل حجت ہوگی۔

ایک وسیع وعریض ملک جیسے ہندوستان یا امریکہ میں تو اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جا سکتا ہے لیکن ایک ہی شہر میں رمضان شروع کرنے یا عید منانے پر اختلاف کرنا ناقابل فہم ہے، گو اب تک ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے، خود برطانیہ میں بلکہ شہر لندن میں بعض دفعہ دو مختلف دن عیدیں منائی جاتی رہی ہیں، پہلے دن وہ لوگ عید مناتے ہیں جو بلادِ عربیہ اور خاص طور پر سعودی عرب کی رؤیت پر اعتماد کرتے ہیں اور دوسرے دن وہ لوگ جو رؤیت علمی (یعنی فلکیاتی حساب کے مطابق) کے قائل ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ رؤیت بصری اور علم فلکیات میں مطابقت پیدا کی جائے، یعنی 29 ویں شب کو چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے لیکن ایسی رؤیت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اگر فلکیاتی اعتبار سے اس شب چاند سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہی غروب ہو چکا ہے، یعنی مطلع

پر سرے سے موجود ہی نہ ہو یا وہ قران شمس وقمر کے بعد اپنی عمر کے چند گھنٹے گزار چکا ہو جس میں ننگی آنکھ سے اس کا دیکھنا ناممکن ہو، عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب تک نئے چاند کی عمر سولہ سترہ گھنٹے نہ ہو جائے وہ دیکھے جانے کے قابل نہیں ہوتا لیکن تجربے سے یہ بات ریکارڈ کی گئی ہے کہ آٹھ گھنٹے کا چاند بھی نظر آیا ہے، اس لیے یا تو نئے چاند کے لیے کم از کم آٹھ گھنٹے کی مدت مقرر کر لی جائے اور یا پھر اس شرط کو سرے سے خارج کر دیا جائے اور صرف یہ کہا جائے کہ انتیسویں شب کو فلکیاتی اعتبار سے چاند اگر مطلع پر موجود ہو اور کہیں سے بھی رؤیت کی مصدقہ اطلاع آ جائے تو اس پر اعتبار کر لیا جائے۔ واللہ اعلم

حالت روزہ میں ریستوران میں مسلم وغیر مسلم کو کھانا پیش کرنا

سوال حالت روزہ میں کیا بالغ مسلمانوں کو کھانا پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ میں ایک پیزا کی دکان میں ملازم ہوں، دن کے اوقات میں کچھ مسلمان حضرات بھی کھانے کے لیے آتے ہیں، کیا ان کے روزہ نہ رکھنے کے گناہ میں، میں بھی شامل ہو جاؤں گا؟

جواب ریستوران میں کھانا پیش کرنا آپ کے کام میں داخل ہے، چاہے وہ دن کا وقت ہو یا رات کا۔ جو لوگ کھانے کے لیے آتے ہیں ان میں مسافر بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے لوگ بھی جو کسی نہ کسی عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکتے ہوں۔ آپ اس بات کے مکلف نہیں کہ لوگوں کی نیتوں کو جانچیں، اس لیے اگر کوئی شخص بغیر کسی عذر کے کھانا کھا رہا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ آپ اس کے اس عمل میں شریک نہ ہوں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ اپنا مکان کسی کو کرایہ پر دیتے ہیں۔ آپ مکان کا کرایہ وصول کرتے ہیں لیکن

اسی مکان میں اگر کرایہ دار کوئی گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اگر آپ خود دوکان کے مالک ہیں تو یا تو دن کے اوقات میں ماہ رمضان کے ایام میں دکان کو بند رکھیں یا یہ ہدایت لکھ کر لگائیں کہ دن کے اوقات میں کھانا خریدا جاسکتا ہے لیکن دوکان کے اندر کھانے کی سہولت دستیاب نہیں ہے۔ اور اس طرح آپ روزہ کشی سے لوگوں کو باز رکھنے میں مدد دے سکیں گے۔ لیکن اگر آپ ملازم ہیں تو پھر کھانا پیش کرنے کی حد تک آپ ان شاء اللّٰہ بریٔ الذمہ ہوں گے۔

زکاۃ
کے مسائل

ہر سال بار بار زکاۃ ادا کرنے کا حکم

سوال کیا ایک بار کسی مال (نقدین و کرنسی وغیرہ) سے زکاۃ ادا کر دینے سے دوبارہ آئندہ سالوں میں اس مال میں زکاۃ واجب نہیں ہوتی؟ (محمد ذبیح اللہ بیگ، سیکرٹری مرکز ابن القیم الاسلامی، مدراس انڈیا)

جواب اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے پہلے چند احادیث کا مطالعہ مفید ہوگا:

① حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا: «لَا زَكَاةَ فِي مَالٍ حَتَّى يَحُولَ عَلَيْهِ الْحَوْلُ»

''کسی بھی مال میں اس وقت تک زکاۃ نہیں جب تک اس پر ایک سال نہ گزر جائے۔''[1]

② عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنے خازن سالم کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ ہر سال ان کی بیٹیوں کے زیورات کی زکاۃ نکال دیا کریں۔[2]

③ بروایت عمرو بن شعیب، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمایا: ''سنو! جو شخص بھی کسی یتیم کے مال کا والی بنایا جائے تو وہ اس میں تجارت کرے، اسے ایسا ہی نہ چھوڑ دے

[1] سنن ابن ماجه، الزكاة، حديث: 1792، والسنن الكبرى للبيهقي: 4/95. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 4/139، وسنن الدارقطني: 2/107.

کہ صدقہ (زکاۃ) اسے کھا جائے۔''[1]

④ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: یتیموں کے مال میں تجارت کرو تاکہ صدقہ انھیں کھا نہ جائے۔[2]

⑤ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے کہا: جس کسی نے کسی کو قرض دیا تو اگر قرض دار ثقہ ہے تو وہ اس کی زکاۃ ہر سال دیا کرے۔[3]

⑥ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ان گورنروں کو وہ مال ان کے حقداروں کو واپس دینے کا حکم دیا جو انھوں نے زبردستی ان سے لیا تھا اور کہا: یہ لوگ اس مال میں سے پچھلے تمام سالوں کی زکاۃ ادا کریں، پھر ایک دوسرا خط لکھ کر بھیجا کہ ایسے اموال میں سے صرف ایک سال کی زکاۃ دی جائے کیونکہ یہ مال ضمار (ایسا مال جس کے ملنے کی امید نہیں تھی) کی تعریف میں آتا ہے۔[4]

⑦ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم اپنے مال کی زکاۃ دے دو تو تم نے وہ فرض ادا کر دیا جو تم پر عائد ہوا تھا۔''[5]

⑧ حدیث: «مَا نَقَصَ مَالُ عَبْدٍ مِنْ صَدَقَةٍ»

''صدقہ کی وجہ سے کسی آدمی کے مال میں کمی نہیں آتی۔''[6]

ان احادیث سے مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوئیں:

[1] جامع الترمذي، الزكاة، حديث: 641. [2] السنن الكبرى للبيهقي: 2/6، وسنن الدارقطني: 110/2 [3] السنن الكبرى للبيهقي: 149/4 [4] الموطأ، الزكاة، باب الزكاة في الدين، حديث: 594، والسنن الكبرى للبيهقي: 150/4 [5] جامع الترمذي، الزكاة، حديث: 618، وسنن ابن ماجه، الزكاة، حديث: 1788 [6] جامع الترمذي، الزهد، حديث: 2325. اسی معنی میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث صحیح مسلم میں ہے۔ دیکھیے: (صحيح مسلم، البر والصلة، حديث: 2588)

پہلی حدیث بالکل واضح ہے کہ کسی بھی مال پر (بشرط تکمیل نصاب) ایک سال گزرنے کے بعد زکاۃ واجب ہوتی ہے اور سال میں زکاۃ ایک ہی دفعہ واجب ہوتی ہے اور یہی مفہوم ہے ساتویں حدیث کا، کہ اگر سال میں ایک دفعہ زکاۃ دے دی تو دوبارہ اس سال اس پر زکاۃ نہیں ہوگی، بالکل ایسے ہی جیسے کہ اگر ایک نماز ایک دفعہ ادا کر لی جائے تو اسے دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اگلے دن دوبارہ اسی نماز کا وقت آنے پر وہ نماز پڑھی جائے گی، ایسے ہی رمضان کے روزوں کا حکم ہے۔

صرف حج ایسی عبادت ہے جو عمر میں ایک دفعہ فرض ہوتی ہے اور زائد حج نفلی حج کے حکم میں آتا ہے۔ زکاۃ مالی عبادت ہے جو رمضان کی طرح ہر سال واجب ہوتی ہے۔

دوسری حدیث سے معلوم ہوا کہ زیورات پر ہر سال زکاۃ دینی چاہیے یہ نہیں کہ ایک سال زکاۃ دے دی تو ساری عمر کے لیے اب ان زیورات میں زکاۃ نہیں۔ تیسری اور چوتھی روایت سے معلوم ہوا کہ یتیموں کی مصلحت کی خاطر ان کے مال میں تجارت کا حکم دیا گیا اور وہ اس لیے کہ اگر اس مال کو تجارت کے ذریعے سے بڑھایا نہ گیا تو ہر سال زکاۃ دینے کی صورت میں چند سالوں کے بعد یہ مال ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے اگر ایک دفعہ ہی زکاۃ واجب ہوتی تو پھر اس ہدایت کی ضرورت نہ تھی۔

پانچویں اور چھٹی روایت سے معلوم ہوا کہ اگر قرض ایسے شخص کو دیا گیا ہے جو ثقہ ہے، امانت دار ہے تو پھر گویا یہ قرض ایک محفوظ جگہ پڑا ہوا ہے، اس لیے قرض دار کو ہر سال اپنے مال کی زکاۃ نکالتے رہنا چاہیے لیکن اگر قرض ایسے شخص کو دیا گیا ہے جس سے مال واپس ملنے کی امید نہیں تو پھر جب بھی مال واپس ملے تو صرف ایک سال کی زکاۃ دے دی جائے۔

آٹھویں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ بظاہر صدقہ وزکاۃ دینے سے مال کم ہوتا نظر آتا ہے لیکن ایسے مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ڈال دی جاتی ہے اور وہ بربنائے برکت کم نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کنویں سے جتنا زیادہ پانی نکالا جائے کنواں اتنا ہی گہرا ہوتا جاتا ہے اور اس کا پانی ختم ہونے میں نہیں آتا۔ زمزم کا کنواں اس کی زندہ مثال ہے۔

مسئلہ مذکورہ کی وضاحت تو ہوگئی۔ آخر میں یہ بھی تحریر کرتا چلوں کہ زکاۃ نہ دینے میں شیطانی وساوس کا دخل ہے۔ یہ آیت پیش نظر رہنی چاہیے:

﴿ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''شیطان تم سے فقر کا وعدہ کرتا ہے اور تمھیں برائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

زکاۃ نہ دینے پر جو سخت وعید آئی ہے وہ بھی پیش نظر رہے تو ان شاء اللہ مذکورہ وساوس سے نجات مل جائے گی۔

کرایہ پر مکان لینے میں جو رقم بطور ڈپازٹ ہو اس پر زکاۃ کا حکم

سوال مکان کرایہ پر لیتے وقت ایک رقم بطور ڈپازٹ ادا کرنی ہوتی ہے جو کہ معاہدہ کے ختم ہونے پر واپس کی جاتی ہے۔ اگر اس رقم پر ایک سال گزر جائے اور وہ نصاب کی حد تک پہنچ گئی ہو تو کیا اس پر زکاۃ واجب ہوگی؟

[1] البقرۃ 2:268.

جواب اس رقم کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

① رقم پوری کی پوری کرایہ دار کو واپس مل جائے چاہے ایک سال بعد ہو یا دس سال بعد۔

② اس رقم میں سے اتنے پیسے کاٹے جانے کا احتمال موجود ہو جو مکان کی ٹوٹ پھوٹ کے عوض میں ہوں یا معاہدے کے ختم ہونے سے چند ماہ قبل کے کرایہ میں وضع کیے گئے ہوں یا کرایہ دار کا مکان چھوڑ دینے کے بعد مختلف بلوں کی ادائیگی کے سلسلے میں کاٹے گئے ہوں۔

پہلی صورت کا حکم تو یہ ہے کہ کرایہ دار کو ہر سال ڈپازٹ والی رقم پر زکاۃ ادا کرنی چاہیے، اگر وہ (رقم علیحدہ یا اس آدمی کی ملکیت دوسری رقم کے جمع کرنے سے) نصاب کو پہنچ گئی ہو، وہ اس لیے کہ یہ رقم اس قرض کی طرح ہے جس کے واپس ملنے کا امکان قوی ہے۔

دوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ جب بھی ڈپازٹ کی رقم ملے، یعنی چاہے ایک سال بعد ملے یا دس سال بعد، صرف ایک سال کی زکاۃ دی جائے کیونکہ ایسا مال جس کے ملنے کی امید نہ ہو اسے مالِ ضمار کہا جاتا ہے اور اس میں صرف ایک سال کی زکاۃ دی جاتی ہے۔ اس فتویٰ کی بنیاد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس عمل پر ہے جسے امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے مجموعہ احادیث مؤطا میں روایت کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے بعض گورنروں کو لکھ کر پیغام بھیجا کہ جو مال لوگوں سے ناحق وصول کیا گیا ہے اسے اس کے مالکوں کو لوٹایا جائے اور اس مال پر جتنے سال گزرے ہیں ان سب کی زکاۃ وصول کی جائے۔

پھر انھوں نے ایک دوسرا حکم نامہ بھیجا کہ نہیں صرف ایک سال کی زکاۃ وصول کی جائے کیونکہ یہ مال، مالِ ضمار ہے۔[1]

[1] الموطأ، الزکاۃ، حدیث: 597.

زکاۃ کرایہ پر دیے گئے مکانات کی مالیت پر یا کرایہ پر ہوگی؟

سوال ایک شخص کے پاس کچھ مکانات ہیں جو کرایہ پر دیے گئے ہیں، زکاۃ آیا ان کے کرائے پر نکالی جائے گی یا ان مکانات کی کل مالیت پر؟

جواب زکاۃ ان مکانات کے کرایہ پر نکالی جائے گی، اس لیے کہ یہ مکان خرید وفروخت کے لیے نہیں رکھے گئے بلکہ بغرض آمدنی رکھے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾

''اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی پاک کمائی میں سے۔''[1]

عربی میں کسب اور اکتساب اصل مال سے حاصل ہونے والی آمدنی کو کہا جاتا ہے چونکہ صورت مذکورہ میں اصل مال تو مکانات ہیں لیکن ان سے آمدنی کرائے کی شکل میں حاصل ہوتی ہے، اس لیے ایک سال گزر جانے کے بعد جو کچھ آمدنی حاصل ہو اس پر زکاۃ ادا کی جائے، بشرطیکہ یہ آمدنی بقدر نصاب ہو چکی ہو۔

تعمیر مساجد میں مال زکاۃ خرچ کرنا

جواباً عرض ہے کہ زکاۃ کے آٹھ مصارف سورۂ توبہ کی آیت نمبر 60 میں بتائے گئے ہیں، جن میں مساجد یا خیراتی کام شامل نہیں ہیں لیکن زکاۃ کا ایک مصرف (فی سبیل اللہ) مفسرین وفقہاء کی طبع آزمائی کا موضوع رہا ہے۔

فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟

[1] البقرة 2:267.

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کی اصطلاح جہاد کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے فی سبیل اللہ سے مراد مجاہدین کی اعانت، جہاد کی تیاری اور جہاد سے متعلقہ امور ہیں اور یہی مذہب فقہائے اربعہ کا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور احناف میں سے امام محمد رحمہ اللہ نے فی سبیل اللہ میں حج کو بھی شامل رکھا ہے۔ بطور دلیل ان دو روایات کو پیش کیا جاتا ہے:

حضرت ابولاس سے منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صدقے کے اونٹوں پر حج کے لیے سوار کرایا۔ [1]

حضرت معقل بن یسار سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حج فی سبیل اللہ میں سے ہے۔'' [2]

ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے حج وعمرہ کو جہاد قرار دیا۔ [3]

ان روایات کی بنا پر امام احمد اور امام محمد کے نزدیک نادار مسلمان زکاۃ کی رقم سے حج کے لیے استفادہ کر سکتے ہیں۔

اکثر فقہاء ومفسرین نے اسلام کی دعوت وتبلیغ کو جہاد کی شکل قرار دیتے ہوئے مبلغین، داعی حضرات اور مدارس کے اساتذہ وطلبہ کی اعانت زکاۃ فنڈ میں سے ادا کرنے کی اجازت دی ہے۔

مفسرین میں سے امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

اور معلوم ہونا چاہیے کہ فی سبیل اللہ کی عبارت بظاہر مجاہدین تک محدود نہیں ہے اور

[1] صحيح البخاري، الزكاة، قبل الحديث: 1468. صحیح بخاری میں یہ روایت معلق ہے۔ موصولاً یہ روایت مسند أحمد (221/4) میں موجود ہے۔ [2] سنن أبي داود، المناسك، حديث: 1989.
[3] صحيح البخاري، الجهاد والسير، حديث: 2876,2875.

اسی لیے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے یہ بات نقل کی ہے کہ صدقات کا خیراتی کاموں، جیسے مردوں کی تکفین، قلعوں کا بنانا اور مساجد کی تعمیر میں صرف کرنا جائز ہے کیونکہ فی سبیل اللہ ایک عام لفظ ہے اور ان تمام باتوں پر حاوی ہے۔ [1]

ابن قدامہ، المغنی میں لکھتے ہیں:

یہ جائز نہیں ہے کہ زکاۃ کی رقم ان چیزوں میں صرف کی جائے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا، جیسے مساجد کی تعمیر، پل اور پانی کی سبیلیں بنانا، سڑکیں ٹھیک کرنا، سیلاب کے پانی کو روکنے کے لیے بند باندھنا، مردوں کی تکفین، مہمانوں کی آؤ بھگت اور ایسی ہی اطاعت کی وہ تمام چیزیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: پلوں اور راستوں میں جو بھی خرچ کیا جائے وہ صدقہ ہی ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک صدقات فقراء، مساکین کے لیے ہیں۔ (الآیۃ) آیت کے شروع میں لفظ إِنَّمَا سے حصر و اثبات دونوں ہوجاتے ہیں، یعنی زکاۃ کا مال انھی آٹھ اصناف ہی پر خرچ کیا جاسکتا ہے، دوسروں پر نہیں۔ [2]

فقہائے احناف کے نزدیک چونکہ زکاۃ ایسے ہی لوگوں کو دی جاسکتی ہے جن میں مال زکاۃ کا مالک بننے کی صلاحیت ہو، اس لیے وہ عام خیراتی کاموں میں زکاۃ کو صرف کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ فتاوی ہندیہ میں مرقوم ہے:

زکاۃ سے مسجد، پل اور سرائے کی تعمیر، سڑکوں کی مرمت، نہروں کی کھدائی، حج اور جہاد میں خرچ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ایسی چیزوں ہی میں خرچ کیا جاسکتا ہے جس میں

[1] مفاتیح الغیب: 2/681 [2] المغنی: 2/667

مالک بننے کی صلاحیت نہ ہو۔ [1]

شرط تملیک کی بنا پر فقہائے احناف مدارس وغیرہ میں مال زکاۃ خرچ کرنے کے لیے یہ حیلہ روا رکھتے ہیں کہ پہلے غریب طلبہ کو زکاۃ کی رقم کا مالک بنایا جاتا ہے اور پھر ان سے مدرسہ کے لیے رقم ہبہ کر لی جاتی ہے لیکن اس حیلے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ آیت مذکورہ میں حرف لام (للفقراء) لام تملیک کے معنی میں نہیں بلکہ زکاۃ کے مصرف کے بیان کے لیے آیا ہے۔

الازہر کے علماء میں مفتی عبدالمجید سلیم اور بعض معاصر علماء نے قفال مروزی کی رائے کو اختیار کرتے ہوئے لفظ فی سبیل اللہ کو کافی وسعت دی ہے اور تمام خیراتی کاموں حتیٰ کہ مساجد اور ہسپتالوں کی تعمیر کو بھی "فی سبیل اللہ" میں شمار کیا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آٹھ مصارف کا ذکر کیا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ زکاۃ مخصوص مدات ہی میں صرف کی جا سکتی ہے، وگرنہ فی سبیل اللہ میں بعض وہ امور بھی آ جاتے ہیں جو ان آٹھ مصارف میں شامل ہیں، جیسے مؤلفۃ القلوب (وہ لوگ جنھیں اسلام میں رغبت دلانے کے لیے یا اسلام قبول کرنے کے بعد بطور اعانت مدد دی جاتی ہے۔) صحیح مسلم میں مروی ہے کہ عبدالمطلب بن ربیعہ اور فضل بن عباس نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مال زکاۃ کی تحصیل پر ہم کو مقرر کر دیں تاکہ ہم بھی اس کام کے عوض کچھ فائدہ حاصل کر سکیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مال زکاۃ اوساخ الناس، یعنی لوگوں کا میل کچیل ہے اور محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کے لیے جائز نہیں۔" [2]

[1] فتاوی هندية: 1/97. [2] صحيح مسلم، الزكاة، حديث: 1072.

اس سے بھی معلوم ہوا کہ سادات بنو ہاشم کی ضروریات کو پورا کرنا فی سبیل اللہ میں داخل تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں اس میں داخل نہیں کیا، یہی بات مساجد کی تعمیر کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ لوگوں کا میل کچیل مساجد کی تعمیر پر خرچ نہیں کرنا چاہیے، پھر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ممالک میں مساجد کی تعمیر پر اچھی خاصی رقم صرف ہو جاتی ہے اور اگر زکاۃ کی رقوم مساجد پر صرف کی جانے لگیں تو پھر فقراء و مساکین اور محتاجوں کے لیے کچھ باقی نہ رہے گا۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان ممالک میں مسجد کے ایک گنبد یا مینار کی تعمیر پر پچاس ساٹھ ہزار پونڈ بآسانی خرچ ہو جاتے ہیں لیکن یہی رقم اگر پاک و ہند یا افریقہ کے فقراء و مساکین پر خرچ کی جائے تو پچاس ساٹھ خاندان ایک سال کے لیے دست سوال دراز کرنے سے بچ سکتے ہیں، اس لیے ہماری رائے میں فی سبیل اللہ کے الفاظ کو اتنی ہی وسعت دینی چاہیے کہ جس کے یہ الفاظ متحمل ہیں، یعنی اسے جہاد ہی سے خاص رکھا جائے کہ جس میں جہاد بالسیف، باللسان اور بالقلم تینوں انواع شامل ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں مساجد کی تعمیر کی فضیلت و ثواب پر اسی لیے ابھارا گیا ہے تاکہ کلمہ گو حضرات زکاۃ کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں کثرت سے خرچ کریں اور جنت میں اپنے لیے محلات کھڑے کر سکیں۔
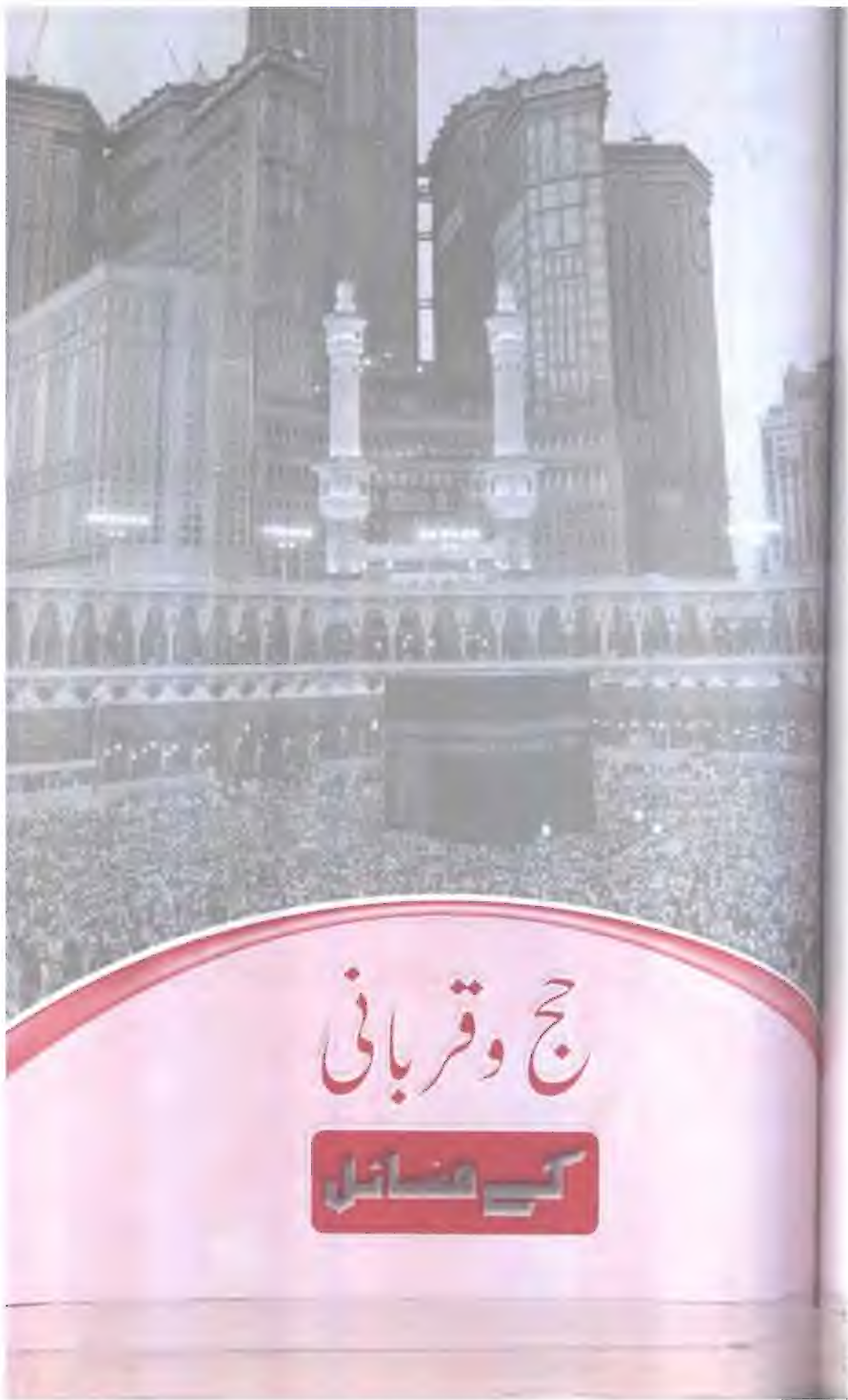
حج وقربانی

کے مسائل

غیر رشتہ دار کا حج بدل کرنا

سوال حج بدل کے سلسلے میں جو احادیث وارد ہیں، ان میں والدین کی جانب سے اولاد کے حج بدل کا ذکر ملتا ہے۔ کیا ایسی کوئی حدیث موجود ہے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ غیر رشتے دار بھی حج بدل کر سکتے ہیں؟

جواب اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل احادیث کا مطالعہ مفید رہے گا:

① عبداللہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ خثعم قبیلے کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا: میرا باپ اس حالت میں مسلمان ہوا ہے کہ اس کی عمر کافی ہو چکی ہے اور وہ جانور پر سواری نہیں کر سکتا۔ اس پر حج فرض ہو چکا ہے تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتا ہوں؟ نبی ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم اس کے سب سے بڑے بیٹے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''بتاؤ کہ اگر تمھارے باپ پر قرض ہوتا اور تم اسے ادا کر دیتے تو کیا وہ اس کی طرف سے ادا نہ ہوتا؟'' اس نے کہا: ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر اس کی طرف سے حج کرو۔''[1]

② حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جہینہ قبیلے کی ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور کہا: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج ادا کرنے

[1] سنن النسائي، مناسك الحج، حديث:2639، ومسند أحمد:4/3-5.

سے قبل انتقال کر گئی، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! اس کی طرف سے حج کرو، بتاؤ اگر تمھاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اسے نہ ادا کرتیں؟ اللہ کو بھی ادا کرو کیونکہ اللہ کے حق کو ادا کرنا زیادہ ضروری ہے۔'' [1]

③ امام احمد اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے ملتی جلتی روایت ذکر کی ہے کہ ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میری بہن نے حج کرنے کی نذر مانی ہے۔ [2]

④ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک آدمی کو کہتے سنا: شبرمہ کی طرف سے لبیک۔ آپ نے پوچھا: ''یہ شبرمہ کون ہے؟'' اس نے کہا: میرا بھائی۔ (یا کہا: میرا کوئی قریبی) آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم نے اپنا حج کر لیا ہے؟'' کہنے لگا: نہیں! تو آپ ﷺ نے کہا: ''پہلے اپنا حج ادا کرو، پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرو۔'' [3]

ان احادیث سے یہ باتیں معلوم ہوئیں:

① ایک شخص جو حج کرنے سے بالکل معذور ہو چکا ہو اس کی طرف سے اس کا بیٹا یا بیٹی حج کر سکتی ہے۔

② جس شخص نے حج کی نذر مانی ہو اور پھر وہ حج نہ کر سکا ہو تو اس کی طرف سے بھی اولاد حج کر سکتی ہے۔

③ تیسری حدیث سے معلوم ہوا کہ بھائی بہن کی طرف سے بھی حج کر سکتا ہے۔

④ شبرمہ والی حدیث سے معلوم ہوا کہ حج بدل کے لیے پہلے اپنا حج کرنا ضروری ہے، اس کے بعد دوسرے کی طرف سے حج کیا جا سکتا ہے۔

[1] صحيح البخاري، جزاء الصيد، حديث: 1852. [2] صحيح البخاري، الأيمان والنذور، حديث: 6699، ومسند أحمد: 345/1. [3] سنن أبي داود، المناسك، حديث: 1811، وسنن ابن ماجه، المناسك، حديث: 2903.

⑤ شبرمہ والی روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نہ صرف بھائی بلکہ اپنے کسی دوسرے رشتہ دار کی طرف سے بھی حج کیا جاسکتا ہے۔

⑥ پہلی اور دوسری حدیث میں کسی کی طرف سے حج کرنے کو دوسرے کی طرف سے قرض ادا کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ قرض ادا کرنے کے لیے انتہائی قریبی رشتہ دار ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ کوئی شخص بھی دوسرے شخص کی طرف سے قرض ادا کردے تو وہ ادا ہوجائے گا۔

تو معلوم ہوا کہ دوسرے کی طرف سے حج ادا کرنے کے لیے صلبی اولاد یا بھائی بہن یا قریبی رشتہ دار کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ کوئی بھی شخص حج ادا کرسکتا ہے۔

حج وعمرہ کے بعد عورت بال خود کاٹے یا احرام کھولے ہوئے خاتون سے کٹوائے

سوال عورت حج یا عمرہ کے بعد اپنے بال خود کاٹے یا جس نے پہلے احرام کھول لیا ہے وہ اس کے بال کاٹے؟

جواب اپنے بال خود نہ کاٹے بلکہ جس نے احرام کھول لیا ہے اس سے کٹوائے، رسول اللہ ﷺ نے حج کے بعد حجام کو بلایا اور اس سے بال کاٹنے کو کہا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قربانی کرنا

سوال رسول اکرم ﷺ کی طرف سے قربانی دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آج کل بعض لوگ اس طرح کرتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ حضرات صحابہ کرام، ائمہ، فقہاء اور

[1] صحیح مسلم، الحج، حدیث: 1305.

سلفِ صالحین سے اس کا ثبوت ملتا ہے؟ (عائشہ صدیقہ، برمنگھم)

جواب بعض اہل علم میت کی طرف سے قربانی کے قائل ہیں۔ ان میں عبداللہ بن مبارک شامل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میت کی طرف سے صدقہ کردیا جائے لیکن قربانی نہ کی جائے اور اگر قربانی کی جائے تو خود اس میں سے کچھ نہ کھایا جائے، سارے کا سارا صدقہ کردیا جائے۔

اس موضوع پر مزید بحث کرنے سے قبل مندرجہ ذیل دو حدیثوں کا جائزہ لیا جاتا ہے:

① امام ترمذی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت لائے ہیں کہ وہ دو مینڈھے ذبح کیا کرتے تھے۔ ایک اپنی طرف سے اور ایک نبی کریم ﷺ کی طرف سے۔ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: اس بات کا حکم مجھے نبی ﷺ نے دیا ہے، اس لیے میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایسی ہی روایت امام ابوداود نے بھی اپنی سنن میں ذکر کی ہے۔[1] امام حاکم نے اپنی روایت میں دو دو مینڈھوں کا ذکر کیا ہے، یعنی اپنی طرف سے دو اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دو۔[2]

② امام ترمذی اور امام ابوداود دونوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے ساتھ عیدگاہ میں نماز پڑھی۔

[1] سنن أبي داود، الضحايا، حديث: 2790، وجامع الترمذي، الأضاحي، حديث: 1495.

[2] مؤلف کو یہاں تسامح ہوا ہے کیونکہ مستدرک حاکم میں بھی ایک ایک مینڈھا ذبح کرنے کا تذکرہ ہے۔ المستدرك للحاكم: 255/5، حديث: 7556، ہاں! مسند ابی یعلیٰ میں ایک روایت ہے کہ مجھے (علی رضی اللہ عنہ کو) رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ میں آپ کی طرف سے دو مینڈھے ذبح کیا کروں۔ (مسند أبي يعلى: 355/1) اس روایت کے راوی وہی ہیں جو سنن ابی داود اور سنن الترمذی میں اس حدیث کے راوی ہیں، اس لیے یہ حدیث بھی ضعیف ہے۔

آپ ﷺ خطبہ ختم کرنے کے بعد منبر سے اترے۔ آپ کے پاس ایک مینڈھا لایا گیا تو آپ نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا:

«بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، هٰذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي»

''اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ سب سے بڑا ہے، یہ میری طرف سے ہے اور میری امت کے ان تمام لوگوں کی طرف سے جنھوں نے قربانی نہیں کی۔''[1]

میت کی طرف سے قربانی کے جواز کا دارو مدار ان دو احادیث پر ہے۔ اب آیئے ملاحظہ کریں کہ محدثین نے ان دونوں احادیث کی سند کے بارے میں کیا لکھا ہے؟

پہلی حدیث کی سند میں امام ترمذی کے بعد راویوں کی ترتیب اس طرح ہے:

محمد بن عبید المحاربی الکوفی: جو کہ امام ترمذی کے شیخ ہیں۔

شریک بن عبداللہ القاضی: فيه مقال وهو سيئ الحفظ، ان کے بارے میں اعتراض کیا گیا ہے اور حافظے کے اعتبار سے وہ اچھے نہیں ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے متابعات یعنی حدیث کے شواہد کے طور پر ان کی حدیث کو لیا ہے۔

ابوالحسناء: مجہول ہیں، حکم بن عتیبہ سے ان کی روایت معروف نہیں ہے۔

حکم بن عتیبہ: ثقہ اور قابل اعتبار ہیں۔

حنش بن معتمر الکنانی: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حدیث ضعیف ہے۔

دوسری حدیث کی سند میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے مطلب بن عبداللہ بن حنطب ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ حضرت جابر سے ان کا سماع ثابت

[1] سنن أبي داود، حديث: 2810، وجامع الترمذي، حديث: 1521.

نہیں۔ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ کثرت سے تدلیس اور ارسال کیا کرتے تھے۔ اس حدیث میں انھوں نے جابر سے سننے کی تصریح نہیں کی، ابو حاتم الرازی نے بھی ان کی عدم سماعت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے بیٹے عبدالرحمٰن الرازی کہتے ہیں: معلوم ہوتا ہے کہ وہ جابر تک پہنچے ہوں۔ ''یشبه أن یکون أدرکه''

گویا اس حدیث کی سند میں بھی اشتباہ ہے۔

شارح ترمذی محمد عبدالرحمٰن بن عبدالرحیم مبارکپوری تحفۃ الاحوذی میں لکھتے ہیں: میت کی طرف سے انفرادی طور پر قربانی کرنے کے بارے میں مجھے ایک بھی صحیح مرفوع حدیث نہیں ملی۔ حضرت علی کی حدیث ضعیف ہے، اس لیے اگر کوئی شخص میت کی طرف سے انفرادی طور پر بھی قربانی کرے تو احتیاطاً سب کا سب صدقہ دے دے اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی امت کی طرف سے قربانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ کا اپنی امت کی طرف سے قربانی کرنا اور اپنی قربانی میں ان کو شریک کرنا آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے، البتہ اپنی طرف سے اور اپنے اہل و عیال کی طرف سے قربانی کرنا آپ کے ساتھ خاص نہیں ہے اور نہ منسوخ ہی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام ایک ایک قربانی اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے کیا کرتے تھے۔ کسی بھی صحابی سے یہ ثابت نہیں کہ وہ بھی امت کی جانب سے قربانی کیا کرتے ہوں اور انھیں اپنی قربانی میں شریک کرتے ہوں۔''[2]

آخر میں شیخ محمد بن عثیمین رحمہ اللہ کی رائے پر بات ختم کی جاتی ہے۔

[1] تحفة الأحوذي: 5/66. [2] تحفة الأحوذي: 5/66

میت کے لیے قربانی کی دو قسمیں ہیں:

① (پہلی) یہ کہ شرعی قربانی ہو اور وہ یہ ہے کہ جو عید الاضحیٰ میں اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کی جاتی ہے اور اس کا ثواب میت کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن اس سے بھی افضل یہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے قربانی کرے اور اس کے ساتھ زندہ اور فوت شدہ (افراد) کی بھی نیت کر لے تو تبعاً میت بھی اس میں شامل ہو جائے گی کیونکہ نبی ﷺ نے صرف اپنے گھر کے فوت شدگان میں سے کسی کی طرف سے قربانی نہیں کی۔ آپ ﷺ کی تین بیٹیاں زینب، ام کلثوم اور رقیہ رضی اللہ عنہن فوت ہوئیں لیکن آپ ﷺ نے ان کی طرف سے قربانی نہیں کی اور اسی طرح خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ کو بیویوں میں سب سے زیادہ محبوب تھیں، آپ نے ان کے لیے بھی قربانی نہیں کی اور اسی طرح آپ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو جنگ احد میں شہید کر دیے گئے تھے، آپ نے ان کی طرف سے بھی قربانی نہیں کی۔ ہاں! آپ ﷺ نے اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں (مجموعی طور پر زندہ یا فوت شدہ) کی طرف سے قربانی کی ہے۔

② غیر عید الاضحیٰ میں میت کی طرف سے جانور ذبح کرنا جیسا کہ بعض جاہل لوگ ایسا کرتے ہیں کہ میت کے لیے اس کی وفات کے ساتویں روز جانور ذبح کیا جاتا ہے یا اس کی وفات کے چالیسویں روز یا اس کی وفات کے تیسرے روز، یہ بدعت ہے اور جائز نہیں کیونکہ یہ ایسے بے فائدہ کام ہیں جن میں مال کا ضیاع ہے، جس میں نہ تو دینی فائدہ ہے اور نہ دنیاوی بلکہ دینی نقصان ہے اور تمام بدعتیں گمراہی ہیں جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہر بدعت گمراہی ہے۔"[1]

[1] فتاوی منار الإسلام: 2/411، منقول از جریدہ محدث، لاہور، عدد: 277.

میت کی طرف سے کون کون سے اعمال کیے جا سکتے ہیں، ان کا جواب اگلے سوال کے ضمن میں آ جائے گا۔

انگلینڈ کے مسلمانوں کا دوسرے ممالک میں اپنی قربانی کروانا

سوال ای میل کے ذریعے سے یہ سوال پوچھا گیا ہے کہ آیا انگلینڈ کے مسلمان کسی دوسرے ملک میں اپنی قربانی کروا سکتے ہیں یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے بھی اٹھایا گیا ہے کہ حال ہی میں میڈیا پر ایک صاحب نے ایسی قربانی کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔

جواب عرض ہے کہ اس بات میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ ہر گھر پر ایک قربانی واجب (اور بعض فقہاء کے نزدیک سنت موکدہ) ہے اور یہ کہ نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قربانی کے جانور ذبح کیے جیسا کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز عید پڑھی۔ آپ نے خطبہ ختم کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے ایک مینڈھا ذبح کیا اور یہ الفاظ کہے:

«بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، هٰذَا عَنِّي وَعَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِي»[1]

اس بات میں بھی اختلاف نہیں کہ قربانی کرنے کے لیے کسی کو اپنا نائب بنایا جا سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور باقی 37 اونٹوں کو ذبح کرنے کے لیے حضرت علی کو ہدایت کی۔[2]

اور بروایت امام مالک اور بخاری، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے اور اپنے گھر والوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔

[1] سنن أبي داود، الضحايا، حديث: 2810، وجامع الترمذي، الأضاحي، حديث: 1521.
[2] صحيح مسلم، الحج، حديث: 1218.

یہ بھی حجۃ الوداع کا موقع تھا۔ وہ کہتی ہیں: قربانی والے دن ہمارے پاس گائے کا گوشت لایا گیا۔ میں نے پوچھا: یہ کیسا گوشت ہے تو لوگوں نے بتایا کہ نبی ﷺ نے اپنی بیویوں کی طرف سے گائے کی قربانی کی ہے۔ [1]

ابن قدامہ ''المغنی'' میں لکھتے ہیں:

مسئلہ: مستحب یہی ہے کہ مسلمان ذبح کرے، اگر اپنے ہاتھ سے ذبح کرے تو افضل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ذبح کیا تھا اور اس لیے بھی کہ آپ کا یہ فعل تقرب الٰہی کے لیے تھا کہ جس کا خود کرنا کسی کو نائب بنانے سے اولیٰ ہے۔ لیکن اگر کسی کو نائب مقرر کر دے تب بھی جائز ہوگا کیونکہ نبی ﷺ نے تریسٹھ اونٹ ذبح کرنے کے بعد باقی کے لیے نائب مقرر کر دیا تھا۔ اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ حضرت ابن عباس کی طویل حدیث کے مطابق آدمی کا ذبیحہ کے وقت حاضر رہنا مستحب ہے۔ فرمایا: جب تم ذبح کرو تو حاضر رہو کیونکہ ذبیحہ کے خون کے پہلے قطرے کے ساتھ تمھاری مغفرت ہو جائے گی۔ [2]

نبی اکرم ﷺ سے روایت کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ سے کہا: اپنی قربانی کے موقع پر حاضر رہو۔ اس کے خون کے پہلے قطرے کے ساتھ تمھاری مغفرت کی جائے گی۔ [3]

شیخ ابوبکر جابر الجزائری اپنی کتاب ''منہاج المسلم'' میں لکھتے ہیں:

''مستحب تو یہی ہے کہ ذبح خود کرے۔ اگر ذبح کرنے کے لیے دوسرے کو اپنا نائب بنا دے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ اس بارے میں علماء میں کوئی

[1] صحيح البخاري، الحج، حديث: 1709، وصحيح مسلم، الحج، حديث: 1211. [2] اس کی تخریج عنقریب آ رہی ہے۔ [3] المغني: 21/495-496.

اختلاف ہی ہے۔"

ڈاکٹر حسام الدین عفانہ پروفیسر القدس یونیورسٹی (فلسطین) اپنی کتاب "یسئالونک" میں لکھتے ہیں:

"اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ قربانی کے ذبح کرنے میں نیابت جائز ہے، اس لیے اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کو قربانی ذبح کرنے اور اس کا گوشت تقسیم کرنے میں نائب بناتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ قربانی کرنے والا خود قربانی کرے اگر وہ خود ذبح کرنا جانتا ہو اور اگر خود اچھی طرح ذبح نہ کرسکتا ہو تو کسی دوسرے کو اپنا وکیل بنادے۔"

ذبیحہ میں نیابت کرنے والے کا بوقت ذبح قربانی کرنے والے کا نام لینا

سوال ایک سوال یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ کسی دوسرے کی طرف سے ذبح کرتے وقت اس کا نام لینا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب اس بارے میں ابن قدامہ لکھتے ہیں:

مسئلہ: ضروری نہیں کہ ذبح کرتے وقت یہ کہے: "فلاں کی طرف سے" کیونکہ نیت کافی ہے۔ نیت کے کافی ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، پھر بھی اگر اُس کا نام لے لے جس کی طرف سے ذبح کررہا ہے تو بہتر ہوگا۔

فصل: ایک شخص نے قربانی کا جانور متعین کردیا لیکن کسی دوسرے نے بغیر اس کی اجازت کے اسے ذبح کردیا تو یہ قربانی ہوجائے گی اور ذبح کرنے والے پر کوئی تاوان عائد نہ کیا جائے گا۔ یہ رائے امام ابوحنیفہ کی ہے۔

امام مالک کہتے ہیں: یہ تو صرف ایک بھیڑ کا گوشت شمار ہوگا، بھیڑ کے مالک کو تاوان واجب الادا ہوگا اور اسے دوسرا ایک جانور ذبح کرنا ہوگا کیونکہ ذبح کرنا عبادت ہے اور اگر اس کے مالک کی اجازت کے بغیر اس عبادت کو کیا گیا تو وہ ادا نہ ہوگی جیسے کہ زکاۃ کا مسئلہ ہے۔

امام شافعی نے کہا: بھیڑ کے مالک کو اتنا تاوان واجب الادا ہوگا جو بھیڑ کی قیمت (زندہ حالت میں) اور بعد از ذبح قیمت کے درمیان ہو۔

ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ یہ فعل نیت کا محتاج نہیں۔ اگر کوئی دوسرا بھی کر ڈالے تو کافی ہوگا جیسے آدمی کے کپڑے پر نجاست لگ جائے اور کوئی دوسرا اسے دھو ڈالے۔[1]

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ بدنی عبادات، جیسے نماز اور روزے میں نیابت نہیں ہوتی لیکن مالی عبادات جیسے زکاۃ اور قربانی میں نیابت اس لیے جائز ہے کہ اس میں فقراء کو فائدہ پہنچانا مقصود ہوتا ہے، چنانچہ اگر زکاۃ کی رقم فقراء تک پہنچ گئی اور اسی طرح قربانی کا گوشت بھی ذبح کے بعد مستحقین تک پہنچ گیا تو پھر یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ زکاۃ دینے والے نے خود اپنی زکاۃ فقراء تک پہنچائی تھی یا اس کے نائب نے اور اسی طرح قربانی میں بھی یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ آدمی نے خود قربانی کر کے گوشت تقسیم کیا تھا یا اس کی طرف سے کسی اور نے یہ عمل سرانجام دیا تھا۔

کسی دوسرے کی طرف سے قربانی کرنے پر یہ آثار بھی ملاحظہ ہوں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جنین (جو بچہ ابھی شکم مادر میں ہو) کے علاوہ اپنے تمام چھوٹے اور بڑے بچوں کی طرف سے قربانی کیا کرتے تھے اور عقیقہ اپنی تمام اولاد کی طرف

[1] المغني: 3/390.

سے کرتے تھے۔ [1]

معمر کہتے ہیں: میں نے زہری سے پوچھا: کیا ہم غیر حاضر شخص کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں تو انھوں نے کہا: لَا بَاسَ بِهٖ. ''ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

اب آیئے حدیث فاطمہ کی طرف۔ امام حاکم یہ روایت لائے ہیں کہ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے فاطمہ! اپنی قربانی کی طرف کھڑی ہو جاؤ اور وہاں حاضر رہو کیونکہ اس کے خون کا پہلا قطرہ جوں ہی بہے گا تمھارے ہر اس گناہ کی مغفرت ہو جائے گی جو تم نے کیا ہوگا۔ (اور قربانی کے وقت) یہ الفاظ کہو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۝﴾ [2]

عمران نے پوچھا: اللہ کے رسول! کیا یہ بات صرف آپ کے لیے اور آپ کے اہل بیت کے لیے ہے یا تمام مسلمانوں کے لیے ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔'' [3]

امام حاکم تو اپنی ہر روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ صحیح الاسناد ہے گو بخاری و مسلم نے اسے روایت نہیں کیا، اس لیے حقیقت جاننے کے لیے امام ذہبی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اس کی سند میں ابوحمزہ ثمالی نہایت کمزور راوی ہے اور دوسرا راوی اسماعیل بھی اتنا قابل اعتماد نہیں۔ [4]

حاکم حضرت ابوسعید سے بھی یہی روایت لائے ہیں جس کے ایک راوی ''عطیہ''

[1] مصنف عبدالرزاق: 380/4 [2] الأنعام 6: 162، 163 [3] مستدرک حاکم: 222/4 [4] ذیل مستدرک حاکم: 222/4

کے بارے میں ذہبی کہتے ہیں: عطیہ (وَاهٍ جِدًا) بہت کمزور راوی ہے۔[1] امام بیہقی نے بھی یہ روایت ذکر کی ہے، وہاں بھی ابوحمزہ والی سند ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہ وہ واحد روایت ہے جس میں ذبیحہ کے وقت حاضر رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس روایت کے ضعیف ثابت ہو جانے کے بعد ایسا کرنا لازم قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لیے اہلِ علم نے اس امر کو مستحب قرار دیا ہے۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ انگلینڈ میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ کے قریب ہے، گویا کم از کم پانچ لاکھ گھرانے آباد ہیں جو قربانی کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں اب تک ایسی سہولت میسر نہیں کہ پانچ لاکھ قربانیاں ایسے ذبح خانوں میں کی جاسکیں جہاں حلال طریقے سے ذبح کرنے کی اجازت ہو، اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جو حضرات اپنے اپنے علاقوں میں ذبح کرنے پر قادر ہوں وہ وہیں ذبح کرنے کی کوشش کریں۔

لیکن جو ایسا نہ کرسکیں وہ یا تو مسلم ممالک میں اپنے رشتہ داروں کو وکیل بنا دیں یا مسلم رفاہی و خیراتی تنظیموں کا سہارا لیں جو نہ صرف پاک و ہند بلکہ فلسطین اور افریقہ کے کئی قحط زدہ ممالک میں قربانی کا بندوبست کرتی ہیں جہاں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد قربانی کے گوشت سے اپنی بھوک مٹا پاتے ہیں۔

[1] ذیل مستدرک حاکم: 222/4.

حلال وحرام
کے مسائل

جلاٹین یا الکوحل سے بنی ہوئی ادویات کا حکم

سوال اس ملک میں فارمسٹ جو دوائی بیچتے ہیں ان میں حیوانی جلاٹین (Gelatin) سے بنے ہوئے کیپسول بھی ہوتے ہیں۔ یہ جانور اسلامی طریقہ سے ذبح نہیں ہوتے۔ کچھ کیپسول میں سور سے حاصل شدہ جلاٹین بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس طرح بعض سیال دواؤں میں جیسے کھانسی کی دوا میں تھوڑا بہت الکوحل بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ کیا ایسی چیزیں فارمسٹ کے لیے بیچنا جائز ہیں یا نہیں؟ اور ان کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

جواب ایک ہم عصر ازہری عالم شیخ عبداللہ صدیق غماری الکوحل سے بنی ہوئی دواؤں کے بارے میں لکھتے ہیں: اگر دوا الکوحل سے بالکل خالی ہو یا اس میں الکوحل کی اتنی مقدار شامل ہو جو دوا میں حل ہوچکی ہو اور نہ اس کا ذائقہ ہی محسوس ہو، نہ اس کی بو ہی ہو اور نہ عقل ہی پر اس کا کوئی اثر ہو (یعنی انسان اسے پینے کے بعد بہکی بہکی باتیں نہ کرے) تو اس کا پینا جائز ہے لیکن اگر تینوں چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی پائی گئی تو پھر اس کا استعمال ناجائز ہوگا۔

جہاں تک حلال جانوروں کی ہڈیوں سے حاصل کردہ جلاٹین کا تعلق ہے تو وہ جائز ہے لیکن سور چونکہ نجس العین ہے، اس لیے سور سے حاصل کردہ جلاٹین استعمال میں نہیں لانی چاہیے۔ جو چیز استعمال کے لیے جائز ہو اس کا بیچنا بھی جائز ہے۔

شراب سے بنے ہوئے سرکے کا حکم

سوال ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سرکہ کھاتے تھے، جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ سرکہ الکوحل سے بنتا ہے، جیسے اسپرٹ، وائن یا سائڈر سے بنا ہوا ہے۔ ایسے سرکے مسلمان کے لیے حرام ہیں یا حلال؟ اور رسول اللہ ﷺ کس قسم کا سرکہ کھاتے تھے؟

جواب اس سوال کے جواب سے قبل ایک شرعی اصول ملاحظہ ہو اور وہ ہے استحالہ، یعنی ایک چیز کی حالت کا بدل جانا، چاہے وہ نجاست سے پاکی کی شکل میں ہو، جیسے ہر قسم کی کھاد جس میں گندگی ملی ہو اور اس سے پھل دار درخت کا اگنا یا جیسے مرغیوں کا گندگی کھانا اور پھر اس کا انڈے کی شکل میں تبدیل ہونا اور پھر طاہر چیز کا نجاست میں تبدیل ہونا، جیسے گائے بھینس بکری کا چارا کھانا اور پھر اس کے نتیجے میں تین چیزیں حاصل ہوتی ہیں، گوبر، خون اور دودھ۔ گوبر اور خون ناجائز ہیں جبکہ دودھ کا پینا جائز ہے۔

ایسے ہی گھروں سے خارج ہونے والا گندا پانی اگر عمل تطہیر کے نتیجہ میں اتنا صاف ہو جائے کہ اس کے ذائقے، رنگ اور بو میں نجاست کا کوئی اثر باقی نہ رہے تو اس پر پاک ہونے کا حکم لگا دیا جائے گا اور ایسے پانی کو وضو اور غسل کے لیے استعمال میں لانا جائز ہوگا۔

اب آئیے سرکے کی اصل کی طرف۔ سرکہ کئی چیزوں سے بنایا جاتا ہے، جس میں سیب، انگور، جو اور صنعتی الکوحل شامل ہیں بلکہ یوں کہیے کہ ہر اس سائل (مائع) سے بنایا جاسکتا ہے جسے عمل تخمیر کے نتیجے میں الکوحل میں تبدیل کیا جاسکے۔ پھلوں کے رس میں شکر ہوتی ہے۔ اس میں اگر خمیر لانے والا مادہ شامل کر دیا جائے تو یہ الکوحل اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر ہوا سے آکسیجن کشید کرنے کے عمل سے

ایسٹیک ایسڈ اور پانی کی شکل میں ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے جسے سرکہ کہا جاتا ہے۔

سرکہ بنانے کے تین مراحل ہوئے: بنیاد ایک پاک مادہ تھا، جیسے انگور یا سیب، دوسرے مرحلہ میں اسے الکوحل میں تبدیل کیا گیا، تیسرے مرحلہ میں الکوحل کا اثر زائل کرنے کے بعد سرکہ میں تبدیل کیا گیا۔

اصول استحالہ کی روشنی میں ہر قسم کا سرکہ جائز ہونا چاہیے کہ اس میں نشہ پیدا کرنے کا وصف باقی نہیں رہا ہے، بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر شراب دھوپ میں پڑے رہنے کے باعث خود بخود سرکہ بن جائے تو جائز ہے لیکن اگر اسے جان بوجھ کر سرکہ میں تبدیل کیا جائے تو ایسا کرنا ناجائز ہے۔ یہ احادیث ملاحظہ ہوں:

حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سے شراب کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آیا اسے سرکہ بنایا جاسکتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ چند یتیموں نے ورثے میں شراب حاصل کی تو اس کا کیا کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ''شراب کو بہادو۔'' انھوں نے پوچھا: ہم اس کا سرکہ نہ بنالیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں!''[2]

حضرت ابوسعید بیان کرتے ہیں کہ جب شراب حرام ہوئی تو ہم نے نبی ﷺ سے پوچھا: میری کفالت میں ایک یتیم ہے جس کے پاس کچھ شراب ہے، تو آپ نے اسے بہادینے کا حکم دیا۔[3]

[1] صحيح مسلم، الأشربة، حديث: 1983. [2] سنن أبي داود، الأشربة، حديث: 3675، ومسند أحمد: 119/3. [3] جامع الترمذي، البيوع، حديث: 1263، ومسند أحمد: 26/3.

ان احادیث سے یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس شراب ہو تو وہ اس کا سرکہ بنا کر استعمال میں نہ لائے۔ ایسی صورت ان لوگوں کو پیش آ سکتی ہے جو سرکہ خود بنا کر اپنے استعمال میں لاتے ہوں۔

اس ممانعت کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ شراب تازہ تازہ حرام ہوئی تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے شراب کی حرمت کو دلوں میں راسخ کرنے کے لیے اس بات کا حکم دیا کہ شراب کو بہا دیا جائے اور اسے سرکہ بنا کر بھی استعمال میں نہ لایا جائے۔ موجودہ زمانے میں سرکہ بنانے کا عمل شراب بنانے کے عمل سے بالکل جدا ہے۔ سرکہ کو سرکہ کی خاطر ہی بنایا جاتا ہے نہ کہ شراب کی فالتو مقدار کو ٹھکانے لگانے کے لیے سرکہ میں تبدیل کیا جاتا ہے، اس لیے سرکہ کی کسی بھی قسم کے استعمال میں قباحت نہیں ہونی چاہیے۔

ابلے انڈے میں خون ہو تو اسے کھانے کا حکم

سوال مہربانی سے انڈوں کے حلال اور حرام ہونے کی صورتوں کا بیان کیجیے۔ اگر ابلے ہوئے انڈے میں خون نظر آئے تو پھینک دینا چاہیے؟ کیا مسلمان کے لیے بہتر ہے کہ وہ ابلے ہوئے انڈے نہ کھائے؟

جواب جانور ذبح کرتے وقت جو خون بہہ رہا ہو اس کا پینا حرام ہے لیکن جو خون ہڈیوں میں لگا رہ جائے اور سالن پکاتے وقت ظاہر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی مسئلہ انڈوں کے اندر جمے ہوئے خون کا بھی ہے۔

دودھ بینکوں کے دودھ کا حکم

سوال برطانیہ کے ہسپتالوں میں ناقص الخلقت نوزائیدہ بچوں کو دودھ بینکوں کا دودھ

پلایا جاتا ہے جو کہ ان کی صحت کے لیے ضروری ہے، کیا ایسے دودھ سے رضاعت ثابت ہوجاتی ہے؟ (ڈاکٹر، ت۔ا، برمنگھم)

جواب اس موضوع پر جرمنی میں مقیم ایک عرب عالم نے، جو کہ ماہر فلکیات، طب اور طبیعات ہیں، سیر حاصل بحث کی ہے، ڈاکٹر محمد ہواری کے نام سے معروف ہیں۔ ذیل میں ان کی بحث کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

ماں کے دودھ کی افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا، خاص طور پر ان بچوں کے لیے جو قدرتی ولادت کی مدت سے قبل پیدا ہوجاتے ہیں۔ ان کے لیے ماں کا دودھ نہ صرف امراض کے مقابلے میں قوت برداشت پیدا کرتا ہے بلکہ اعضائے تنفس اور اعضائے ہضم کو لاحق ہونے والے التہابات سے بھی بچاتا ہے۔ ماں کے دودھ میں زنک کی بھی ایک خاص مقدار پائی جاتی ہے جو گائے بھینس کے دودھ میں نہیں پائی جاتی، انھی وجوہات کی بنا پر دودھ کے بینک کا تصور ابھرا اور 1910ء میں بوسٹن (امریکہ) میں پہلا دودھ کا بینک قائم کیا گیا۔ ایسے بینکوں میں ان عورتوں کا دودھ محفوظ کیا جاتا ہے جو ولادت کے قریب ہوں یا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی ہوں اور ضرورت سے زائد دودھ دینے پر تیار ہوں۔ اس دودھ کی دو قسمیں ہیں:

① ماں کا دودھ جو اس کے اپنے بچے کو پلانے کے لیے محفوظ کیا جاتا ہے۔

② کسی بھی عورت کا دودھ جس کے ساتھ کسی دوسری عورت کا دودھ بھی ملایا جاسکتا ہے اور کسی بھی ضرورت مند بچے کو دیا جاسکتا ہے۔

چونکہ دودھ سے رضاعت کا حکم ثابت ہوتا ہے جیسے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”رضاعت سے بھی وہی حرمت ثابت ہوتی ہے جو کہ نسب سے ثابت ہوتی

ہے۔''[1] اس لیے دودھ کے بینکوں کے بارے میں بین الاقوامی اسلامی فقہ کونسل کے اجلاس منعقدہ جدہ (سعودی عرب) بتاریخ دسمبر 1985ء میں یہ فیصلہ رقم کیا گیا۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آئے:

① دودھ بینکوں کا تجربہ مغربی ممالک میں کیا گیا اور جوں جوں اس کے منفی پہلو سامنے آتے گئے، اس کا استعمال کم ہوتا گیا۔

② اسلام میں رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور شریعت میں نسب کی حفاظت ایک مقصد کی حیثیت رکھتی ہے، جبکہ دودھ بینکوں کا استعمال نسب کو ضائع کرسکتا ہے یا اس سلسلے میں شکوک وشبہات کو جنم دے سکتا ہے۔

③ عالم اسلام میں اجتماعی طور پر ایسے روابط پائے جاتے ہیں جن کے ذریعے سے ان بچوں کو ضرورت کے مطابق قدرتی رضاعت مہیا کردی جاتی ہے جو یا تو ناقص الخلقت ہوں یا کم وزن ہوں یا انسانی دودھ کے خاص طور پر محتاج ہوں، اس لیے عالم اسلام میں دودھ بینکوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس لیے کونسل یہ فتویٰ دیتی ہے کہ عالم اسلام میں دودھ بینکوں کے قیام کو ممنوع قرار دیا جائے اور اگر ان بینکوں سے استفادہ کیا گیا ہو تو اس سے رضاعت کی بنا پر حرمت ثابت ہوجاتی ہے۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے اس مسئلہ میں مزید بحث اور تحقیق کی گنجائش ہے، وہ اس لیے کہ دودھ بینکوں کی تعداد میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہورہا ہے۔

[1] صحيح البخاري، النكاح، حديث:5099، وصحيح مسلم، الرضاع، حديث:1445.

رضاعت کے بارے میں شرعی احکام کا خلاصہ یہ ہے:

رضاعت اس عمل کا نام ہے جس کے نتیجے میں ایک بچے کے معدے میں عورت کا دودھ پہنچتا ہے اور بقول جرجانی: ''رضاعت نام ہے بچے کا مدت رضاعت میں ایک عورت کی چھاتی سے دودھ کا چوسنا۔''[1]

رضاعت کا حکم: ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَأُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ وَأَخَوَٰتُكُم مِّنَ ٱلرَّضَٰعَةِ﴾

''(اور حرام ہیں تم پر) تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا اور رضاعت کی وجہ سے تمھاری بہنیں۔''[2]

نبی ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں کہا: ''یہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔''[3]

رضاعت کی شرائط: جمہور کے نزدیک جس رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے، وہ ولادت کے بعد شروع کے دو سال ہیں، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَٱلۡوَٰلِدَٰتُ يُرۡضِعۡنَ أَوۡلَٰدَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِۖ لِمَنۡ أَرَادَ أَن يُتِمَّ ٱلرَّضَاعَةَ﴾

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں (خاص طور پر) اس باپ کی خواہش کے مطابق جو پوری مدت کے لیے دودھ پلوانا چاہتا ہو۔''[4]

اور ارشاد فرمایا: ﴿وَحَمۡلُهُۥ وَفِصَٰلُهُۥ ثَلَٰثُونَ شَهۡرًا﴾

''اور حمل کی اور دودھ چھڑانے کی کل مدت تیس مہینے ہے۔''[5]

[1] التعریفات، ص: 148. [2] النسآء 23:4. [3] صحیح البخاري، الشهادات، حدیث: 2645، وصحیح مسلم، الرضاع، حدیث: 1446، 1447. [4] البقرة 233:2. [5] الأحقاف 15:46.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا رَضَاعَ إِلَّا مَا شَدَّ الْعَظْمَ وَأَنْبَتَ اللَّحْمَ»

''رضاعت وہی معتبر ہے جو ہڈیوں کو مضبوط بنائے اور گوشت کو اگائے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھر داخل ہوئے، جہاں ایک آدمی موجود تھا تو نبی ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، جس پر انھوں نے کہا: اللہ کے رسول! یہ تو میرا رضاعی بھائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی طرح دیکھ بھال کر لو کہ تمھارے بھائی کون ہیں، اس لیے کہ رضاعت کا اعتبار بھوک (دودھ کی حاجت) کے زمانے سے ہوتا ہے۔''

حرمت کے لیے کتنی دفعہ دودھ پیا جائے؟: اہل علم کی آراء میں سے ایک رائے یہ ہے کہ چاہے تھوڑا دودھ پیا جائے یا زیادہ، حرمت ثابت ہو جاتی ہے، اس لیے کہ قرآن میں رضاعت کا لفظ مطلق وارد ہوا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ کم سے کم تین دفعہ پیا جائے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ کم سے کم پانچ دفعہ پیا جائے۔

ہمارے نزدیک تیسری رائے راجح ہے، جس پر امام شافعی اور امام احمد رحمہ اللہ کا عمل ہے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہے: ''قرآن میں دس دفعہ دودھ پینے کا ذکر تھا، جس سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے، پھر یہ حکم پانچ دفعہ پینے کا حکم آنے سے منسوخ ہو گیا۔''

سنن أبي داود، النكاح، حديث: 2060. صحيح البخاري، النكاح، حديث: 5102، وصحيح مسلم، الرضاع، حديث: 1455. صحيح مسلم، الرضاع، حديث: 1452.

ایک دفعہ سے کیا مراد ہے؟: اس سے مراد بچے کا چھاتی سے اس وقت تک دودھ پینا ہے جب تک کہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا منہ نہ ہٹالے، رکاوٹ کا مطلب ہے کہ سانس لینے کی بنا پر یا بطور کھیل یا دودھ پلانے والی کے خود اسے ہٹانے کے بغیر اس نے اپنی مرضی سے دودھ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح اگر پانچ مرتبہ دودھ پیے تو حرمت ثابت ہوگی۔

رضاعت سے کون کون سے رشتے ثابت ہوتے ہیں؟: بچے نے جس عورت کا دودھ پیا ہے وہ اس کی رضاعی ماں اور اس کا شوہر اس کا رضاعی باپ کہلائے گا، یعنی ایسی عورت سے نکاح کرنا ناجائز ہوگا اور اس کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا یا سفر کرنا جائز ہوگا، اس کے علاوہ اس بچے کی اولاد اور اولاد کی اولاد کا رشتہ بھی رضاعی ماں سے بحیثیت دادی یا نانی قائم ہوجائے گا۔

دودھ پلانے والی عورت کے اور اس کے شوہر (جس کی وجہ سے دودھ اترا ہے) کے بچے دودھ پینے والے بچے کے رضاعی بھائی اور بہن کہلائیں گے۔ ان دونوں کی اولاد کی اولاد رضیع (دودھ پینے والے بچے) کے لیے بمنزلہ بھائیوں اور بہنوں کی اولاد ہوگی۔

دودھ پلانے والی کے بھائی اس دودھ پینے والے بچے کے ماموں اور اس کی بہنیں اس کی خالائیں ہوں گی۔ اس کے شوہر کا باپ اس کا دادا اور ماں اس کی دادی ہوگی۔ اس کے شوہر کے بھائی اس کے چچا اور بہنیں پھوپھیاں ہوں گی۔

اس کے تمام اقرباء جیسے نسب میں اس کے رشتہ دار ہیں اس بچے کے بھی رشتے دار ہوں گے۔

لیکن رضیع (دودھ پینے والے بچے) کے ماں باپ، بھائی بہن، چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی کا مرضعہ (دودھ پلانے والی) کے ساتھ کوئی حرمت کا رشتہ نہیں ہو گا، یعنی

مرضعہ اس بچے کے باپ، بھائی، چچا، ماموں سے نکاح کرسکتی ہے۔

اس طریقے سے اس کا شوہر بچے کی ماں، بہن، خالہ، پھوپھی سے نکاح کرسکتا ہے اور اس طرح اس عورت کے بچے یا اس کے شوہر کے بچے، رضیع کے بہن بھائیوں سے رشتہ ازدواج قائم کرسکتے ہیں۔

دودھ بینکوں کے بارے میں دوسرا نقطۂ نظر: موجودہ دور کے ایک فاضل عالم (ڈاکٹر یوسف قرضاوی) کی رائے میں دودھ بینک سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی، ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

① کیا رضاعت کا سبب صرف ہڈیوں کا مضبوط بنانا اور گوشت کا اگانا ہے؟ اگر اسے سبب مانا جائے تو پھر کسی بھی خاتون کے خون کے عطیہ کے بارے میں کیا کہا جائے گا، وہ اس لیے کہ خون سے دودھ کی نسبت زیادہ قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ بقول ابن حزم قرآن نے دودھ پلانے والی کو ماں (امہات) سے تعبیر کیا ہے کہ جس سے صرف دودھ کا حاصل کرنا مراد نہیں بلکہ ماں کی شفقت اور اس کے جسم سے لپٹ کر دودھ پینے کی کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور یہ بات اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب بچے نے خاتون کی چھاتی سے لگ کر دودھ پیا ہو، نہ کہ یہ دودھ ایک بوتل میں انڈیل کر اسے پلا دیا گیا ہو یا بطور حقنہ (انجکشن) اس کے جسم میں داخل کیا گیا ہو۔

② دودھ کے بینک سے رضاعت کا اس فطری رضاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

③ اس بات میں بھی شک ہے کہ دودھ کس عورت کا تھا، کتنی مقدار میں اس نے پیا، کیا اس کا پینا پانچ دفعہ کے برابر تھا یا نہیں؟

④ اس بات میں بھی شک ہے کہ اس دودھ میں کسی دوسری عورت کا بھی دودھ شامل

ہو اور جہاں شک ہو وہاں حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''اگر رضاع کے وجود میں شک ہو یا اس کے عدد کے بارے میں کہ پورے پانچ مرتبہ ہوا یا نہیں؟ تو حرمت ثابت نہیں ہوگی کیونکہ یقین شک کی بنا پر زائل نہیں ہوتا جیسا کہ طلاق کے ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو۔''

اس رائے کے حامل شیخ عبداللطیف حمزہ سابق مفتی مصر بھی رہے ہیں، یعنی دودھ بینک سے حاصل کردہ دودھ سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی اور اس رائے سے شام کے مشہور عالم مصطفیٰ الزرقاء نے بھی اتفاق کیا ہے۔

میرا رجحان بھی اسی رائے کی طرف ہے، الا یہ کہ دودھ بینک میں ہر عورت کا دودھ علیحدہ علیحدہ محفوظ کیا گیا ہو اور اس عورت کا نام و پتہ بھی بچے کے کفیلوں کو دیا جائے لیکن اگر یہ دودھ مختلف ہو تو پھر مندرجہ بالا دلائل کی بنا پر حرمت ثابت نہیں ہو گی۔ واللہ أعلم.

باپ کی کمائی مشکوک ہو اور ماں نے کم علمی سے سود لیا ہو تو ایسی جائیداد کی وراثت

سوال میں ایک شادی شدہ خاتون ہوں، دو بچے ہیں اور میرے شوہر متوسط آمدنی کے مالک ہیں۔ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے اور انھوں نے اپنے پیچھے کچھ مال، سونا اور اپنے آبائی شہر میں ایک مکان چھوڑا ہے۔ یہ سب کچھ انھیں ہمارے والد سے بطور ہدیہ ملا تھا لیکن میرے والد کی کمائی کے بارے میں شک کیا جاتا ہے کہ وہ حرام کمائی

تھی لیکن جب والدہ نے اس کے بارے میں پوچھا تو والد نے اس کمائی کا مال حرام ہونے سے انکار کیا۔ میری والدہ نے یہ مال بھی کسی حرام مصرف میں خرچ نہیں کیا بلکہ اس مال سے ہماری بھی مدد کی اور دوسرے کئی خیر کے کام بھی کیے لیکن ایک غلط حرکت ان سے ضرور سرزد ہوئی اور وہ یہ کہ اس مال کو بینک کے سودی کھاتے میں رکھا اور وہ بھی اسلام سے اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کی بنا پر۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم ورثہ کے طور پر یہ مال لے سکتے ہیں اور شک وشبہ کو رفع کرنے کے لیے آیا ہم کچھ مال صدقہ کردیں یا سرے سے یہ ورثہ نہ لیں، حالانکہ ہم ضرورت مند بھی ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ہم سات بہنیں ہیں، سوائے ایک کے سب شادی شدہ ہیں تو کیا ہمارے اخیافی بھائی (ماں کی طرف سے بھائی) ہمارے ساتھ وراثت میں شریک ہوں گے؟

جواب جہاں تک مال وراثت کا تعلق ہے تو آپ کے والد انکار کر چکے ہیں کہ وہ مال حرام تھا، نہ آپ کے پاس اس کے حرام ہونے کی کوئی دلیل ہی ہے۔ آپ کی والدہ نے یہ مال بطور ہدیہ وصول کیا تھا تو وہ ان کے لیے حلال تھا۔ جہاں تک اس کے سودی کھاتے میں رکھنے کا سوال ہے تو اصل مال تو شروع ہی سے حلال ہونے کی بنا پر حلال ہی شمار ہوگا، چاہے وہ سودی کھاتے میں کیوں نہ رکھا گیا ہو کیونکہ سودی کھاتے میں رکھنے کی وجہ سے اصل مال حرام نہیں ہوگا، البتہ اس مال پر حاصل ہونے والا سود یقیناً حرام ہے لیکن چونکہ آپ نے یہ سارا مال (اصل زر مع سود) بطور میراث حاصل کیا ہے تو ہاتھ بدلنے کی بنا پر آپ کے لیے حلال ہوگا۔ (ہاتھ بدلنے سے مراد کہ پہلے شخص نے تو مال حرام طریقے سے حاصل کیا لیکن جب دوسرے شخص کے ہاتھ میں وہ ایک جائز طریقے سے آیا تو پہلے آدمی کا گناہ دوسرے کو منتقل نہیں ہوگا) اور قاعدہ ہے

کہ حرام اگر ایک آدمی کے ذمہ پر ہو اور وہ چیز عین حرام بھی نہ ہو اور پھر دوسرے شخص کے ذمہ میں جائز طریقے سے چلی جائے تو حرمت دوسرے شخص تک منتقل نہیں ہوگی اور یہ واضح ہے کہ آپ لوگوں کو یہ مال ایک جائز سبب (یعنی وراثت) کی بنا پر ملا ہے۔

یہاں تک تو اس کے جائز ہونے کا حکم تھا لیکن افضل یہ ہوگا کہ سود والی رقم فقراء اور مساکین پر خرچ کر دی جائے اور سودی کھاتے سے اس رقم کو نکال لیا جائے اور جہاں تک وراثت کی تقسیم کا تعلق ہے تو ترکے کا دو تہائی ساتوں بہنوں میں تقسیم ہوگا اور باقی ایک تہائی اخیافی بھائیوں اور بہنوں میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ مرد کو عورت سے دوگناہ حصہ ملے گا لیکن اگر صرف مرد ہوں یا صرف عورتیں ہوں تو ان میں برابر برابر حصہ تقسیم ہوگا۔

خریداری پر انعامی سکیم رکھنا

سوال عموماً سپر مارکیٹس کی جانب سے خریداری کرنے پر کچھ پوائنٹس دیے جاتے ہیں، مقررہ پوائنٹس کی وصولی پر خریدار کو پانچ یا دس پونڈ کا واؤچر دیا جاتا ہے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے؟ (قاری عبدالسمیع، برمنگھم)

جواب یہ صورتحال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی دکان دار یہ کہے کہ تم میری دکان سے دو چیزیں خریدو گے تو ایک مزید مفت ملے گی اور اس سے مقصود لوگوں کو دکان سے خریدنے پر ابھارنا ہوتا ہے۔ آپ نے جو صورت لکھی ہے اس میں بجائے اس کے کہ ایک چیز مزید مفت دی جائے، ایک واؤچر دیا جاتا ہے جس سے آپ ایک یا مزید اشیاء خرید سکتے ہیں۔ اس معاملے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

انفرادی طور پر مارکیٹ سے کم ریٹ پر چیز فروخت کرنا

سوال میں ایک ٹیک اوے ریسٹوران کا مالک ہوں۔ میرے پڑوس میں ایک دوسرے مسلمان کا بھی ویسا ہی بزنس ہے۔ پچھلے دنوں اس نے بازار کے مقابلے میں اپنے ریٹ آدھے کر دیے، چنانچہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہوگیا اور مجھے کافی خسارہ ہوا تو کیا شرعاً ایسا کرنا اس کے لیے جائز تھا؟

جواب اس مسئلے میں پہلے دو ائمہ کی رائیں ملاحظہ ہوں:

مؤطا کی روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جو بازار میں کشمش بیچ رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: یا تو اپنا نرخ بڑھاؤ یا ہمارے بازار سے اٹھ جاؤ۔ [1] امام مالک کہتے ہیں: اگر کوئی شخص بازار کو خراب کرنا چاہے اور اس مقصد کے لیے نرخ گھٹا دے تو اس سے کہا جائے گا: یا تو لوگوں کا سا نرخ رکھو اور یا پھر یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ [2]

امام شافعی رحمہ اللہ نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ وہ مذکورہ بالا روایت کو محدث ''دراوردی'' سے لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ روایت اس طرح بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عیدگاہ والی مارکیٹ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے پاس سے گزرے جو اپنے سامنے دو تھیلیوں میں کشمش بیچ رہے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ نرخ کیا ہے؟ حاطب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ایک درہم میں دو مُدّ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے بتایا گیا ہے کہ

[1] مؤطأ إمام مالك، البيوع، حديث: 1349. [2] المجموع شرح المهذب: 34/13.

طائف سے ایک قافلہ کشمش لے کر آیا ہے، وہ تمھارے اس نرخ سے دھوکا کھا جائیں گے، لہٰذا یا تو اپنا نرخ بڑھاؤ اور یا پھر اپنی کشمش گھر لے جاؤ اور وہاں جس نرخ سے چاہو بیچو۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر لوٹے اور دوبارہ اس معاملے پر غور کیا، پھر حاطب کے پاس ان کے گھر آئے اور کہا: جو میں نے تم سے کہا تھا، وہ میرا حکم تھا نہ ہی فیصلہ بلکہ میں نے اہل مدینہ کی بھلائی چاہی تھی، لہٰذا جاؤ جہاں اور جیسے چاہو بیچو۔ ❶

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث مشہور ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے قول کے مخالف بھی نہیں کیونکہ انھوں نے حدیث کا کچھ حصہ بیان کیا ہے یا ان سے روایت کرنے والوں نے حدیث کا ایک ٹکڑا لے لیا ہے لیکن دراوردی نے حدیث اول تا آخر ساری بیان کی ہے اور اس کے مطابق میں کہتا (مسئلہ بیان کرتا) ہوں کیونکہ لوگوں کا اپنے اموال پر حق ہے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کی مرضی کے بغیر ان کا سارا مال یا کچھ مال وصول کر لیں سوائے ان صورتوں کے کہ جس میں ایسا کرنا جائز ہو اور جہاں تک مذکورہ بالا صورت کا تعلق ہے تو وہ ناجائز صورتوں میں سے نہیں ہے۔ ❷

مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ اگر قیمتوں کے بہت زیادہ اتار چڑھاؤ سے لوگوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو حکومت نرخ مقرر کر سکتی ہے، وگرنہ عام حالات میں ہر دکان دار کو اپنا نرخ متعین کرنے کی اجازت ہے۔

اس موضوع پر امام ابن قیم نے اپنی کتاب الطرق الحکمیۃ میں بحث کی ہے۔

❶ السنن الکبریٰ للبیہقي: 29/6. ❷ المجموع شرح المهذب: 35/13، والحاوي في فقه الشافعي: 407/5.

شراب اور سور کی فروخت کنندہ مارکیٹ سے حلال اشیاء کی خرید وفروخت کا حکم

سوال کیا ایسی مارکیٹ سے حلال اشیاء خریدی جاسکتی ہیں جہاں شراب اور سور کے گوشت کی خرید وفروخت بھی ہوتی ہو؟ (ابو عائشہ، گلاسگو)

جواب اگر ایسے کاروبار میں کوئی ملوث ہو تو اسے نصیحت کی جائے تاکہ وہ حرام اشیاء کی فروخت سے باز آجائے اور مسلمان پورے انشراح قلب کے ساتھ اس کی دکان سے خرید و فروخت کرسکیں لیکن اگر وہ باز نہیں آتا ہے تو ایسے شخص کا بائیکاٹ کرنا چاہیے تاکہ اسے غلط فعل پر نظر ثانی کرنے کا موقع ملے۔ بوقت ضرورت حلال اشیاء خریدی جاسکتی ہیں۔ اِتَّقُوا الشُّبُهَاتِ (شک وشبہ سے بچو) کے تحت ایسی جگہوں پر جانا جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام ہوتے ہوں، جائز نہیں ہے۔ اسی لیے ضرورت کی شرط لگائی گئی ہے۔

راقم کو بیس اکیس برس پہلے اسپین کے سفر کا تجربہ یاد ہے کہ جہاں دوران ڈرائیونگ نیند بھگانے کے لیے ''کافی'' کی شدید احتیاج ہوتی تھی لیکن میلوں دور ہائی وے پر سوائے شراب خانہ کے اور کوئی کافی ہاؤس نظر نہیں آتا تھا، اس لیے مجبوراً اتنی دیر وہاں رکتے تھے کہ جس دوران میں کافی پی جاسکے۔

غیر شرعی طریقے سے ذبح کرنے والے مذبح خانے میں ملازمت کرنا

سوال کیا ایسے مذبح خانوں میں ملازمت جائز ہے جہاں مرغیوں کو غیر شرعی طریقے سے ذبح کیا جاتا ہو، نیز شریعت میں ذبح کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب غیر شرعی طریقے سے جانور کا ذبح کرنا گناہ ہے اور گناہ کے کام میں تعاون کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

''گناہ اور سرکشی کے کاموں پر تعاون نہ کرو۔''[1]

البتہ اگر ایک مسلمان جو کہ ایک غیر مسلم مذبح خانے میں کام کرتا ہو لیکن جانور کو باقاعدہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرتا ہو تو اس کی کمائی کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔ ذبیحہ کے حلال ہونے کے لیے چار شروط کا پایا جانا ضروری ہے، جن میں سے پہلی دو شرطیں قرآن سے اور دوسری دو شرطیں حدیث سے ماخوذ ہیں:

① ذبح کرنے والا مسلمان ہو یا اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہو۔

② ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے (اگر بھول جائے تو کوئی حرج نہیں، ہاں اگر اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا تو حلال نہ ہوگا)۔

③ گردن پر اس طرح چھری چلائی جائے کہ خون کی دو رگیں اور ہوا اور خوراک کی دو نالیاں کٹ جائیں۔

④ چھری یا کسی تیز دھار آلے سے ذبح کیا جائے۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مطلقاً جائز ہے یا نہیں؟

جواباً عرض ہے کہ جہاں تک یہود کا تعلق ہے وہ ذبیحہ کی ساری شرائط پوری کرتے ہیں، اس لیے ان کا ذبیحہ (کوشر Kosher) جائز ہے اور جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے تو ان کے ذبیحے میں دو باتوں کا فقدان ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اللہ کا نام نہیں لیتے،

[1] المآئدۃ 2:5.

دوسرے یہ کہ بھیڑ گائے وغیرہ کو ذبح سے پہلے برقی جھٹکا دیتے ہیں، یا اگر جانور بڑا ہو تو اسے ہتھوڑے کی مانند ایک بلٹ ماری جاتی ہے، جس سے جانور بے ہوش ہو جاتا ہے اور پھر اسے ذبح کیا جاتا ہے۔

اور اگر مرغی کا ذبیحہ ہو تو مرغیوں کو پانی کے ایسے ٹب سے گزارا جاتا ہے جس میں برقی رو دوڑ رہی ہوتی ہے، جونہی الٹی لٹکی ہوئی مرغی کا سر اس پانی سے گزرتا ہے مرغی بے ہوش ہو جاتی ہے اور پھر ایک خود بخود گھومنے والے تیز دھار آلے کی زد میں اس کی گردن گزرتی چلی جاتی ہے اور خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اس طریقہ سے مرغی کے ذبیحہ کا تعلق ہے تو برطانوی فوڈ انڈسٹری کی اپنی رپورٹ کے مطابق تیس فی صد مرغیاں برقی رو سے مر جاتی ہیں۔ گویا ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ کون سی مرغی بوقت ذبح زندہ تھی اور کون سی مردہ۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے: «دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ»

''جس میں شک ہو اسے چھوڑ دو اور اسے اپنا لو جس میں شک نہ ہو۔''[1]

کیونکہ مرغی کے ذبیحہ میں شک واقع ہو گیا، اس لیے عیسائیوں کے کمرشل ذبیحہ سے بچنا چاہیے۔ جہاں تک دوسرے جانوروں کا تعلق ہے تو یہ جانور ''موقوذة'' (چوٹ کھایا ہوا جانور) کی تعریف میں آتے ہیں۔ گو سورۂ مائدہ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا جانور جو دم گھٹنے کی بنا پر، چوٹ لگنے کی بنا پر، اونچائی سے گرنے کی بنا پر، دوسرے جانور کے سینگ سے زخمی ہونے کی بنا پر اگر مرنے کے قریب ہو اور مرنے سے پہلے اسے ذبح کر لیا جائے تو اس کا کھانا جائز ہے لیکن یہ اضطراری ذبیحہ کا بیان

[1] جامع الترمذي، صفة القيامة، حديث: 2518، وسنن النسائي، الأشربة، حديث: 5714

ہے، نہ کہ اختیاری ذبیحہ کا۔

ظاہر ہے اگر تازہ پھل دستیاب ہو تو ایک انسان گلا سڑا پھل کیوں کھائے گا؟ اسی وقت کھانے پر مجبور ہوگا جب بھوک سے بے تاب ہو اور صرف گلا سڑا پھل ہی موجود ہو، اس لیے اس قسم کے ذبیحہ کو ہم بالکل حرام تو نہیں کہہ سکتے لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ جہاں حلال گوشت دستیاب ہو، وہ بھی نہ ہو تو ''کوشر'' موجود ہو تو پھر مشینی ذبیحہ کیوں کھایا جائے؟

بعض لوگ یہ استدلال بھی کرتے ہیں کہ جب قرآن نے اہل کتاب کا ذبیحہ جائز رکھا ہے تو آپ یہ شرطیں کیوں لگاتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ صرف اسی لیے تو جائز رکھا گیا کہ وہ ایک کتاب (تورات) کے حامل ہیں، جس میں انھیں ذبح کرنے کا طریقہ بتا دیا گیا ہے۔ ہم مسلمان بھی تو اہل قرآن ہونے کی بنا پر ایک مسلمان کا ذبیحہ کھاتے ہیں کہ قرآن میں ذبیحہ کی لازمی شرط بتا دی گئی ہے۔ اب اگر مسلمان یا عیسائی اپنی کتاب میں دی گئی شرائط کو ملحوظ نہ رکھے تو وہ کتاب کے ہوتے ہوئے بھی جاہل قرار دیا جائے گا اور اسی لیے اس کا ذبیحہ جائز متصور نہ ہوگا۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اہل کتاب میں سے یہود نے کتاب کی شروط ملحوظ رکھیں تو ان کا ذبیحہ جائز قرار پایا اور عیسائیوں نے ان شروط کو پس پشت ڈال دیا، اس لیے ان کا ذبیحہ جائز نہ رہا۔

ہر نوکری میں حرام کی آمیزش ہو تو آدمی کیا کرے؟

سوال میں کام کی تلاش میں ہوں لیکن ہر ملازمت میں کچھ نہ کچھ حرام کی آمیزش ہے تو کیا خالی بیٹھا رہوں، جب تک کہ مجھے خالص حلال ملازمت نہ مل جائے؟

جواب ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لیے حلال رزق کمانے کا حکم دیا گیا ہے، رزق حلال سے گھر میں، بچوں میں، مال میں برکت آتی ہے، دعائیں قبول ہوتی ہیں اور اگر رزق حرام ہو تو یہ برکت اُٹھ جاتی ہے اور انسان کی دعائیں اس کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ میں کیا کروں کہ میری دعائیں قبول ہوتی چلی جائیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

«أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ»

''اپنا کھانا پاک کرلو، مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔''[1]

اور پھر یہ بھی فرمایا:

«ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ، يَا رَبِّ! يَا رَبِّ! وَ مَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَ مَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟»

''پھر آپ نے تذکرہ کیا کہ ایک ایسا شخص ہے جس کا سر پراگندہ ہو، پیر خاک آلودہ ہوں، طویل سفر سے آرہا ہو (یعنی حج کا سفر)، پھر وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہے: اے رب! (میری سُن لے) اے رب (میری دعا قبول فرما) لیکن اس کا کھانا حرام کا ہے، پینا حرام کا ہے، لباس حرام کا ہے اور حرام ہی سے وہ پروان چڑھا ہے تو اُس کی دعا کہاں قبول ہوگی!''[2]

اب یہ تو اصولی بات ہوئی، دوسری بات یہ دیکھی جائے کہ وہ ملازمت کا کتنا

[1] المعجم الأوسط للطبراني: 310/6، وسلسلة الأحاديث الضعيفة: 292/4، حديث: 1812.
[2] صحيح مسلم، الزكاة، حديث: 1015.

ضرورت مند ہے؟ اگر اس کا کوئی کفیل نہیں یا وہ خود صاحب عیال ہے، گھر بیٹھے آمدن کی کوئی صورت نہیں تو پھر ملازمت کے انتخاب کے وقت ان باتوں کا خیال رکھے.

① خالص حرام کام والی ملازمت اختیار نہ کرے، جیسے شراب بیچنا، جوئے کے اڈے پر کام کرنا، وغیرہ وغیرہ۔

② ایسی ملازمت جس میں غالب حصہ حلال کا ہو، اُسے فی الوقت قبول کر لے، جیسے کسی ایسے سُپر سٹور کی نوکری جس میں ایک حصہ الکحل کے مشروبات کے لیے مخصوص ہے لیکن وہ مینجر سے کہہ سکتا ہے کہ میری ڈیوٹی اس حصہ میں نہ لگائی جائے تاکہ وہ شراب کی بوتلوں کے اٹھانے اور لے جانے سے محفوظ رہے، پھر بھی اُسے چاہیے کہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ حصہ (مثلاً: پانچ فیصدی) خیرات کرتا رہے تاکہ اُس کی ملازمت میں اگر کچھ حصہ حرام کا شامل ہوگیا ہے تو وہ اس کا مداوا کر سکے۔

③ وہ بالکل حلال کام کی تلاش میں رہے اور جونہی ایسی کوئی ملازمت مل جائے تو پھر موجودہ کام کو چھوڑ کر حلال خالص کو اختیار کرے۔ واللہ الموفق.

مخلوط سوئمنگ پول میں گارڈ کی نوکری کرنا

سوال میں تیراکی تالاب میں گارڈ کی حیثیت سے کام کرتا ہوں۔ میرا کام ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانا ہے۔ تیرنے والوں میں مرد بھی ہیں لیکن زیادہ تر عورتیں ہیں جو تیراکی کا مختصر لباس پہن کر تیرتی ہیں، کیا یہ کام میرے لیے جائز ہے؟

جواب ایسی عورتیں جو مردوں کی موجودگی میں تیرنے کے لیے آتی ہیں، بہت بڑے منکر کا ارتکاب کررہی ہیں۔ بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ مخصوص تالابوں

میں جائیں جہاں صرف خواتین گارڈز ہی ہوں۔ سائل کے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی مراد غیر مسلم عورتوں سے ہے جن کے پاس شرم وحیا کا اسلامی تصور سرے سے موجود نہیں ہے لیکن ایک مسلمان مرد کا ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں عورتیں اپنے اختیار وارادہ کے ساتھ مختصر اور بے حیا لباس میں آ کر تیرا کی کریں اور جہاں مرد گارڈ کو ہر وقت ان پر نظر رکھنا مطلوب ہو، شرعاً صحیح نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کام میں ایک منکر کے ساتھ تعاون ہوتا ہے بلکہ ہر وقت ایک دوسرے منکر کا بھی ارتکاب ہوتا ہے اور وہ ہے خواتین کو نیم برہنگی کی حالت میں دیکھتے رہنا۔

نکاح وطلاق
کے مسائل

اسلامی نکاح کی شرائط و آداب

سوال اسلامی نکاح کی شرائط اور آداب اختصار کے ساتھ بیان کریں؟

جواب جواباً عرض ہے کہ قرآن و سنت کے مطابق ایک اسلامی نکاح کے لیے مندرجہ ذیل شرائط اور آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

① نکاح کے وقت لڑکی کے ولی (جیسے باپ، چچا، دادا، بھائی وغیرہ) کی رضا مندی ضروری ہے۔ اگر نکاح ولی کی رضا مندی کے بغیر کیا گیا تو وہ نکاح اسلام میں تسلیم نہیں کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَانِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَيْ عَدْلٍ»

''نکاح ولی اور دو ثقہ گواہوں کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔'' [1]

② جیسے ولی کی اجازت ضروری ہے، ویسے ہی لڑکی کی رضا مندی بھی ضروری ہے اور اگر وہ راضی نہ ہو تو نکاح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلْبِكْرُ تُسْتَأْذَنُ وَإِذْنُهَا صُمَاتُهَا وَالثَّيِّبُ تُسْتَأْمَرُ»

''کنواری لڑکی سے اجازت طلب کی جائے اور اس کا خاموش رہنا ہی اجازت

[1] صحيح ابن حبان: 386/9، حديث: 4075، وسنن الدارقطني: 225/3.

ہے اور ثیبہ (مطلقہ یا بیوہ) سے بصراحت اجازت لی جائے۔"[1]

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاتون، جن کا نام خنساء بنت خذام ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا: میرا باپ میری شادی میرے چچا زاد بھائی سے کرنا چاہتا ہے لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ کیا مجھے ایسی شادی کو فسخ کرنے کا حق حاصل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! تم اس نکاح کو فسخ کر سکتی ہو۔" جس پر خنساء نے کہا: میں اس سوال کے جواب سے یہ واضح کرنا چاہتی تھی کہ ہمارے اولیاء ہماری مرضی کے بغیر ہم پر شادی مسلط نہیں کر سکتے، گو میں اپنے باپ کی بات اب مان لیتی ہوں اور اس شادی کی اجازت دیتی ہوں۔[2]

③ اگر لڑکی کو باپ کی ناراضی کا اندیشہ ہو تو وہ نکاح کرنے میں جلد بازی نہ کرے بلکہ اپنے باپ کو راضی کرنے کی کوشش کرے، چاہے اس میں کافی وقت لگے لیکن اگر باپ

[1] ان الفاظ کے ساتھ مجھے یہ حدیث نہیں مل سکی لیکن معمولی سی تقدیم و تاخیر کے ساتھ یہ الفاظ اکثر کتب احادیث میں موجود ہیں۔ دیکھیے: صحیح البخاري، النکاح، حدیث: 5136، وصحیح مسلم، النکاح، حدیث: 1419-1427. [2] ڈاکٹر صاحب نے دو الگ الگ احادیث کو یہاں جمع کر دیا ہے۔ پہلی حدیث ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک لڑکی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: اللہ کے رسول! میرے والد نے اپنے بھتیجے کی خساست دور کرنے کے لیے میری شادی اس کے ساتھ کر دی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ معاملہ اسی پر چھوڑ دیا (اختیار دے دیا کہ وہ نکاح برقرار رکھے یا فسخ کر دے)۔ اس لڑکی نے کہا: میرے باپ نے جو کیا ہے میں اسے برقرار رکھتی ہوں۔ لیکن میں یہ چاہتی تھی کہ خواتین کو معلوم ہو جائے کہ ان کے باپوں کے پاس اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ (سنن النسائي، النکاح، حدیث: 3271، ومسند أحمد: 136/6) دوسری حدیث ہے کہ خنساء بنت خذام نامی ایک ثیبہ (بیوہ یا طلاق یافتہ) خاتون کے باپ نے اس کی (دوسری) شادی کر دی۔ اس خاتون نے اس شادی کو ناپسند کیا اور خدمت رسالت مآب میں آ کر شکایت کی تو آپ نے اس نکاح کو فسخ کر دیا۔ (صحیح البخاري، النکاح، حدیث: 5138)

کسی بھی صورت میں ایسی شادی کی اجازت نہیں دیتا جس سے وہ لڑکی کرنا چاہتی ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ آیا جس شوہر کا انتخاب لڑکی نے کیا ہے وہ ایک نیک نمازی مسلمان ہے، باروزگار ہے، یعنی بیوی کا نان ونفقہ ادا کرسکتا ہے اور باپ بغیر کسی معقول وجہ کے اس رشتے کا انکار کر رہا ہے تو پھر وہ لڑکی باپ کے بجائے کسی دوسرے قریبی ولی (یعنی چچا یا بھائی) کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ بھی انکار کریں (بغیر کسی معقول وجہ کے) تو پھر ایک مسلمان ملک میں مقامی حاکم ایسی عورت کا ولی متصور ہوگا اور ایک غیر مسلم ملک میں کوئی صاحب حیثیت آدمی جیسے امام مسجد یا اسلامی جمعیت کا صدر وغیرہ اس عورت کا ولی بن کر اس کا نکاح دو گواہوں کی موجودگی میں کرسکتا ہے۔ اور اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

«فَإِنِ اشْتَجَرُوا، فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهُ»

''اگر اولیاء آپس میں اختلاف کریں تو پھر حاکم ایسی عورت کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہیں۔'' [1]

④ اس آخری اقدام سے قبل ضروری ہے کہ دونوں والد اور لڑکی اپنی اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ والد کو چاہیے کہ وہ لڑکی کے جذبات کا خیال کرے اور ایسی جگہ اس کی شادی نہ کرے جہاں وہ شادی نہیں کرنا چاہتی اور اگر لڑکی کی پسند میں کوئی شرعی عیب نہیں ہے تو پھر ولی ایسی شادی کی اجازت دے دے۔

ایسے ہی لڑکی کو بھی خیال کرنا چاہیے کہ جن والدین نے اسے پالا پوسا ہے اور جن

[1] سنن أبي داود، النكاح، حديث: 2083، وجامع الترمذي، النكاح، حديث: 1102 واللفظ له.

کی وجہ سے وہ اس دنیا میں آئی ہے، ان کے جذبات کا بھی خیال کرے اور اگر ان کی پسند کے رشتے میں کوئی قباحت نہیں ہے تو اس رشتے کو قبول کرے، بہر صورت چونکہ اسی نے اپنے شوہر کے ساتھ ساری زندگی گزارنی ہے، اس لیے وہ اپنی پسند پر اصرار بھی کرسکتی ہے جیسا کہ خنساء بنت خذام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا امور کو ہر شادی میں ملحوظ رکھا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ شادی کامیاب رہے گی اور فریقین میں سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم

ولی کے بغیر نکاح ہو جانے کے قائل علماء سے نکاح پڑھوانا

سوال ایک عامل بالسنہ شخص کے لیے آیا یہ جائز ہے کہ وہ صرف مطلب برآری کے لیے نکاح ایسے شخص سے پڑھوائے جو نکاح میں ولی کی شرط کا قائل نہ ہوتا کہ اس کا نکاح منعقد ہوجائے؟

جواب گو احناف ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو صحیح مانتے ہیں لیکن مندرجہ بالا حدیث [1] کی بنا پر ہم صحیح مسلک یہی سمجھتے ہیں کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا، یعنی ایک عورت کا نکاح اس کے ولی (باپ، دادا، چچا، بھائی، بیٹا وغیرہ) کی اجازت کے بغیر صحیح نہیں ہوگا۔

ایک شخص عامل بالحدیث ہونے کا دعویٰ کرے اور پھر جب حدیث پر عمل کرنے کا موقع آئے تو حیلے بہانے تراشے، ایسا کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے، ایسے آدمی کا نکاح منعقد نہیں ہوا۔

[1] «لا نكاح إلا بولي وشاهدي عدل» (صحیح ابن حبان: 9/386)

نکاح میں بے نماز یا مرتکب کبیرہ کو گواہ بنانا

سوال کیا نکاح کے لیے ایسے گواہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جو نماز نہیں پڑھتا اور اسی طرح خود گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو؟

جواب نکاح کے صحیح ہونے کی شروط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ گواہ عادل ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَانِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ وَشَاهِدَيْ عَدْلٍ»

''نکاح بغیر ولی (کی اجازت) اور دو عادل گواہوں (کی موجودگی) کے منعقد نہیں ہوتا۔'' [1]

عادل سے مراد ہے کہ وہ فسق (کسی گناہ) میں مبتلا نہ ہو، نماز نہ پڑھنے والا تو کفر کی حد کو چھو رہا ہے، اس لیے نکاح میں ایسے گواہوں کو مقرر نہ کیا جائے۔

متعہ کی شرعی حیثیت

سوال محترم جناب! میرے مطالعے کے دوران میں قبل از اسلام ایک رواج، جسے متعہ کہا جاتا ہے، نظر سے گزرا جو کہ ایک جز وقتی ازدواجی بندھن ہوتا ہے، ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان اس بندھن میں عورت اپنے کنبے کے ساتھ رہتی ہے جبکہ مرد اکثر عورت کے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔

مجھے نکاح متعہ کے اس پرانے رواج کے بارے میں جاننا ہے کہ شریعت کا اس

[1] صحيح ابن حبان:9/386، وسنن الدارقطني:3/225.

بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے۔ آیا کیا اس کا ابھی بھی رواج ہے یا اس کی ممانعت کر دی گئی ہے؟

جواب متعہ یا جز وقتی نکاح کو رسول اللہ ﷺ نے 7 ہجری میں منسوخ کر دیا تھا، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔[1] متعہ کی 8 ہجری میں غزوہ حنین کے موقع پر قلیل مدت کے لیے اجازت دی گئی اور پھر ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا گیا۔[2]

متعہ میں ایک شخص ایک معین مدت کے لیے کچھ ادا شدہ مہر کے عوض عورت سے شادی کرتا ہے، مدت کے اختتام پر شادی ختم ہو جاتی ہے۔

متعہ اور مسنون نکاح میں کچھ واضح فرق ہیں جو درج ذیل ہیں:

① مسنون نکاح میں دو گواہ ضروری ہیں جبکہ متعہ میں گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔

② ثابت شدہ نکاح میں شوہر کا بیوی کو نان ونفقہ اور گھر مہیا کرنا ضروری ہے جبکہ متعہ میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔

③ ثابت شدہ نکاح میں کسی شخص کو بیک وقت چار بیویوں سے زائد رکھنے کی اجازت نہیں ہے جبکہ متعہ میں بغیر کسی شرط کے لامحدود تعداد میں عورتیں رکھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

④ مسنون نکاح میں بیوی شوہر کے انتقال کے بعد جائیداد میں وارث ہوتی ہے جبکہ متعہ میں کوئی وراثت نہیں۔

⑤ ثابت شدہ نکاح میں ولی کی رضامندی بہت ضروری ہے جبکہ متعہ میں کسی ولی کی رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔

[1] صحيح البخاري، المغازي، حديث: 4216، وصحيح مسلم، النكاح، حديث: 1407.
[2] صحيح مسلم، النكاح، حديث: 1406،1405.

⑥ ثابت شدہ نکاح میں دونوں فریق نکاح کے بندھن میں تا حیات رہنے کی نیت سے داخل ہوتے ہیں جبکہ متعہ میں وقت متعین ہے جو کہ ایک گھنٹے سے زائد یا کم بھی ہو سکتا ہے۔

دونوں نکاحوں میں علیحدگی کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

① ثابت شدہ نکاح میں طلاق دو گواہوں کی موجودگی میں دی جاتی ہے جبکہ متعہ میں کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے، صرف لفظ طلاق یا علیحدگی کہہ دینا کافی ہے۔

② ثابت شدہ نکاح میں ایک عورت کو طلاق کے بعد عدت گزارنا ضروری ہے جو کہ تقریباً تین مہینے ہوتی ہیں جبکہ متعہ میں قریباً موجودہ عدت کا آدھا وقت ہوتا ہے۔

③ ثابت شدہ نکاح میں عورت کو مخصوص ایام میں طلاق دینے سے روکا گیا ہے جبکہ متعہ میں کسی بھی وقت طلاق دی جا سکتی ہے۔

④ ثابت شدہ نکاح میں عدت کے دوران عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ہے جبکہ متعہ میں کسی نان و نفقہ کی ضرورت نہیں۔

اگرچہ شیعہ مذہب میں متعہ کی اجازت ہے مگر کوئی خاندان اپنی بیٹی اور بہنوں کے لیے متعہ کی اجازت نہیں دے گا۔ اگر کوئی کسی کی بہن یا بیٹی کے لیے متعہ کے قصد سے ہاتھ مانگے تو خون خرابہ تک کی نوبت آ سکتی ہے، چنانچہ یہ ایسا امر ہے جس پر لوگ خفیہ طریقے سے عمل کرتے ہیں۔

متعہ کے متعلق چند استفسارات و اشکالات

سوال متعہ سے متعلق میرا دوسرا سوال ہے، کیا جو مہر دیا جاتا ہے وہ عورت کو براہ راست دیا جاتا ہے یا خاندان کو؟ کیا یہ جہیز کی مانند ہے؟ ایک مضمون نگار رابرٹسن نے

ایک اور اصطلاح صداق کا ذکر کیا ہے جو کہ اس تحفہ کو کہا جاتا ہے جو اس طرح کے تعلقات میں دیا جاتا ہے۔ عورت کو صدیقہ اور اس کے مرد کو صدیق کہا جاتا ہے اور اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ صدیقہ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہے صدیق کو فارغ کرسکتی ہے اور ایک سے زائد صدیق بھی بیک وقت رکھ سکتی ہے۔ کیا متعہ سے متعلق تمام ضابطے ابھی تک لاگو ہیں؟ متعہ کو اسلام کے عروج کے زمانے سے جوڑا جاتا ہے۔ کیا شیعہ کے نزدیک قابل عزت نہیں ہے؟ اگر یہ خفیہ طریقے سے عمل پذیر ہوتا ہے تو اس کے اثرات کیا ہیں اور کیا یہ جائز تعلق شمار کیا جائے گا؟ کیا ایسے تعلقات سے جو اولاد ہوگی اس کی نسبت عورت اور اس کے خاندان کی طرف ہوگی؟ اور کیا صحیح نکاح میں عورت طلاق کے لیے کسی امام سے رجوع کرسکتی ہے؟

جواب آپ کے پوچھے گئے سوالات کے جوابات نیچے دیے جا رہے ہیں:

① مہر کا تعلق عورت سے ہے، اس کا خاندان سے کوئی سروکار نہیں۔ سورۃ النساء میں کہا گیا ہے: ''اپنی عورتوں کو ان کے مہر (صدقات) خوش دلی سے دے دو۔''[1] زمانہ جاہلیت میں آدمی مہر صرف عورت کے ولی کو دیتا تھا جبکہ اسلام میں یہ قطعی طور پر عورت کا حق ہے۔ اس لیے مہر صرف عورت ہی کو دینا چاہیے۔

② یہ مہر یا ڈاور Dower کہلاتا ہے، جیسا کہ محمد بن الحسن الطوسی نے اپنی کتاب التہذیب (188/2) میں ذکر کیا ہے۔ یہ شیعہ مذہب کی معتبر کتاب ہے۔

③ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ لفظ صداق کا مجھے کہیں اسلامی ذرائع میں وہ مفہوم نہیں ملا جو آپ نے رابرٹسن سمتھ کے حوالے سے دیا ہے۔ انھوں نے شاید یہ لفظ

[1] النساء 4:4۔

"صدیق" سے لیا ہے جس کے معنی دوست کے ہیں۔ اسلامی ذرائع کے مطابق صدیق بمعنی سچائی کے استعمال ہوتا ہے۔ عورت کو مہر دینے کے بعد ایک شخص اپنے اس وعدے سے وفا کرتا ہے جو اس نے عورت سے شادی سے پہلے کیا تھا۔

تمتع کی توجیہ کو صرف اس حد تک لیا جا سکتا ہے کہ دور جاہلیت میں قحط کے موقع پر ایک عورت کسی مرد کو دوست (صدیق) کے طور پر اپنا لیتی تھی تاکہ وہ دوست اس عورت اور اس کے خاوند پر خرچ کر سکے۔ بہر حال اس لفظ (صداق) کا جاہلیت کے مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ [1]

④ شیعہ کتب کے حوالے سے متعہ بذات خود ایک بہت اجر و ثواب والا عمل ہے مگر عملی طور پر جیسا کہ ڈاکٹر موسیٰ الموسوی نے کہا ہے: "حالانکہ متعہ شیعوں کے نزدیک جانی پہچانی چیز ہے مگر ایران کے کچھ علاقوں میں اگر کوئی متعہ سے متعلق پوچھے تو خون خرابہ تک نوبت آ سکتی ہے۔" انھوں نے ماضی کے عظیم شیعہ مجتہد سید محسن الامین العاملی کا حوالہ دیا ہے کہ جس میں انھوں نے کہا: "متعہ ایک ایسا عمل ہے جس کی ہمارے یہاں اجازت ہے مگر اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ ہر کوئی اس کو لازماً اختیار کرے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ کتنے اعمال ایسے ہیں جن کی اجازت دی گئی ہے مگر انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ ملامت سے بچا جا سکے۔" [2]

⑤ شیعوں کے مطابق یہ جائز ہے، چاہے کھلم کھلا کیا جائے یا خفیہ طریقے سے۔

⑥ چونکہ متعہ شیعوں کے یہاں جائز ہے، اس لیے بچے کی نسبت والد کی طرف ہوگی۔

اب ان بچوں کے ساتھ عورت کے خاندان والے کس طرح سلوک کرتے ہیں؟ بہتر

[1] تفسیر ابن عاشور: 22/4۔ [2] شیعة ولا تشیع، ص: 155۔

ہوگا کوئی شیعہ اس پر روشنی ڈالے۔

⑦ جی ہاں ایک خاتون کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ امام یا کسی اسلامی عدالت سے طلاق مانگے مگر متعہ میں شادی مقررہ مدت کے بعد خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

ولیمے کا وقت اور اس کی شرعی حیثیت

سوال ولیمے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا یہ نکاح کے فوراً بعد کرنا جائز ہے؟ (حاجی محمد فاضل، اولڈ بری)

جواب ولیمے کا لغوی مطلب ہے اجتماع، اس سے مراد میاں بیوی کا جمع ہونا ہے، اس لحاظ سے ولیمہ شادی کے بعد کی دعوت کے لیے خاص طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن عمومی طور پر کسی دوسری ضیافت کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔ ولیمے کے سلسلے میں یہ حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ان کے اوپر زرد خوشبو کی علامت تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ایک انصاری خاتون سے شادی کر چکے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کتنا مہر دیا؟'' کہنے لگے: ایک گٹھلی کے وزن کے برابر سونا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح کرنے والے شخص کو ولیمے کا اہتمام کرنا چاہیے جو کہ اس کی مالی حالت کے مطابق ہو، کم سے کم ایک بکری کی حد تک کھانا تو کرنا ہی

[1] صحيح البخاري، مناقب الأنصار، حديث:3781، وصحيح مسلم، النكاح، حديث:1427-

چاہیے۔ اکثر علماء نے ولیمے کو سنت اور مستحب قرار دیا ہے، وہ اس لیے کہ اگر اس حدیث کے ظاہری الفاظ کو لیا جائے تو ایک بکری کی حد تک ولیمہ کرنا لازمی قرار پائے گا لیکن خود رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعض شادیوں میں صرف کھجور اور ستو کی حد تک بھی دعوت کی ہے، [1] اس لیے علماء کے اس قول کو ترجیح حاصل ہے کہ ولیمہ سنت ہے۔

ولیمے کے اہتمام میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ نکاح کا اعلان عام ہو جائے۔ خواتین کو نکاح کے موقع پر جو دف بجانے کی اجازت دی گئی ہے اس میں بھی یہی حکمت ملحوظ ہے۔ جہاں تک ولیمہ کے وقت کا تعلق ہے تو علماء کی مختلف آراء ملتی ہیں، یعنی نکاح کے وقت ولیمہ کرنا یا خاتون کی رخصتی سے قبل یا خاتون کی رخصتی کے بعد جبکہ میاں بیوی کا تعلق قائم ہو چکا ہو، یعنی تینوں طرح جائز ہے لیکن نبی ﷺ کے اپنے نکاح اور صحابہ کے واقعات سے تیسری حالت کی تائید ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے متذکرہ واقعہ میں تو اس بات کی صراحت ہے کہ خاتون کی رخصتی ہو چکی تھی۔

حضرت زینب بنت جحش کا ولیمہ بھی نکاح سے اگلے دن ہوا تھا، جو کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے:

«أَصْبَحَ النَّبِيُّ ﷺ بِهَا عَرُوسًا، فَدَعَا الْقَوْمَ فَأَصَابُوا مِنَ الطَّعَامِ»

''نبی ﷺ نے ان کے ساتھ بحیثیت دلہن صبح کی، پھر لوگوں کی دعوت کی اور انھوں نے کھانا کھایا۔'' [2]

اس سے معلوم ہوا کہ بہتر یہی ہے کہ خاتون کو گھر لانے کے بعد دعوت ولیمہ

[1] صحيح مسلم، النكاح، حديث: 1365. [2] صحيح البخاري، النكاح، حديث: 5166، وصحيح مسلم، النكاح، حديث: 1428.

کی جائے۔

غیر مسلمہ غیر محرم پر نگاہ پڑنا

سوال راہ چلتے جبکہ بیوی بھی ساتھ ہو، غیر مسلم بے حیا لباس میں ملبوس خواتین کی طرف نگاہ پڑ جاتی ہے، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب اول تو چاہے بیوی ساتھ ہو یا نہ ہو، اجنبی خواتین کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا جائز نہیں ہے، اس لیے جہاں قرآن مجید میں خواتین کو کہا گیا ہے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں وہاں مردوں سے بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۚ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝﴾

''مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، بے شک جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُس سے باخبر ہے۔''[1]

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک نظر پڑ جائے تو پھر دوسری نظر سے نہ دیکھو، پہلی تو تمھارے لیے (معاف) ہے لیکن دوسری نظر تمھارے لیے ناجائز ہے۔''[2]

ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا: ''آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے۔''[3] یعنی ایسی چیزوں کو جن کا دیکھنا ناجائز ہو۔

[1] النور 30:24. [2] سنن أبي داود، النكاح، حديث: 2149، وجامع الترمذي، الأدب، حديث: 2777. [3] صحيح البخاري، الاستئذان، حديث: 6243، وصحيح مسلم، القدر، حديث: 2657.

اور آپ نے اس بات کی بھی نصیحت فرمائی: اگر پرائی خاتون پر نظر پڑ جانے سے شہوت پیدا ہو تو گھر آ کر اپنی بیوی سے شہوت پوری کر لو۔ [1] اجنبی خاتون چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلمان، چونکہ اُن کے دیکھنے اور نظارہ بازی کرنے کے اثرات ایک جیسے ہیں، اس لیے آیت کے آخر میں ارشاد فرمادیا: ﴿ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ﴾ ایسا کرنا اُن کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، یعنی خیالات کی پاکیزگی اُسی وقت حاصل ہوگی جب اجنبی عورتوں کی موجودگی میں نگاہیں نیچی رکھی جائیں۔

مغربی معاشرے میں اور خاص طور پر اگر موسم گرم ہو تو یہاں عریانی عروج پر ہوتی ہے، خاص طور پر ٹرینوں میں سفر کرتے وقت جبکہ لوگ سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہیں اور ان میں مرد و زن کی تفریق نہیں ہوتی، ایسے وقت میں غضِ بصر سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں بہتر ہے کہ کسی کتاب یا اخبار کو آڑ بنا لیا جائے۔ نظر بازی سے بھی بچ جائیں گے اور مطالعہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو بلوائے عام ہونے کی بنا پر ان شاء اللہ آپ معذور ہوں گے کیونکہ آپ پر استطاعت کے مطابق ہی غضِ بصر کرنا ہے اور اگر وہ ممکن نہ ہو تو اللہ تعالیٰ ہمیں کسی ایسے حکم کی پابندی کا مکلف نہیں ٹھہراتا جو ہماری استطاعت سے باہر ہو جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

”اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں ڈالتا۔“ [2]

اور اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو اُسے اپنی استطاعت کے مطابق بجا لاؤ اور جب کسی چیز سے روکوں تو اُس سے

[1] صحیح مسلم، النکاح، حدیث: 1403. [2] البقرۃ 2:286.

رُک جاؤ۔“ [1]

شہوت کم کرنے کی دوا کھانا

سوال ایک شخص جس پر شہوت غالب ہے اور روزہ رکھنے سے بھی اسے فائدہ نہیں ہو رہا تو کیا وہ شہوت کم کرنے کی دوائیں کھا سکتا ہے؟

جواب ہم سائل کو پہلے تو یہ نصیحت کریں گے کہ اگر وہ شادی کرنے کی استطاعت رکھتا ہے تو شادی کرے۔ دوائیں بھی استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اسے نقصان نہ پہنچائیں اور ماہرین کی رائے میں شہوت کو بالکل ختم کرنے والی نہ ہوں اور یہ اس لیے کہ اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرنا واجب ہے اور اس غرض کے لیے تمام ممکنہ وسائل استعمال میں لائے جاسکتے ہیں۔

شادی شدہ زانیہ کو زوجیت میں رکھنے کا حکم

سوال ایک شخص کی مسلمان بیوی نے شوہر کے سامنے اقرار کیا کہ اس نے زنا کیا ہے، اب یہ آدمی سخت پریشانی کا شکار ہے کہ اس عورت کو اپنے نکاح میں رکھے یا فارغ کردے۔ اسے اس سے محبت بھی ہے اور وہ اس کے بچوں کی ماں بھی ہے؟

جواب اصل بات تو یہی ہے کہ ایک فاجرہ زانیہ عورت کو اپنے نکاح میں نہ رکھا جائے اور جو شخص اپنی بیوی کو حرام کاری کرتے دیکھے اور پھر بھی اس کے ساتھ رہے تو وہ دیّوث ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] صحیح البخاري، الاعتصام بالكتاب والسنة، حديث: 7288 وصحیح مسلم، الحج، حديث: 1337

﴿ اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۡ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

''زانی نکاح نہیں کرتا ہے مگر ایک زانی عورت سے یا ایک مشرک عورت سے اور ایک زانیہ عورت سے سوائے ایک زانی مرد کے یا ایک مشرک مرد کے کوئی نکاح نہیں کرتا ہے، ایسا کام مومنوں پر حرام ہے۔'' [1]

لیکن اگر عورت توبہ کر لے تو پھر گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے، جیسے وہ شخص کہ جس نے گناہ نہیں کیا۔ [2] اگر یہ خاتون توبہ کر لے اور پورے اخلاص کے ساتھ اپنی توبہ پر قائم رہے تو بہتر ہے کہ مرد اس کی پردہ پوشی کرے اور اسے معاف کر دے لیکن اگر اس عورت نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو پھر طلاق دے کر فارغ کر دے۔

اس ضمن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: میری بیوی کسی چھونے والے کا ہاتھ رد نہیں کرتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''اسے اپنے سے جدا کر دو۔'' اس نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ میرا نفس اس کا پیچھا کرتا رہے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ''تو پھر اس سے لطف اندوز ہوتے رہو۔'' دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے طلاق دے دو۔'' اس نے کہا: میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو پھر اسے (اپنی زوجیت میں) باقی رکھو۔'' [3]

لیکن اس حدیث کے بارے میں بقول ابن جوزی، امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات ثابت ہے نہ اس حدیث کی کوئی اصل

[1] النور 3:24. [2] سنن ابن ماجه، الزهد، حديث:4250. [3] سنن أبي داود، النكاح، حديث: 2049، وسنن النسائي، النكاح، حديث:3231.

ہے، اسی لیے ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔[1]

امام احمد کا یہ قول بھی انھوں نے نقل کیا ہے: اللہ کے رسول ﷺ ایسی عورت کو زوجیت میں رکھنے پر کیسے کہہ سکتے تھے جو فاجرہ ہو۔[2]

معلق طلاق کا حکم

سوال اگر طلاق کسی شرط کے واقع ہونے کے ساتھ معلق ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟

دوسرا یہ کہ اگر اللہ کی قسم کھا کر اپنی بیوی سے کہا: اگر تم نے یہ کام کیا تو طلاق واقع ہوجائے گی، پھر اگر بیوی نے وہ کام کرلیا تو کیا طلاق واقع ہوجائے گی؟

جواب اگر شرط کے مطابق کام کرلیا تو ایک رجعی طلاق واقع ہوگی اور اس طرح اللہ کی قسم کھا کر بیوی سے کہا: اگر تم نے فلاں کام کیا تو تمھیں طلاق۔ ایسی طلاق بھی جمہور کے نزدیک طلاق معلق ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے اگر وہ کام کرلیا گیا تو بیوی کو طلاق ہوجائے گی۔ لیکن امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بعض علمائے سلف کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ایسی طلاق اسی صورت میں واقع ہوگی جبکہ شوہر نے واقعی طلاق کی نیت کی ہوگی۔ انھوں نے اس رائے کو راجح قرار دیا ہے اور اس کے دلائل بھی دیے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسی قسم کھانے سے شوہر کا مطلب یہ تھا کہ بیوی یہ کام نہ کرے، طلاق دینا قطعاً مقصود نہ تھا۔ ایسی صورت میں طلاق واقع نہ ہوگی بلکہ قسم کا کفارہ ثابت ہوگا (اگر بیوی نے وہ کام کرلیا تو۔) اکثر علماء نے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس رائے کو قبول

[1] الموضوعات لابن جوزي: 2/272. امام احمد رحمہ اللہ کا مذکورہ قول بھی اسی مقام پر موجود ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں۔ ہاں! ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن جوزی رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ الفاظ اسی طرح نقل کیے ہیں۔ (تلخیص الحبیر 3/484)

[2] امام احمد رحمہ اللہ کے یہ الفاظ مجھے نہیں مل سکے۔ (ناصر)

کیا ہے اور کئی بلاد اسلامیہ کے قانون میں بھی اس رائے پر عمل ہوتا ہے یہ رائے مشہور حدیث «إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [1] کے مطابق بھی ہے۔

بیوی کے مجبور کرنے پر بار بار طلاق دینا اور تیسری مرتبہ بھی مجبوراً بولے بغیر تحریری طلاق دی تو اس کا حکم

سوال ایک عورت اور اس کے خاوند میں خوب جھگڑا ہوا۔ عورت نے بار بار طلاق دینے کا مطالبہ کیا لیکن مرد نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے اس بات کی دھمکی دی کہ طلاق نہ دی تو وہ گھر سے باہر چلی جائے گی، چنانچہ اس نے ایک طلاق دے دی اور عدت کے ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیا، دوسری مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا اور اس نے طلاق دینے کے بعد عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیا۔ اب تیسری دفعہ اس نے پھر طلاق کا مطالبہ کیا ہے اور اس پر اصرار بھی کر رہی ہے۔ مرد انکار کر رہا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دی تو وہ رجوع کرنے کا حق دار نہیں رہے گا۔ اس کی بیوی نے دھمکی دی کہ اگر طلاق نہ دی تو وہ اپنے آپ کو قتل کر ڈالے گی اور پھر یہاں تک کیا کہ چھری لا کر پیٹ پر رکھ دی۔ مرد نے مجبور ہو کر ایک کاغذ پر طلاق لکھ دی لیکن زبان سے لفظ طلاق ادا نہیں کیا۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ طلاق جبر کی بنا پر واقع نہ ہوگی یا جبر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا اور طلاق واقع ہو جائے گی؟

جواب جہاں تک پہلی اور دوسری طلاق کا سوال ہے تو وہ دونوں بلا اشکال واقع ہو گئیں لیکن **تیسری طلاق** کے بارے میں دو امور بحث طلب ہیں:

[1] صحيح البخاري، بدء الوحي، حديث:1۔

اول: تحریری طلاق: فقہاء کا اتفاق ہے کہ طلاق واقع ہو جاتی ہے، چاہے مرد نے زبان سے طلاق کے الفاظ کہے ہوں یا نہ، چاہے طلاق کی نیت کی ہو یا نہ۔ صحت طلاق کے لیے انھوں نے صرف یہ شرط رکھی ہے کہ تحریر بالکل واضح ہو، پڑھی جا سکتی ہو اور بیوی کو پہنچا دی گئی ہو۔

دوم: جبری طلاق: جمہور فقہاء کے نزدیک جبری طلاق واقع نہیں ہوتی جبکہ جبر انتہائی شدید ہو، جیسے قتل کرنے یا شدت کے ساتھ مارنے پیٹنے یا جسم کے کسی عضو کو کاٹنے کی دھمکی دی گئی ہو اور اس کی دلیل یہ مشہور حدیث ہے: ''اللہ تعالیٰ نے اس امت پر تین چیزوں کو معاف کر دیا ہے: غلطی سے کوئی کام کرنا، بھول جانا یا ایسا کام جس کے کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔'' [1]

سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اپنی دھمکی میں سنجیدہ تھی، اس لیے اس نے چھری کو اپنے پیٹ پر بھی رکھ لیا، ایسی صورت میں مرد کا طلاق تحریر کرنا جبر کے نتیجے میں تھا، اس لیے طلاق واقع نہیں ہوگی کیونکہ اس کا اپنے آپ کو قتل کرنے کی دھمکی دینا ایسا ہی ہے جیسے اس نے خاوند کو قتل کرنے کی دھمکی دی ہو کیونکہ دونوں حالتوں میں ایک معصوم جان کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر عورت نے اپنے آپ کو مار لیا تو خاوند بہت ساری مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔

نوٹ: کونسل کے اجلاس میں مذکورہ بالا رائے سے میں نے اختلاف کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ سائل کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں بیوی میں ناچاقی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بیوی کسی صورت خاوند کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ اب اگر اس طلاق کو

[1] سنن ابن ماجه، الطلاق، حديث: 2045، والمستدرك للحاكم: 2/216.

جبری طلاق کہہ کر نہ بھی مانا جائے تو کیا عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ طلاق نہ ملنے پر کوئی غلط اقدام اٹھا لے، اس لیے بہتر ہے کہ اس طلاق کو مانا جائے تا کہ عورت کی گلوخلاصی ہو سکے۔ ایسی عورت کو خلع کا حق بھی حاصل ہے۔ وہ اگر خلع طلب کرے گی تب بھی یا تو شوہر کو خلع دینا پڑے گا یا قاضی اپنی صوابدید پر اس نکاح کو فسخ کر دے گا۔

حالت نشہ میں طلاق دی اور ہوش آنے پر اسے تسلیم کیا تو کیا طلاق ہو جائے گی؟

سوال ایک شخص جو کہ شراب کا خوب رسیا ہے، حالتِ غضب میں اپنی بیوی سے کہتا ہے، تمھیں تین طلاق ہو اور بار بار یہی الفاظ دہراتا ہے۔ دوسرے دن اس کے ایک بیٹے نے اس سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے کیا کہا تھا؟ کیا واقعی تمھارا ارادہ طلاق کا تھا؟ تو وہ جواب دیتا ہے: ہاں! اسے تین طلاقیں ہوں۔ دو دن کے بعد پھر یہی سوال کیا گیا اور اس نے یہی جواب دیا۔ اب کیا اس کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی اور کس قسم کی طلاق واقع ہوئی؟

جواب آدمی کا کثرت سے شراب پینا اس مسئلہ میں کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس نے نشہ کی حالت میں طلاق نہیں دی۔ اب رہا کہ اس نے غیض وغضب کی حالت میں طلاق دی تو جمہور فقہاء کے نزدیک غصہ میں دی گئی طلاق واقع ہو جاتی ہے، الا یہ کہ بقول احناف آدمی مدہوشی کے عالم میں ہو۔ مدہوش سے مراد ایسی حالت ہے کہ جس میں انسان کے اقوال اور افعال میں خلل واقع ہو جائے یا وہ بقول دیگر فقہاء درجہ

اغلاق تک پہنچ جائے۔ درجہ اغلاق سے مراد انتہائی غصہ اور غضب کی حالت ہے کہ جس میں انسان کو کچھ پتہ نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اس کی بات کا کیا مطلب ہے؟ لیکن سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص نے دوسرے اور تیسرے دن پوچھے جانے پر طلاق دینے کے بارے میں مزید تاکیدی الفاظ کہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کی نیت طلاق دینے کی تھی۔ اس صورت میں سب کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی۔

چاروں فقہی مذاہب کے نزدیک یہ طلاق بائنہ مغلظہ شمار ہو گی کیونکہ ان کے نزدیک ایک ہی دفعہ دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ گویا یہ طلاق ایسی ہے کہ اس کے بعد شوہر نہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ دوبارہ اس عورت سے شادی ہی کر سکتا ہے۔ مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک صرف ایک طلاق واقع ہو گی اور اسی رائے کو کئی اسلامی ملکوں نے بھی اپنایا ہے۔ ان کے نزدیک طلاق بائن مغلظ اسی وقت ہو گی جبکہ اس طلاق سے پہلے بھی دو طلاقیں واقع ہو چکی ہوں۔ ہماری رائے میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس رائے کو لیا جا سکتا ہے، خاص طور پر جبکہ سائل نے اس بات کی بھی وضاحت نہیں کی کہ اس کی شادی شرعی طور پر ہوئی تھی یا صرف ملکی قانون (سول لاء) کے مطابق ہوئی تھی، اس لیے ہم نے فقہاء کے اقوال کی روشنی میں مختصر جواب دے دیا ہے۔ ہم سائل کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی مقامی عالم سے بھی رجوع کریں تاکہ اس مسئلہ سے متعلق تمام حالات علم میں آ جائیں۔

اخلاق و آداب
کے مسائل

دینی مجلس میں جانے کے لیے لڑکی کا جھوٹا حیلہ کر کے ماں سے اجازت لینا

سوال بیٹی دین سیکھنے کی خاطر ایک ایسی مجلس میں جانا چاہتی ہے جہاں مرد و زن کا اختلاط نہیں ہے لیکن ماں اس کی اجازت نہیں دے رہی، کیا وہ کوئی حیلہ اختیار کر سکتی ہے؟

جواب اس سوال کا جواب پیچھے گزر چکا ہے لیکن اس سوال کے متعلق چند وضاحتیں کرنا ضروری ہیں۔ «طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ» [1] لیکن ماں باپ کے اذن کے بغیر گھر بیٹھے علم کا حصول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ آج کل ایسی بہت سی سہولیات موجود ہیں جس سے ایسا کرنا ممکن ہے، جیسے:

① علمی دروس پر مشتمل آڈیو اور ویڈیو ٹیپ کی بہتات ہے۔

② ایسی بے شمار ویب سائٹس موجود ہیں جن پر مطلوبہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔

③ دینی علم عام کرنے کے لیے ''اوپن کالج'' موجود ہیں جن کے ذریعے سے گھر بیٹھے براہ راست کورس کیا جا سکتا ہے اور بذریعہ فون اپنے استاد سے بات کی جا سکتی ہے۔

لیکن اگر یہ سہولیات میسر نہ ہوں، یا ان کے استعمال پر بھی پابندی ہو تو علم کے حصول کے لیے گھر سے باہر جانے کے لیے مناسب حیلہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

[1] المعجم الكبير للطبراني: 10/195، حدیث: 10439۔

لڑکی لڑکے کے ناجائز تعلقات کے متعلق ان کے والدین کو بتانا

سوال میرے علم میں ہے کہ میرے ایک دوست/واقف کار کی لڑکی کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ کیا میں اُس کے والدین کو بتادوں یا لڑکی کے اس جرم کو چھپاؤں کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ایک مسلمان کے عیب کو چھپایا تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کے عیب چھپائے گا۔''[1]

جواب ایک عیب کا تعلق تو انسان کی ذاتی زندگی سے ہے، جیسے ایک شخص شراب پیتا ہے، آپ نے اُسے نصیحت کردی، اس نے نہیں مانی اور آپ اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ الا یہ کہ اسلامی حکومت ہو، آپ کے ساتھ ایک گواہ اور بھی ہو تو اُسے قاضی یا حاکم کے پاس حد کے نفاذ کے لیے رپورٹ کیا جاسکتا ہے۔

اور دوسرا ایک عیب ایسا ہے جس کا تعلق معاشرے سے ہے۔ آپ نے جو سوال کیا ہے اُس میں ایک شخص نہیں دو شخص ملوث ہیں۔ ایک خاندان نہیں بلکہ دو خاندانوں کی عزت کا سوال ہے۔ ایک منکر کھلم کھلا کیا جارہا ہے اور منکر کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

طاقت ہے تو طاقت سے، ورنہ زبان سے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے اُسے برا جاننا چاہیے،[2] اس لیے اگر آپ دونوں کو سمجھا سکتے ہوں یا ان دونوں میں سے ایک کو بھی سمجھا کر اُسے اس بدی سے باز رکھ سکتے ہوں تو ایسا کرنے کی کوشش کریں اور اگر باز نہ آئیں تو پھر ان کے والدین کو آگاہ کریں۔ والدین اپنے اپنے بچے کے ولی

[1] صحیح مسلم، الذکر والدعاء، حدیث:2699. [2] صحیح مسلم، الإیمان، حدیث:49.

ہیں، ان کی اصلاح کے ذمہ دار ہیں، اس لیے اب وہ جانیں اور ان کے بچے، آپ اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو گئے۔

غیر مسلم پڑوسیوں سے ملنا اور تبادلہ تحائف کرنا

سوال غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ ملنا جلنا، انھیں تحائف دینا کیسا ہے؟

جواب غیر مسلم افراد کے ساتھ معاملات، میل جول اور دوستی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سے ہمیں منع کیا گیا اور ایک کی اجازت دی گئی ہے۔ جس سے منع کیا گیا وہ ہے ''موالاۃ'' یعنی دانت کاٹی کی دوستی کہ جس کی بنا پر آپ اپنے بھید اور راز میں بھی انھیں شریک کریں، حالانکہ اُن کی عداوت بھی ظاہر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انھیں اپنا دوست بناتا ہے تو وہ انھی میں سے ہے، بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

ایسا ہی حکم رسول اللہ ﷺ کے مد مقابل مشرکین عرب کا تھا جن کی عداوت ظاہر تھی۔ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾

[1] المآئدة 5:51.

"اے ایمان والو! میرے دشمن کو اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ، تم اُن سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو، حالانکہ اللہ نے جو حق تم پر بھیجا ہے وہ اُس کا انکار کرتے ہیں۔"[1]

میرے دشمن سے مراد وہ دشمن جو عقیدہ توحید کی بنا پر دشمنی رکھتا ہو اور تمھارے دشمن سے ہر وہ شخص یا قوم مراد ہے جو قومیت، وطن، زبان، قبیلہ یا کسی دوسرے سبب کی بنا پر دشمنی رکھتی ہو، اسی لیے ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو ایسے مناصب پر فائز نہیں کیا جانا چاہیے جن کی بدولت وہ خود مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچائیں۔

پاکستان بنتے ہی کشمیر کی بنا پر جو پہلی جنگ ہندوستان نے اپنی فوج سرینگر میں اتار کر پاکستان پر مسلط کی تھی، اس وقت پاکستانی فوج کا سربراہ ایک غیر مسلم تھا جس نے قائداعظم کے احکامات کی تعمیل میں لیت ولعل سے کام لیا اور جس کے نتیجے میں کشمیر ہندوستان کے قبضے میں چلا گیا۔ بالکل ایسا ہی واقعہ عرب، اسرائیل کی پہلی جنگ (1948ء) میں ہوا کہ شرق اردن کی فوجوں کا سربراہ بھی ایک غیر مسلم تھا اور اس نے اسرائیل کے مقابلے میں عرب فوج کو اس طرح لڑایا کہ عرب فوج کسی بھی طرح فتح حاصل نہ کر پائی۔

یہ تو قومی سطح کی بات تھی، ذاتی سطح پر بھی اگر آپ ایک غیر مسلم کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ بن جائیں تو آپ کے بہت سے راز آپ کے دوست تک پہنچ جائیں گے اور وہ کسی وقت آپ کے لیے باعث تکلیف بھی بن سکتا ہے۔

جس بات کی اجازت دی گئی اُس کا قاعدہ کلیہ سورۃ الممتحنۃ کی ان دو آیات میں

[1] الممتحنۃ 60:1

واضح کر دیا گیا ہے:

﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''اللہ تمھیں نہیں روکتا ان لوگوں سے جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی اور نہ تمھیں اپنے گھروں سے نکالا کہ تم اُن سے اچھا سلوک کرو اور انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

﴿اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

''اللہ صرف تمھیں ان لوگوں سے روکتا ہے جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی کی، تمھیں اپنے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالے جانے پر مدد مہیا کی، کہ تم ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرتا ہے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''[2]

ان دونوں آیات سے واضح ہوگیا کہ اُن لوگوں کے ساتھ اچھائی اور انصاف کا سلوک کیا جاسکتا ہے جنھوں نے نہ تو مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کی اور نہ انھیں گھروں ہی سے نکالا۔

یورپ کے ممالک نے عمومی طور پر کتنے ہی مسلمانوں کو پناہ دی ہے، بے گھروں کو گھر دیے ہیں بلکہ یہاں کی حکومتیں بے روزگاروں کو ہفتہ وار الاؤنس بھی دے رہی ہیں، اس لیے ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، تحفے تحائف دینا اور دین کی دعوت دینے کے لیے اُن کے گھر جانا یا اپنے گھر بلانا، بیماری کے عالم میں عیادت کے لیے

[1] الممتحنة 60:8. [2] الممتحنة 60:9.

جانا، راہ چلتے اُن کا حال احوال پوچھنا سب جائز ہے۔

یورپ ہی میں ایک ایسی قوم بھی تھی، یعنی صرب جنھوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کا قتل عام کیا، انھیں اپنے گھروں سے نکالا۔ ایسے ہی سرزمین فلسطین میں صیہونی یہودیوں نے فلسطینیوں کو اُن کے گھروں سے نکالا اور ان کا قتل عام کیا۔ گویا ہمارے سامنے وہ میزان موجود ہے کہ جس سے ہم خود ہی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاسکتا ہے اور کن کے ساتھ نہیں۔ دوستی کا معیار بھی معلوم ہوگیا کہ اتنی گہری دوستی کہ جس سے مسلمانوں کے راز دشمنانِ اسلام تک پہنچ جائیں وہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں۔

یہاں ایک سوال سر اٹھاتا ہے کہ ایک مسلمان کو اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) عورتوں کے ساتھ نکاح کی اجازت دی گئی ہے۔ انسان کی بیوی اس کی راز دان ہوتی ہے تو کیا یہ وہی دوستی نہیں جس سے منع فرمایا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ ایک مسلمان مرد اور کتابی عورت میں شادی اُسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں، دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوں۔ عورت عموماً مرد کے اثر میں ہوتی ہے، اس لیے اُس سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ مرد کے راز افشا کرے گی یا اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ اس بات کا قوی امکان رہتا ہے کہ ایسی عورت ایک مسلمان کے عقد میں آجانے کے بعد اسلام قبول کرلے، ان مصلحتوں کی بنا پر یہود و نصاریٰ سے عمومی عدم موالات کے ضمن میں نکاح ایک استثنا کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر مسلمان کو کتابی عورت سے شادی کرنے کے کچھ عرصہ بعد یہ احساس ہوجائے کہ اُس کی بیوی اسلام سے دشمنی رکھتی ہے، بچوں

کو اپنے دین کی تعلیم دینے لگی ہے، یا شوہر کے راز غیروں کو پہنچا رہی ہے، خاص طور پر جبکہ شوہر کسی اہم منصب پر فائز ہو تو ایسے مسلمان شوہر کے لیے ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ یہ رشتہ ازدواج باقی رکھے۔ اسے ایسی عورت کو طلاق دے کر جلد از جلد فارغ کر دینا چاہیے۔

تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جس میں مسلم سلاطین (چاہے ان کا تعلق ہندوستان سے ہو یا دولت عثمانیہ سے) کی یہودی اور عیسائی بیویوں نے مسلم سلطنت کو زک پہنچانے اور مسلمانوں کے راز دشمنوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک سوال اور بھی کیا جاتا ہے کہ یورپین اقوام اور اسی طرح امریکہ نے گو مقامی مسلمانوں کی مدد کی ہے، انھیں گھروں میں بسایا ہے لیکن اسرائیل کی حد تک اُسے اتنی امداد ضرور مہیا کی ہے جس سے وہ فلسطینیوں کو اپنے گھروں سے نکالنے پر قادر رہا ہے تو مندرجہ بالا آیت کی روشنی میں اُن سے بھی دوستی ناجائز ہونی چاہیے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ایسی دوستی کہ جس سے آپ کے راز اُن تک پہنچ جائیں تو وہ جائز ہی نہیں۔ ہاں اُس سے کم تر درجہ پر ان اقوام کے ساتھ اچھائی اور انصاف کا سلوک رکھنا روا ہے۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ حکومتوں کی پالیسی میں بے چارے عوام کا زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ آئے دن پول بتاتے ہیں کہ عوام کی ساٹھ فیصد، اس سے زیادہ یا اُس سے کم تعداد حکومت کی خارجہ پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتی ہے، اس لیے ہم کہیں گے کہ غیر مسلم عوام کو حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیوں کی بنا پر نفرت کا نشانہ نہ بنایا جائے بلکہ اُن کے ساتھ اچھائی اور انصاف کا برتاؤ ہی کیا جائے جیسا کہ سورۃ الممتحنہ کی مندرجہ بالا دونوں آیات میں واضح کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسلم کا غیر مسلم مالک سے جھوٹ بول کر چھٹی لینا

سوال کیا ایک مسلمان اپنے غیر مسلم منیجر سے چھٹی لینے کے لیے جھوٹ بول سکتا ہے؟

جواب جھوٹ بولنا حرام ہے۔ اگر جان پر بن رہی ہو، یعنی اپنے آپ کو قتل یا ایذا سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔ بحوالہ آیت کریمہ ﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ ''مجبور کر دیا جائے لیکن دل ایمان پر مطمئن ہو۔''[1]

اور یہ کلمہ کفر بھی جھوٹ ہی کی ایک شکل ہے۔

البتہ توریہ کا جواز بھی ثابت ہے، یعنی ایک ذومعنی بات کی جائے، مخاطب یہ سمجھے کہ آپ نے اس کی مرضی کی بات کہہ دی ہے، حالانکہ آپ خود اس بات کا دوسرا مطلب لے رہے ہوں، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو جواب دیا تھا: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾ ''میں بیمار ہوں''[2] جب انھوں نے ان کو اپنے میلے ٹھیلے میں آنے کی دعوت دی تھی۔ گویا آپ کے جواب سے وہ تو یہ سمجھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام واقعی بیمار ہیں، اس لیے ان کے ساتھ جانے سے معذور ہیں جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس جملہ سے یہ قصد تھا کہ میں تمھاری باتوں سے اتنا بیزار ہوں کہ بیمار ہو چلا ہوں۔

انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم ادا ہوتا ہے، یعنی "I am sick of you"

توریہ کی ایک دوسری مثال: ایک مسلمان کو مجبور کیا گیا ہو کہ کہو: ''خدا تین ہیں'' وگرنہ مار دیے جاؤ گے تو اُس نے اپنی تین انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ''ہاں تین

[1] النحل 106:16 [2] الصّٰفّٰت 89:37

ہیں''۔ یعنی مخاطب یہ سمجھا کہ اُس نے تین خداؤں کا اقرار کر لیا ہے جبکہ اُس کا اپنا ارادہ صرف یہ کہنے کا تھا کہ یہ میری تین انگلیاں ہیں۔

ایک حدیث کے مطابق میاں بیوی میں صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے، یعنی بیوی سے کہا جائے کہ تم تو خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہو، تمھارا میاں تو تمھارے بارے میں یہ اچھے اچھے الفاظ کہہ رہا تھا۔ اسی طرح مرد سے بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔[1]

ایک حرام چیز (جیسے جھوٹ) کا ارتکاب اُس وقت بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ ایک بڑے فتنے سے بچنا مقصود ہو۔ فرض کریں کہ آپ کے والدین غیر مسلم ہیں یا مسلمان تو ہیں لیکن بدعات وخرافات میں مبتلا ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ آپ کسی ایسی محفل میں شریک ہوں جس میں کتاب وسنت کی صحیح اور درست بات کی جائے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں چھٹی پر گھومنے پھرنے کے لیے جا رہا ہوں یا کسی دوست سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ اس طرح آپ گھر میں ہونے والے ایک بڑے فتنے (یعنی والدین سے شکر رنجی وناراضی) سے بچ جائیں گے۔

یعنی پہلے ان سوالات کو سوچ لیں: کیا چھٹی پر جانا بہت ضروری ہے؟ کیا اگر آپ چھٹی پر نہ گئے تو کوئی بہت بڑا فساد رونما ہو جائے گا؟ البتہ اگر آپ کو چھٹی حاصل کرنے کا ملازمت کے قواعد کے لحاظ سے حق حاصل ہے اور منیجر بلا سبب آپ کو چھٹی نہیں دے رہا ہے تو معاملہ اتنا سنگین نہیں رہا، آپ اپنا حق استعمال کریں۔ آپ کو ویسے ہی جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

[1] یہ حدیث مطلق ہے، یعنی صلح کے لیے فریقین کے ساتھ فریق مخالف کی بابت جھوٹ بولا جا سکتا ہے، صرف میاں بیوی کے معاملے میں نہیں بلکہ ہر معاملے میں۔ دیکھیے: صحيح البخاري، الصلح، حديث: 2692، وصحيح مسلم، البر والصلة والأدب، حديث: 2605

متفرق مسائل

③ یقطع: اس سے مراد کاٹنا ہے یا قطع نفس، یعنی پھندا ڈال کر خودکشی کرنا یا قطع امر، یعنی کسی چیز کا فیصلہ کرنا۔ (مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا: میں کوئی فیصلہ نہ کروں گی۔ قول ملکہ سباء)[1]

معانی کے اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو تین طریقوں سے سمجھا گیا ہے۔

① 'ہ' کی ضمیر رسول اللہ ﷺ طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا، تو وہ اللہ کی مدد کو روکنے کے لیے آسمان تک ایک رسی باندھ لے، پھر اوپر چڑھ جائے اور اس مدد کو لانے والی وحی کو کاٹ ڈالے۔ اور پھر دیکھے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ معنی عبدالرحمن بن زید بن اسلم سے منقول ہیں۔

② جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا، یعنی دل میں خواہش رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اللہ کے رسول کی مدد نہ ہو تو وہ اپنے غم وغصہ میں جلتا بھنتا رہے اور اپنے آپ کو مار لے اور اس کی شکل یہ ہو کہ وہ اپنے گھر کی چھت تک رسی باندھ کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لے اور خود اپنے آپ کو پھانسی دے لے۔

اور یہ کہنا اسی طرح ہے جس طرح سورۂ آل عمران کی آیت 119 میں ارشاد ہوا۔

﴿هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۤءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾

"تم وہ لوگ ہو جو ان کو دوست رکھتے ہو اور وہ تمہیں دوست نہیں رکھتے اور تم

[1] النمل 27:32۔

③ یقطع: اس سے مراد کاٹنا ہے یا قطع نفس، یعنی پھندا ڈال کر خودکشی کرنا یا قطع امر، یعنی کسی چیز کا فیصلہ کرنا۔ (مَا كُنْتُ قَاطِعَةً أَمْرًا: میں کوئی فیصلہ نہ کروں گی۔ قول ملکہ سباء)

معانی کے اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے اس آیت کو تین طریقوں سے سمجھا گیا ہے۔

① 'ہ' کی ضمیر رسول اللہ ﷺ طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا، تو وہ اللہ کی مدد کو روکنے کے لیے آسمان تک ایک رسی باندھ لے، پھر اوپر چڑھ جائے اور اس مدد کو لانے والی وحی کو کاٹ ڈالے۔ اور پھر دیکھے کہ اس کا غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ معنی عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے منقول ہیں۔

② جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا، یعنی دل میں خواہش رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اللہ کے رسول کی مدد نہ ہو تو وہ اپنے غم و غصہ میں جلتا بھنتا رہے اور اپنے آپ کو مار لے اور اس کی شکل یہ ہو کہ وہ اپنے گھر کی چھت تک رسی باندھ کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لے اور خود اپنے آپ کو پھانسی دے لے۔

اور یہ کہنا اسی طرح ہے جس طرح سورۂ آل عمران کی آیت 119 میں ارشاد ہوا۔

﴿هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝﴾

''تم وہ لوگ ہو جو ان کو دوست رکھتے ہو اور وہ تمھیں دوست نہیں رکھتے اور تم

● النمل 32:27.

سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو وہ تم پر غصے سے انگلیاں کاٹتے ہیں۔ کہہ دیجیے: تم اپنے غصے میں مر جاؤ، بے شک اللہ دل کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے۔''[1]

گویا تم جلتے بھنتے رہو، غصہ سے مرتے رہو لیکن تمھارے اس رویہ سے رسول اللہ کے لیے اللہ کی مدد رکنے والی نہیں ہے۔ یہ معنی ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، عطاء، قتادہ اور دیگر علمائے سلف سے منقول ہیں۔

③ ''ہ'' کی ضمیر سے مراد مشرکین و منافقین ہیں جن کا تذکرہ آیت نمبر 8 اور آیت نمبر 11 میں ہوا ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ کے بارے میں بغیر ہدایت، بغیر علم اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو کنارے پر کھڑے اللہ کی بندگی کرتے ہیں، اگر کچھ اچھی چیز حاصل ہوگئی تو مطمئن رہتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش آ گئی تو منہ کے بل پلٹ جاتے ہیں، یعنی یہ لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اگر وہ ایمان لے بھی آئے تب بھی اللہ کی مدد کا آنا ایک ڈھکوسلہ ہے، آسمان سے مدد وِدد کچھ نہیں آتی۔ یہ صرف دعوے ہی دعوے ہیں جو اللہ کے رسول لوگوں کو سناتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کہا گیا کہ اگر تم واقعی ایسا سمجھتے ہو تو ایک دفعہ آسمان پر کمند ڈال کر خود آسمان تک چڑھ جاؤ اور پھر اپنے فیصلے پر قائم رہو اور دیکھو کہ اس طرح تمھارا غصہ جاتا ہے یا نہیں۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بار بار

[1] آل عمران 119:3۔

آسمانوں میں اللہ کا تذکرہ کر رہے ہیں تو میرے لیے ایک اونچا مینار بنا دو تاکہ میں موسیٰ کے اللہ کو دیکھ سکوں۔ [1]

فرعون نے تو یہ بات مسخرہ پن کے ساتھ کہی تھی کہ ایسا اونچا مینار بن ہی نہیں سکتا جو آسمان کی بلندیوں کو چھو سکے۔ اور سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کی حقانیت میں شک کرنے والوں سے یہ بسبیل تحکم کہا جا رہا ہے کہ تم اگر اللہ اور اس کی مدد آنے کے قائل نہیں ہو تو اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لو، آسمان تک رسی باندھ کر چڑھ جاؤ تاکہ تمھارے دلوں کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔

مطلب یہ ہوا کہ تم ایسا تو نہ کر سکو گے، اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ اللہ کے رسول پر صدقِ دل سے ایمان لے آؤ اور پھر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اللہ کی مدد آتی ہے یا نہیں۔ یہ تیسرا مطلب زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ ان آیات کا سیاق و سباق اس مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ معاصرین میں سے شیخ محمد امین شنقیطی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالرحمٰن کیلانی نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔

سورۂ بقرہ اور درسِ قرآن کے بعد اجتماعی دعا کروانا

سوال کیا سورۂ بقرہ کے اختتام پر اجتماعی دعا ہو سکتی ہے۔ دلیل کے طور پر حضرت معاذ کا فعل بتایا گیا ہے کہ جب وہ اس سورت کی آخری آیت پڑھتے تھے تو آمین کہا کرتے تھے۔ اسی طرح کیا درسِ قرآن کے بعد بھی اجتماعی دعا مسنون ہے؟

جواب اصل میں دعا انفرادی عمل ہے لیکن جن مواقع پر اجتماعی دعا رسول اللہ ﷺ سے

[1] القصص 28:38

ثابت ہے، وہ بالکل مشروع ہے، جیسے دعائے قنوت (نازلہ) [1] اور صلاۃ الاستسقاء کے موقع پر دعا کرنا [2] اور ایسے مواقع پر ہاتھ بھی اٹھانے چاہئیں۔ لیکن جن مواقع پر ہاتھ اٹھانا نبی ﷺ سے ثابت نہیں، وہاں ہاتھ اٹھائے بغیر دعا کی جاسکتی ہے، جیسے دو سجدوں کے درمیان کی دعا، تشہد کے آخر کی دعا اور نماز کے بعد کی دعائیں۔

انسان اپنی حاجت کے لیے انفرادی دعا مانگتا ہے، ہر شخص کی حاجت دوسرے شخص سے مختلف ہوسکتی ہے، اس لیے انفرادی دعا ہاتھ اٹھا کر مانگے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''تمھارا رب باحیا اور سخی ہے۔ جب بندہ اپنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے انھیں خالی لوٹانے سے شرم آتی ہے۔'' [3]

ہر فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا نبی اکرم ﷺ سے ثابت نہیں، اس لیے اس کا التزام نہ کیا جائے۔ نفلی نماز کے بعد اپنی انفرادی دعا مانگ لے۔

جہاں تک سورۂ بقرہ کی تلاوت کے بعد اجتماعی دعا کا مسئلہ ہے تو اول تو حضرت معاذ والی حدیث [4] میں ایک راوی بالکل مجہول ہے، اس لیے اس حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اجتماعی دعا کی مشروعیت ثابت نہیں ہوتی، البتہ کسی بھی نیک عمل کے بعد انسان اپنی انفرادی دعا مانگ سکتا ہے۔

[1] صحيح البخاري، الاستسقاء، حديث: 1006، وصحيح مسلم، المساجد، حديث: 675.
[2] صحيح البخاري، الاستسقاء، حديث: 1025، وصحيح مسلم، صلاة الاستسقاء، حديث: 895.
[3] سنن أبي داود، الوتر، حديث: 1488، وجامع الترمذي، الدعوات، حديث: 3556.
[4] مصنف ابن أبي شيبة: 427/2، وتفسير طبري: 146/6. اس کی سند میں ابو اسحاق سبیعی مختلط اور مدلس ہے۔ ابن ابی شیبہ کی سند میں ابو اسحاق سبیعی ایک نامعلوم آدمی کے واسطے سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل نقل کرتے ہیں۔ طبری کی سند میں بغیر واسطے کے براہ راست روایت کرتے ہیں جبکہ ان کا سماع معاذ سے ثابت نہیں ہے، لہٰذا دونوں سندیں ہی ضعیف ہیں۔ (ناصر)

انفرادی اور اجتماعی دعا میں فرق اس لیے کیا گیا ہے کہ انفرادی دعا کے دلائل موجود ہیں لیکن ایک عبادت کو اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لیے علیحدہ سے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔ ہم مسجد میں جا کر انفرادی طور پر تحیۃ المسجد بھی پڑھ سکتے ہیں اور فجر، ظہر سے پہلے کی سنتیں بھی۔ لیکن ان سنتوں کو جماعت سے نہیں پڑھا جاتا بلکہ صرف فرض نماز جماعت سے پڑھی جاتی ہے۔ نفلی نمازوں میں قیام اللیل (تراویح) جماعت سے پڑھنا ثابت ہے، اس لیے اسے جماعت سے پڑھا جاتا ہے۔ ایسے ہی سورج اور چاند گرہن کی نمازیں جنھیں صلاۃ الکسوف اور صلاۃ الخسوف کہا جاتا ہے۔

یہاں آپ کے دوسرے سوال کا جواب بھی آ گیا ہے کہ آیا درس قرآن کے بعد اجتماعی دعا کی جاسکتی ہے؟ یعنی انفرادی دعا کا جواز تو ثابت ہے لیکن اجتماعی دعا کی دلیل موجود نہیں ہے۔

ہر فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، اس لیے اس کا التزام نہ کیا جائے۔

غیر مستند عالم کا درس قرآن دینا

سوال لندن سے م، ن لکھتے ہیں کہ ایک مسئلہ حل طلب ہے۔ براہ کرم شرعی نقطہ نظر سے جواب ارسال فرمائیں، مشکور ہوں گا۔

زید کسی اسلامی مدرسہ یا یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ کا فارغ التحصیل نہیں، نہ اس نے عربی زبان پڑھی ہے نہ کسی استاد سے اس معاملے میں رجوع کیا۔ ہاں اس کی دنیاوی تعلیم ایم اے، پی ایچ ڈی ہے، جبکہ اس نے قرآن صرف ناظرہ پڑھا ہے۔ مگر اب وہ

قرآن کے شارحین، مفسرین کی تفسیریں پڑھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا فہم قرآن تمام علمائے دین سے زیادہ ہے۔ اب وہ قرآن کا درس بھی دیتا ہے۔ کیا زید کا یہ عمل از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی مفصل جواب ارسال فرمائیں، شکریہ۔

جواب مکرمی جناب م، ن صاحب! آپ کے سوال کا جواب درج ذیل ہے:

ایسا شخص جس کا تذکرہ آپ نے کیا ہے، اگر قرآن کی تعلیم اور فہم عام کرنے کے لیے درس قرآن دینا چاہتا ہے تو اسے کسی ایک مستند تفسیر، جیسے تفسیر ابن کثیر (اردو ترجمہ دستیاب ہے) وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اسی کا خلاصہ پیش کرنا چاہیے، اپنی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، ورنہ گمراہی کا امکان ہے۔ درس قرآن دینے کے لیے نہ صرف عربی زبان کا جاننا ضروری ہے بلکہ احادیث کے مستند ذخیروں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن اربعہ وغیرہ) پر بھی نظر ہونی چاہیے تاکہ ہر آیت کی تفسیر میں نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام کے اقوال کا بھی علم ہو۔

قرآن فہمی پر انگریزی میں میرا ایک مقالہ دستیاب ہے، خواہش ہو تو میں آپ کو ارسال کر سکتا ہوں۔

کیسٹ وغیرہ پر آیت سجدہ سن کر سجدہ کرنے کا حکم

سوال کیسٹ یا سی ڈی پر قرآن سنتے وقت کیا سجدہ تلاوت ویسے ہی لازم ہے جیسے کہ کوئی ہمارے سامنے بیٹھ کر قرآن پڑھ رہا ہو؟

جواب تلاوت بھی ایک عبادت ہے، جس کے لیے عابد، یعنی قاری کا ہونا ضروری ہے، یعنی اگر ایک شخص اس عبادت میں مصروف ہو تو وہ سجدہ تلاوت پر نہ صرف خود

سجدہ کرے گا بلکہ سننے والا بھی سجدہ کرے گا، بالکل ایسے ہی جیسے امام نماز پڑھا رہا ہو تو اس کی متابعت کی جاتی ہے لیکن اگر نماز کی کیسٹ لگی ہو تو اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہے اور نہ سجدہ تلاوت ہی کرنا، علاوہ ازیں عبادت میں نیت کا پایا جانا ضروری ہے جو کہ کیسٹ کی تلاوت میں مفقود ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ کا مرسل حدیث کو ضعیف کہنا اور پھر اپنی صحیح میں مرسل روایات کا اندراج کرنا

سوال عمر حسین بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ امام مسلم نے اپنے مقدمہ میں (جسے ابن الصلاح نے اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' میں بھی نقل کیا ہے) بیان کیا ہے کہ مُرسل حدیث ضعیف شمار ہوتی ہے اور وہ حجت نہیں ہے۔[1] اگر ایسا ہے تو پھر امام مسلم نے مرسل حدیث کو اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں کیوں جگہ دی؟ یہ سوال دراصل محمد حسن کمالی کی انگریزی کتاب ''حدیث سٹڈیز'' کے مطالعہ سے پیدا ہوا ہے۔

جواب امام مسلم اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں: احادیث کے راوی تین قسم کے ہیں: بہت ہی ثقہ راوی، ثقاہت کے اعتبار سے معتدل اور متروک راوی۔

پھر وہ لکھتے ہیں: میں نے اپنی کتاب ''صحیح'' میں اصالتاً پہلے گروپ کے راویوں سے روایت لی ہے، دوسرے گروپ کے راویوں سے صرف متابعت یا شواہد کی غرض سے روایت لی ہے جس سے متن حدیث یا اسناد حدیث کی تقویت مقصود ہوتی ہے،[2] جہاں تک تیسری صنف کا تعلق ہے تو اُن سے میں نے قطعاً روایت نہیں کی۔

[1] مقدمة صحيح مسلم، ص: 20. [2] مقدمة صحيح مسلم، ص: 4، 5 بالاختصار.

اسی طرح امام مسلم نے مرسل حدیث (جس میں تابعی بغیر کسی واسطے کے رسول کریم ﷺ سے روایت کرتا ہے) بھی صرف متابعت یا شاہد کے طور پر ذکر کی ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ کہتے ہیں: صحیح مسلم میں صرف دس مرسل احادیث پائی گئی ہیں اور یہ سب کی سب سوائے ایک کے صحیح مسلم ہی میں مُسند، یعنی پوری اسناد کے ساتھ، بھی پائی گئی ہیں۔ تین مثالیں ملاحظہ ہوں، ان میں تیسری مثال اُس روایت کی ہے جو مسند نہیں پائی گئی۔

① سعید بن مسیب (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزابنہ (خشک انگوروں کے تر انگوروں کے ساتھ تبادلے) سے منع فرمایا۔ [1]

یہ حدیث مرسل ہے۔ لیکن یہی روایت ان تین اسانید کے ذریعے سے موصول بھی پائی گئی:

ا) سہیل بن ابو صالح اپنے والد سے اور وہ حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں۔ [2]

ب) سعید بن میناء اور ابو زبیر، جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ [3]

ج) مالک، نافع سے اور وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ [4]

② عبداللہ بن ابوبکر، عبداللہ بن ابو واقد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔ (یہ روایت مرسل ہے)

امام مسلم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن ابوبکر کا یہ قول بھی درج کیا جس سے یہ حدیث موصول ہوگئی: عبداللہ بن ابوبکر کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول عمرہ (بنت عبدالرحمٰن) کے سامنے

[1] صحیح مسلم، البیوع، حدیث: 1539. [2] صحیح مسلم، البیوع، حدیث: 1545. [3] صحیح مسلم، البیوع، حدیث: 1536. [4] صحیح مسلم، البیوع، حدیث: 1542.

ذکر کیا تو انھوں نے کہا: انھوں نے سچ کہا۔ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے......۔ [1]

اور اسی روایت کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے واسطے سے بھی (موصولا) ذکر کیا۔ [2]

(خیال رہے کہ جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں ایسا کرنے سے اس لیے منع فرمایا تھا تاکہ تین دن کے اندر اندر مساکین وغرباء میں گوشت تقسیم کیا جا سکے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فراوانی سے نوازا تو آپ نے گوشت کو ذخیرہ کرنے اور کھانے کی اجازت دے دی۔)

③ وہ واحد روایت جو (صحیح مسلم میں دوسری جگہ) موصول نہیں پائی گئی:

ابو العلاء بن شخیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض حدیثیں بعض دوسری حدیثوں کو منسوخ کرتی ہیں۔ [3]

جہاں تک معلق روایات (وہ روایت کہ جس کی شروع کی سند محذوف ہو) کا تعلق ہے تو صحیح مسلم میں ان کی تعداد صرف بارہ ہے اور وہ ساری کی ساری پوری سند کے ساتھ، یعنی موصول بھی پائی گئی ہیں۔ [4]

[1] صحیح مسلم، الأضاحي، حدیث: 1971. [2] صحیح مسلم، حدیث: 1970. [3] صحیح مسلم، الحیض، حدیث: 344، اس مرسل روایت کی موصولاً سند ہمیں نہیں ملی لیکن یہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ نے اصالتاً درج نہیں کی بلکہ بطور شاہد ذکر کی ہے اور یہ روایت کوئی فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے بلکہ باہم متعارض احادیث کے مابین موافقت پیدا کرنے کا ایک وسیلہ بیان کرتی ہے۔ اور اس روایت سے پہلی حدیث اور کئی دیگر احادیث بھی مفہوماً اس کی تصدیق کرتی ہیں، اس لیے اس روایت کی بنا پر صحیح مسلم پر یہ قدغن نہیں لگائی جا سکتی کہ اس میں مرسل ضعیف روایات موجود ہیں۔ (ناصر)

[4] ملاحظہ ہو: تدریب الراوي: 1/206، محمد بن مصطفیٰ مخاتی کی کتاب المرسل من الحدیث: 172.

مسجد کی رقم کو امام مسجد وغیرہ پر خرچ کرنا

سوال ہم یورپ کے ایک ملک میں مقیم ہیں چونکہ ہماری موجودہ مسجد تنگ ہونے لگی ہے، اس لیے نمازیوں نے مسجد کے لیے ایک دوسری جگہ خریدنے کے لیے چندہ جمع کیا۔ ہمارے امام صاحب کی درخواست ہے کہ ان پیسوں میں سے وہ خرچ بھی ادا کیا جائے جو اس ملک میں ان کی اقامت کے حصول کے لیے صرف کیا گیا ہے۔ عام نمازیوں کا کہنا ہے کہ یہ پیسہ صرف مسجد کے حصول کے لیے جمع کیا گیا تھا نہ کہ امام کی بعض ضروریات کو پورا کرنے کے لیے۔ ہمیں اس سلسلے میں شرعی فیصلہ سے آگاہ کریں؟

جواب اگر مسجد کی بلڈنگ کی خرید کے لیے چندہ جمع کیا گیا تھا تو وہ اصلاً اسی مقصد کے لیے خرچ کیا جانا چاہیے کیونکہ مسجد کی کمیٹی نمازیوں کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر وکالت مقید، یعنی کسی خاص مقصد کے لیے ہو تو اس مقصد کو پورا کیا جانا چاہیے، الا یہ کہ ایسا کرنا مشکل ہو جائے۔ ایسی صورت میں موکلین (یعنی جنھوں نے کمیٹی کو وکیل بنایا ہے) کی طرف دوبارہ رجوع کیا جائے اور اگر مقصد پورا ہو جانے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو اسے مسجد سے متعلق دوسرے کاموں میں صرف کیا جا سکتا ہے اور ان کاموں میں امام سے متعلق امور بھی ہو سکتے ہیں، جیسے امام کا مسجد کی خدمت کے لیے موجود ہونا۔ لیکن اس سلسلے میں پہلے کمیٹی کی طرف سے رپورٹ پیش ہونی چاہیے۔

مسجد کا پروجیکٹ مکمل ہونے سے پہلے امام کی امامت کے حصول کے لیے رقم کا خرچ کیا جانا بظاہر صحیح معلوم نہیں ہوتا، الا یہ کہ مسجد کے پروجیکٹ کے لیے امام کا ہونا ناگزیر ہو۔

شراب خانے کی چھت پر مسجد بنانا

سوال کونٹری سے دین محمد صاحب دریافت کرتے ہیں کہ جس عمارت کی پہلی منزل پر شراب فروخت کی جاتی ہو یا رقص و سرود جیسی غیر شرعی حرکات ہوتی ہوں، تو کیا اس عمارت کے گراؤنڈ فلور کو بطور مسجد استعمال کیا جاسکتا ہے؟ براہ کرم مغرب میں آباد مسلمانوں کی مجبوریوں اور مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب مسجدیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں، انھیں پاک صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے قرب و جوار میں ایسی چیزوں کی ممانعت کی گئی ہے جس سے نمازیوں کو تکلیف ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فتاویٰ میں لکھتے ہیں: کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اہل مسجد کو ایذا پہنچائے، یعنی جس کام کے لیے مسجد بنائی گئی ہے، جیسے نماز، قراءت قرآن، ذکر الٰہی، دعا وغیرہ (ان میں خلل ڈالے) اس لیے کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ مسجد میں یا اس کے دروازہ پر یا اس کے قریب کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد والوں کی عبادت میں خلل واقع ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ملاحظہ ہو کہ ایک دفعہ صحابہ کرام نماز پڑھ رہے تھے اور بلند آواز سے قراءت کر رہے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کہا: ''اے لوگو! تم میں سے ہر شخص اپنے رب سے مناجات کر رہا ہے تو کوئی شخص دوسرے کی موجودگی میں بلند آواز سے قراءت نہ کرے۔''[1]

اگر اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نمازی کو دوسرے نمازی کے مقابلے میں بلند

[1] سنن أبي داود، التطوع، حديث: 1332، ومسند أحمد: 94/3.

آواز سے قراءت کرنے سے روکا ہے تو پھر دوسرے اعمال کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے، چنانچہ ہر اس شخص کو روکا جائے گا جو اہل مسجد کے لیے تشویش کا باعث ہو یا ایسی بات کرے جو انھیں ایذا پہنچانے کا سبب بنے۔''[1]

اس اقتباس سے واضح ہوگیا کہ یا تو ایسے کاموں سے روکا جائے جن سے اہل مسجد کو تکلیف پہنچتی ہو۔ اور اگر ایسا کرنے پر قدرت نہ ہو تو پھر ایسی جگہ مسجد نہ بنائی جائے، البتہ اضطرار کا حکم جدا ہے، یعنی نماز کا وقت ہوگیا ہے، آپ کسی ہوٹل میں ہیں جہاں آپ کی رہائش کے قریب رقص وطرب کی محفل برپا ہے، قرب و جوار میں کوئی محفوظ جگہ بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں نماز ادا کی جاسکتی ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ہجرت سے پہلے کعبہ کے اطراف میں اس عالم میں نمازیں پڑھی ہیں کہ کفار سیٹیاں بجاتے تھے، تالیاں پیٹتے تھے اور نمازیوں پر آوازیں کستے تھے۔ واللہ اعلم

ڈیپریشن والی حاملہ کا بیماری بڑھنے یا ناقص الخلقت بچہ جنم دینے کے خدشے سے اسقاط حمل کروانا

سوال ایک خاتون جو ڈیپریشن کا شکار رہی ہیں اور مسلسل اس کے لیے دوا کا استعمال بھی کررہی ہیں، اس وقت آٹھ ہفتے کے حمل سے ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ دواؤں کی بنا پر اس بات کا دو فیصد امکان ہے کہ بچہ معذور یا ناقص الخلقت پیدا ہو۔ اس پر مستزاد یہ کہ ولادت کے بعد ڈیپریشن کے بڑھنے کے امکانات اور زیادہ ہوں گے۔ ان حالات میں کیا وہ اپنا حمل ضائع کرسکتی ہے؟

[1] فتاوی ابن تیمیة: 22/205.

جواب اسقاط حمل اسی لیے منع قرار دیا گیا ہے کہ اس کی بنا پر ایک انسانی جان ضائع ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جنین میں چار ماہ گزرنے پر روح پھونک دی جاتی ہے لیکن نطفہ کے حمل میں استقرار ہوتے ہی اس میں بڑھنے اور پرورش پانے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اگر نطفے کو قدرتی حالات میں چھوڑ دیا جائے تو وہ علقہ (جونک کی مانند کیڑا)، پھر مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) پھر عظام (ہڈیوں کے ہیکل) میں تبدیل ہو کر رہے گا یہاں تک کہ اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ چار ماہ سے پہلے ہی اگر اس کو ضائع کر دیا گیا تو بظاہر ایک ذی روح مخلوق کو ضائع نہیں کیا گیا لیکن اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے درخت کے بیج کو جو زمین میں درخت اگانے کے لیے دبا دیا گیا تھا، اسے زمین سے کھود کر باہر پھینک دیا جائے۔ یہ بیج اگر زمین کی گود میں دبا رہتا تو وہ پودے کی شکل میں اپنا سر نکالتا اور پھر ایک دن تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا۔

بہر صورت اسقاط حمل عموماً تو ممنوع ہے، خاص خاص حالات میں جائز ہوسکتا ہے لیکن مندرجہ ذیل شروط کا خیال رکھا جائے:

① کم از کم دو یا تین ڈاکٹرز اس بات کی رپورٹ دیں کہ اگر بچہ حمل میں باقی رہا تو بوقت ولادت یا ولادت سے قبل ماں کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔

② ایسی صورت میں بہتر ہے کہ چار ماہ سے قبل ہی اسقاط کرالیا جائے تاکہ کم از کم ذی روح مخلوق کو مارنے کا گناہ لازم نہ ہو۔

③ اگر چار ماہ گزر چکے ہیں اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ ہو کہ ماں کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے تو بھی اسقاط کرایا جاسکتا ہے اور اگر ایسا کیا تو قتل خطا کا کفارہ ادا کیا جائے، جس کی تفصیل بعد میں آرہی ہے۔

یہ بھی اس اصول کی بنا پر برداشت کیا گیا کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لیے چھوٹے ضرر کو برداشت کیا جاتا ہے۔

باقی جس صورت کا سائل نے تذکرہ کیا ہے، اس میں ماں یا بچے کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ بچہ معذور یا ناقص الخلقت پیدا ہوگا۔ یہ وجہ اتنی قوی نہیں کہ اس کی بنا پر ایک بچے کو دنیا میں آنے سے روک دیا جائے۔ دنیا میں لاتعداد معذور بچے موجود ہیں اور ان کے والدین یا اجتماعی بہبود کے ادارے ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ نہ صرف بچے بلکہ بڑے بوڑھے بھی بعض دفعہ حوادث کی بنا پر معذور ہو جاتے ہیں، تو کیا ان کی معذوری کی بنا پر انھیں موت کے حوالے کر دیا جائے؟

ڈپریشن ایک بیماری ہے جس کا علاج ممکن ہے، نہ صرف دواؤں بلکہ اللہ کا ذکر اور تلاوت قرآن کثرت سے کی جائے تو اس کا مداوا ممکن ہے۔

نبی ﷺ نے ''عزل'' سے منع فرمایا اور اسے «اَلْوَأْدُ الْخَفِيُّ» ''ایک مخفی انداز میں زندہ درگور کرنا''[1] سے تعبیر فرمایا۔

روح پھونکے جانے کے بعد حمل ضائع کرنا، قتل نفس میں آتا ہے، جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾

''جو شخص کسی کو قتل کرے، سوائے اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد کرنے والا ہو، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا۔''[2]

[1] صحیح مسلم، النکاح، حدیث: 1442۔ [2] المآئدۃ 5:32۔

کفارہ کی تفصیل یہ ہے:

کسی بھی مسلمان کا اگر غلطی سے قتل ہو جائے تو اس میں دیت اور کفارہ ایک غلام آزاد کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اگر غلام آزاد کرنے کی استطاعت نہ ہو تو دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔[1]

البتہ اگر کسی حاملہ عورت کو چوٹ پہنچائی گئی، جس سے اس کا حمل ساقط ہو گیا تو بروایت مغیرہ بن شعبہ نبی ﷺ نے چوٹ پہنچانے والے پر ایک غلام (مرد یا لونڈی) دینے کا فیصلہ سنایا۔[2]

لیکن اگر مذکورہ سوال کے مطابق عورت نے خود اسقاط کروایا ہو تو کیا اس کا بھی یہی حکم ہوگا؟

ابن قدامہ، المغنی میں لکھتے ہیں:

«وَإِذَا شَرِبَتِ الْحَامِلُ دَوَاءً فَأَلْقَتْ بِهِ جَنِينًا فَعَلَيْهَا غُرَّةٌ لَا تَرِثُ مِنْهَا شَيْئًا وَتَعْتِقُ رَقَبَةً»

''اگر حاملہ عورت ایسی دوا پی لے جس سے حمل ساقط ہو جائے تو اس پر ایک غرہ (غلام کا دینا) واجب ہو جاتا ہے۔ وہ اس غرہ کی وارث نہیں ہوگی اور اسے (بطور کفارہ) ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔''[3]

غلام آزاد کرنے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک صرف غرہ کا دینا ہی کافی ہے اور اس غرہ کے وارث وہ سب لوگ ہوں گے جو اس بچے کے حقیقی وارث تھے،

[1] النساء 92:4. [2] صحيح البخاري، الديات، حديث: 6905، وصحيح مسلم، القسامة، حديث: 1682. [3] المغني: 81/12.

ماسوائے اس عورت کے جس نے اس بچے کو حمل گرا کر ضائع کیا۔

غرہ کی قیمت کے بارے میں لکھتے ہیں: غرہ دیت کے بیسویں حصے کے برابر ہے، یعنی پانچ اونٹ۔ یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور بعد کے علماء میں نخعی، شعبی، ربیعہ، قتادہ اور امام مالک، امام شافعی اور اصحاب الرائے کا بھی یہی قول ہے۔[1]

سورۂ نساء کی آیت: 92 سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقتول کے ورثاء اگر دیت معاف کر دیں تو پھر دیت کا دینا واجب نہیں رہتا۔

یہ تفصیل اس لیے لکھ دی گئی ہے تاکہ اس مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔ عام طور پر خواتین اسقاط میں تساہل سے کام لیتی ہیں۔ انھیں علم ہونا چاہیے کہ اگر مجبوری کی بنا پر بھی (جس کا تذکرہ شروع میں آ چکا ہے) اسقاط کرایا ہو تو اس میں مذکورہ بالا دیت واجب ہوگی اور بقول بعض اہل علم ایک غلام کا آزاد کرنا بھی واجب ہوگا اور چونکہ غلامی کا دور باقی نہیں رہا ہے، اس لیے اس کے عوض میں دو ماہ کے لگاتار روزے رکھنا ہوں گے۔ واللہ اعلم

یہ گزارشات تو اصل مسئلہ سے متعلق تھیں، خواتین اسقاط کرانے کے لیے بعض دوسرے اسباب بھی پیش کرتی ہیں، جیسے: نکاح سے پہلے زنا کی بنا پر حمل قرار پا گیا اور اب عورت بدنامی سے بچنے کے لیے بچہ ضائع کرنا چاہتی ہے، یعنی قصور اپنا لیکن ایک معصوم کو بلا وجہ قتل کیا جائے۔

ایسی عورت جس سے زبردستی بدفعلی کی گئی اور جس کے نتیجے میں حمل قرار پا گیا یہ

[1] المغني: 12/66.

عورت اس حمل سے سخت کراہت کرتی ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ اس میں ہونے والے بچے کا کیا قصور ہے۔ فرض کیجیے: آپ کی گود میں کوئی دودھ پیتا بچہ ڈال کر بھاگ جاتا ہے تو کیا آپ اس بچے کی جان بچانے کی کوشش کریں گے یا اسے کسی ندی نالے میں بہا کر بھاگنے کی کوشش کریں گے۔

ایسی عورت اگر اس حمل سے اتنی ہی متنفر ہے تو بچے کی ولادت کے بعد کسی ایسے شخص کے سپرد کردے جو اسے گود لینے کو تیار ہو۔ اور ہر معاشرے میں بہت سے ایسے بے اولاد جوڑے ہوتے ہیں جو کسی بھی بچے کو گود لینے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ فوسٹر پیرنٹ (پرورش کی غرض سے گود لینے والے ماں باپ) کی حیثیت سے یہ ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں جس میں وہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

زنا سے اسقاط حمل کروانا

سوال ایک شخص کی بیوی کتابیہ ہے، یعنی مسلمان نہیں۔ اس نے زنا کرنے کا اعتراف کیا۔ ابھی اس کا حمل صرف چار ہفتے کا ہے اور مرد کو بھی یقین ہے کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے کیونکہ وہ مانع حمل طریقے استعمال کرتا رہا ہے تو کیا وہ بچہ اسقاطِ حمل کے ذریعے ضائع کرسکتا ہے؟

جواب علماء نے ان دو حالتوں میں فرق روا رکھا ہے۔

وہ جنین جس میں روح پھونکی جا چکی ہے، یعنی حمل کے چار ماہ گزر چکے ہیں،

دوسرے وہ جنین جس میں ابھی روح نہیں پھونکی گئی ہے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے تو اسقاط سرے سے ناجائز ہے، اِلّا یہ کہ اس بچے کی

وجہ سے حمل میں اتنی پیچیدگی پیدا ہو چکی ہو کہ ماں کی جان خطرے میں ہو۔ اور جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے تو عام حالات میں ایسے جنین کا اسقاط کرانا بھی ناجائز ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں: وہ جنین جس کے بعض اعضاء بن چکے ہوں مکمل جنین کی طرح ہے۔[1]

اگر کوئی شخص مار پیٹ کی وجہ سے ایسی عورت کا جنین گرادے تو اس پر وہی دیت واجب ہوگی جو کہ مکمل جنین کے گرانے پر عائد ہوتی ہے، یعنی ایک غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا۔

لیکن اگر اس مدت میں اسقاط کرانے کا کوئی معقول سبب ہو تو پھر اابارشن (اسقاط حمل) کرایا جاسکتا ہے۔ بوسنیا کی جنگ میں بے شمار مسلمان خواتین عیسائی سربوں سے زنا بالجبر کے تحت حاملہ ہوئیں اور اس وقت یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ آیا وہ اسقاط کرا سکتی ہیں یا نہیں۔

بعض علماء کا خیال تھا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس بچے کا تو کوئی قصور نہیں جو اس ناجائز حمل کی بنیاد پر اس دنیا میں آنے والا ہے۔ اور اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے اس معصوم بچی کی جسے جاہلیت کے زمانہ میں بعض عرب زندہ زمین میں دفن کردیا کرتے تھے اور جس کے بارے میں قرآن نے کہا:

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ○ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ○﴾

''جب زمین میں گاڑی جانے والی بچی سے پوچھا جائے گا کہ تمھیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟''[2]

کچھ علماء کا خیال تھا کہ یہ عورتیں اسقاط کراسکتی ہیں کیونکہ اوّل تو یہ ناجائز حمل ہے،

[1] المحلّٰی: 378/12. [2] التکویر 81:8,9.

دوسرا یہ بچہ ساری عمر اس بہیمانہ عمل کی یاد دلاتا رہے گا جو ان خواتین کے ساتھ ہوا۔

میرا میلان پہلی رائے کی طرف ہے، بچے کا اسقاط نہ کرایا جائے لیکن عورت کو طلاق دے کر فارغ کر دیا جائے۔

رجم کا اخروی سزا سے کفارہ بننا

سوال کیا مرجوم (جسے زنا کی سزا میں سنگسار کیا گیا ہو) سے آخرت میں بھی پوچھا جائے گا؟

جواب اگر کسی شخص پر حد نافذ کر دی جائے تو یہی حد اُس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ نبی ﷺ نے جب ماعز اسلمی پر زنا کی حد لگائی تو کسی شخص نے ان کے بارے میں سخت نازیبا الفاظ کہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا نہ کہو، اس شخص نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر یہ توبہ ایک امت پر تقسیم کر دی جائے تو انھیں کافی ہو جائے گی۔''[1]

کفار کے ساتھ مشابہت سے ممانعت کی حدود و قیود

سوال حدیث رسول ﷺ میں کفار سے مشابہت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔[2] کیا آپ اس کی حدود و قیود کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب کفار میں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور دوسرے تمام غیر مسلم شامل ہیں جن کی مشابہت مذکورہ تفصیل کے مطابق ممنوع ہے۔

[1] صحیح مسلم، الحدود، حدیث: 1696۔ ایک روایت میں ہے کہ اگر اس کی توبہ سو پر تقسیم کر دی جائے تو ان کو کافی ہو جائے۔ (السنن الکبریٰ للنسائي: 4/276)۔ [2] جامع الترمذي، أبواب الاستئذان والآداب عن رسول الله ﷺ، حدیث: 2695، وسنن أبي داود، اللباس، حدیث: 4031

① ایسی عبادات جن میں غیر مسلمانوں سے مکمل مشابہت پائی جائے، مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع میں عاشوراء کا روزہ رکھا اور پھر اعلان کیا کہ آئندہ سال ہم نو تاریخ کا بھی روزہ رکھیں گے۔[1] تاکہ یہود سے مشابہت نہ رہے۔ خود روزہ کی مدت بھی اسلام میں فجر سے مغرب تک رکھی گئی ہے اور سحری کھانے کی فضیلت بتائی گئی تاکہ ہمارا روزہ اہل کتاب کے روزے سے علیحدہ نظر آئے،[2] ان کا روزہ غروب آفتاب سے اگلے دن غروب آفتاب تک رہتا ہے، یعنی چوبیس گھنٹے کا۔

نبی ﷺ نے نماز کی ندا کے لیے گھنٹیاں یا بگل بجانے کو اختیار نہیں کیا کہ یہ اہل کتاب کا شعار تھا بلکہ اذان کا طریقہ رائج کیا۔[3]

② ایسے شعائر (علامات) سے بچنا جو غیر مسلموں سے خاص ہوں، جیسے صلیب (عیسائیوں کا شعار)، بالوں کی لٹیں چہرے پر لٹک رہی ہوں (یہودیوں کا شعار) ماتھے پر بندی لگانا (ہندوؤں کا شعار)، بازو میں کڑا پہننا (سکھوں کا شعار) اور گیروے رنگ کا لباس پہننا (بدھ بھکشوؤں کا شعار) وغیرہ۔

③ ایسی عادات جن میں غیر مسلم مبتلا ہیں اور وہ اسلامی تعلیم کے منافی ہیں، جیسے بلا ضرورت بائیں ہاتھ سے کھانا پینا یا کھڑے ہو کر کھانا۔

④ ایسے فیشن جو غیر مسلم اقوام سے لیے گئے ہوں، خاص طور پر عورتوں کے وہ ملبوسات جن سے بدن کی نمائش ہوتی ہو، ان کا پہننا حرام ہے، البتہ ایسے ملبوسات جو اتنے عام ہو چکے ہوں کہ اب وہ غیر مسلموں سے خاص نہ رہے ہوں تو بشرطِ ستر ان کو پہنا جا سکتا

[1] صحيح مسلم، الصيام، حديث: 1134. [2] صحيح مسلم، الصيام، حديث: 1096. [3] صحيح البخاري، الأذان، حديث: 604، وصحيح مسلم، الصلاة، حديث: 377.

ہے، جیسے مردوں کے لیے پینٹ کوٹ لیکن بہتر ہے کہ کوٹ کچھ لمبا ہوتا کہ رکوع و سجود میں ستر کا پورا لحاظ رکھا جاسکے، پھر بھی مغربی لباس سے اجتناب کرنا اور خاص طور پر اسلامی ممالک میں، بہت خوش آئند ہے۔

اس بات کا بھی خیال رہے کہ مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت نہیں کرنی چاہیے۔ اس میں ملبوسات، چال ڈھال، زیورات وغیرہ سب آجاتے ہیں۔

خواتین کا بال کٹوانا

سوال اکثر دیندار گھرانوں میں دیکھا جاتا ہے کہ عورتیں حجاب تو پہنتی ہیں لیکن حجاب کے نیچے بال کاٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا مسلمان عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ بال کاٹے، بشرطیکہ آدمی جیسے نہ ہوں؟

جواب بال عورت کی زینت میں شامل ہیں۔ ایک شادی شدہ خاتون اپنے آپ کو اپنے شوہر کے لیے سنوارتی ہے اور زینت سے آراستہ کرتی ہے، اس لیے بہتر تو یہی ہے کہ وہ بال نہ کاٹے لیکن اگر شوہر کی رضا مندی شامل ہو تو پھر جیسا آپ نے خود لکھا ہے، مردوں کی مانند بال نہ کاٹے۔ امہات المومنین کے بارے میں صحیح مسلم کی روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بال اس حد تک رکھے جسے عربی میں ''وفرہ'' کہا جاتا ہے، یعنی کندھوں تک۔[1] امام نووی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ انھوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد زیب و زینت نہیں کرنا چاہتی تھیں۔[2] اس زمانے میں بال کٹوانا عدم زینت کی نشانی تھا لیکن ہمارے زمانے میں خواتین بالوں کو بطور زینت کٹواتی ہیں، بہر حال اس روایت سے اتنا تو

[1] صحيح مسلم، الحيض، حديث: 320. [2] شرح النووي على صحيح مسلم: 4/4.

معلوم ہوا کہ بال کاٹے جاسکتے ہیں، اگر مذکورہ بالا دونوں شرطوں کا لحاظ رکھا جائے۔

انگوٹھی کس انگلی میں پہنی جائے؟

سوال انگوٹھی کا کس انگلی میں پہننا افضل ہے؟

جواب عربی زبان میں پانچوں انگلیوں کے لیے نام پائے جاتے ہیں۔

خِنْصِر: چھوٹی انگلی...... Little finger

بِنْصِر: چھوٹی انگلی کے ساتھ والی...... Ring finger

اَلْوُسْطٰی: بیچ کی انگلی ...... Middle finger

سَبَّابَۃ: تشہد والی انگلی...... Index finger

إِبْهَام: انگوٹھا...... Thumb

سبابہ کے لغوی معنی ہیں: گالی دینے والی، (سب یسب، سبا) اور چونکہ زبانی گالم گلوچ میں اسی انگلی سے اپنے مخالف کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، اس لیے اسے سبابہ کہا جاتا ہے اور مسلمانوں کے ہاں اسے شہادت کی انگلی کہا جاتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے: نبی ﷺ نے انگوٹھی کو خنصر یا بنصر میں پہننے کو جائز قرار دیا ہے اور وسطیٰ میں پہننے سے منع فرمایا۔[1] جمہور اہل علم نے اس مذہب کو اختیار کیا ہے کہ وسطیٰ میں انگوٹھی پہننے کی ممانعت کراہت کے درجہ کی ہے، یعنی وسطی اور سبابہ میں انگوٹھی پہننے سے احتراز کرنا چاہیے۔

[1] یہ دو مختلف احادیث کا مجموعہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بائیں ہاتھ کی خنصر (چھوٹی انگلی) میں انگوٹھی پہنتے تھے۔ (صحیح مسلم، اللباس والزینة، حدیث: 2095) دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے درمیانی والی اور اس کے ساتھ والی انگلی میں انگوٹھی پہننے سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح مسلم، اللباس والزینة، حدیث: 2078).

فتاویٰ صراطِ مستقیم

دیارِ مغرب میں مسلمانوں کو درپیش مسائل
اور ان کا شرعی حل

ڈاکٹر صہیب حسن مغربی دنیا میں اٹھنے والی تحریکوں کے پس پردہ محرکات کے رمز شناس ہیں۔ یہ کتاب انھی کی مختلف کانفرنسوں میں کی گئی تقریروں کا گلدستہ ہے۔ امت مسلمہ کو طرح طرح کے خطرات سے آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے انھوں نے کتنی بصیرت افروز باتیں کی ہیں، اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعے سے ہوگا۔ موصوف نے دیارِ مغرب میں رہنے والے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لیے اہم فتوے بھی یکجا کیے ہیں جن میں عقائد، نماز، زکاۃ، بدعات، رسوم و رواج، متعہ، شادی بیاہ، طلاق، عورت کی امامت، مخلوط سوسائٹیوں اور جنازے کے مسائل جیسے اُمور واضح کرنے کے علاوہ ہر طرح کے شک و ارتیاب، جہل، اوہام اور اضطراب کا شافی جواب دیا گیا ہے ...... اس طرح یہ کتاب قدم قدم پر رہنمائی کی روشنی فراہم کرنے کے لیے خضر راہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اسے خود بھی پڑھیے اور بطور ارمغانِ محبت اپنے دوستوں کو بھی پیش کیجیے۔

لاہور ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور 042-37244973 - 37232369
فیصل آباد بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد 041-2631204 - 2641204
/maktabaislamia1 maktabaislamiapk.com maktabaislamiapk@gmail.com